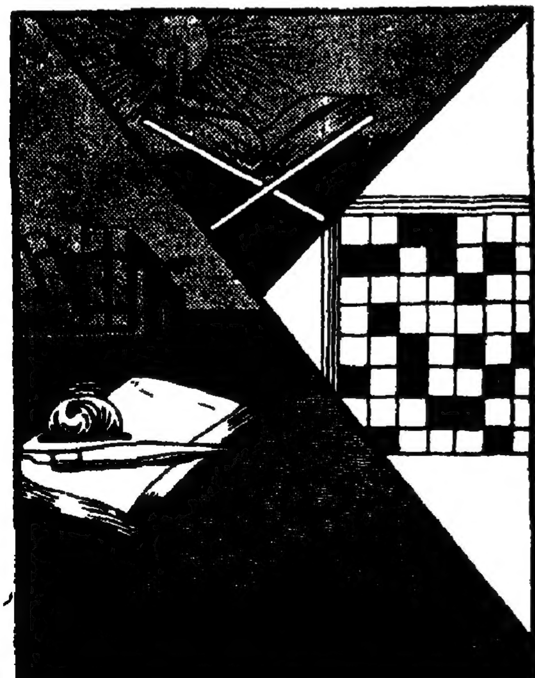
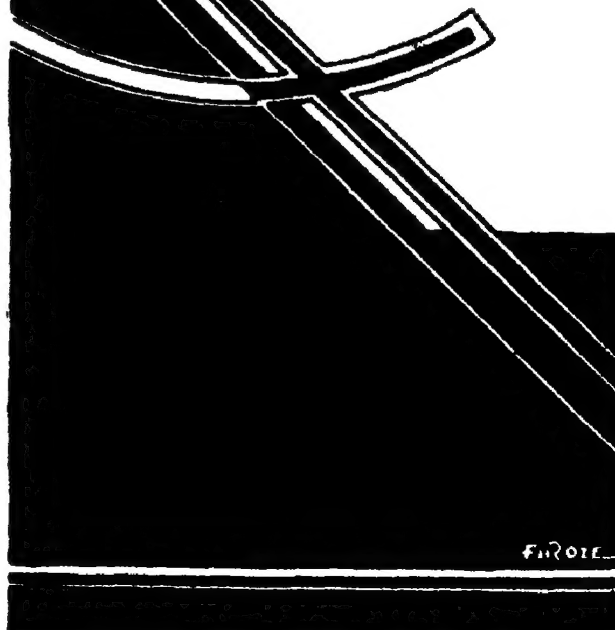
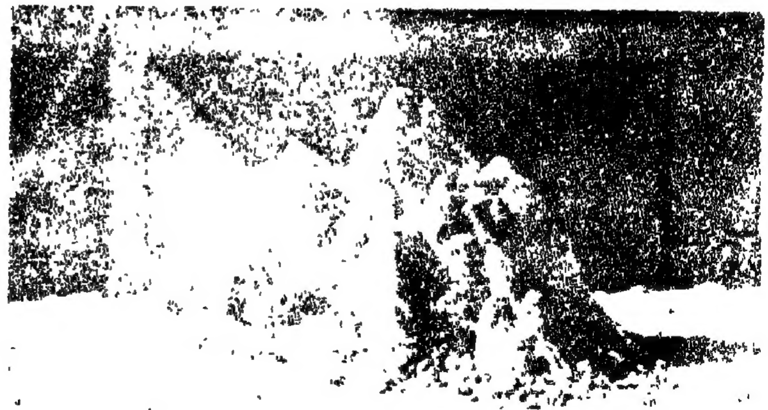
سالنامہ
۱۹۴۳

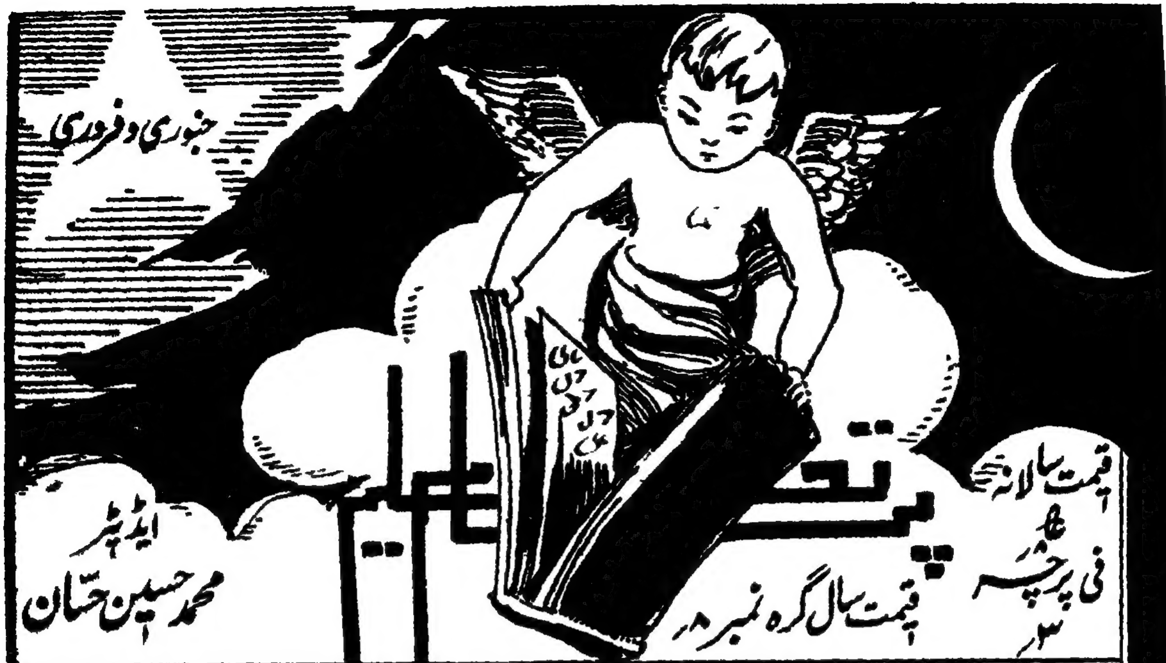












قیمت سالانہ ؎عہ
فی پرچہ ۲ر
قیمت سالگرہ نمبر ۸ر

ایڈیٹر
محمد حسین حسان

جلد ۲۶ | نمبر ۱، ۲

فہرست مضامین

۱	بچوں سے باتیں	ایڈیٹر	۲
۲	سال نو	جوہر، چاندوڑی	۳
۳	پاپ کی ناؤ	مولوی محمد شفیع الدین نیر	۴
۴	سائنس دانوں کی کہانی	سید نورالحسن ہاشمی ایم اے	۷
۵	کہانی ہے یہ اک نٹ کی	مولوی محمد شفیع الدین نیر	۱۰
۶	گراموفون	سید ابوطاہر، بی ایس سی	۱۱
۷	ڈراما کیا ہے	پروفیسر محمد مجیب	۱۵
۸	میکائیل فیرڈے	مرزا محمد حسن - ایم، ایس سی	۱۸
۹	تجربہ گاہ	شجاع احمد قائد	۲۱
۱۰	محنت	مولوی محمد شفیع الدین نیر	۲۵
۱۱	موجدوں کی کہانی	سید نورالحسن ہاشمی ایم اے	۲۶
۱۲	لچک	مشتاق احمد بی اے (علیگ)	۲۹
۱۳	چندا ماموں	.. .. ..	۳۲
۱۴	دریائے حیات	فضل الدین اثر ایم اے	۳۷
۱۵	پودے	مشتاق احمد بی اے (علیگ)	۴۰
۱۶	ٹوٹنے والے تارے	.. .. ..	۴۳
۱۷	سوئی	محمد عبدالحی - حیدرآباد	۴۶
۱۸	بجلی کا کڑکا	مشتاق احمد بی اے (علیگ)	۴۹
۱۹	تتلی	میر شوکت علی - جامعہ نگر	۵۴
۲۰	پیام برادری	.. .. ..	۵۷
۲۱	معما	.. .. ..	۶۰
۲۲	کارٹون	فیروز آرٹسٹ	۶۳
۲۳	اشتہار	.. .. ..	۶۴

پیام تعلیم دہلی، یوپی، سی پی، برار، رام پور، قلات، بھوپال، میسور، حیدرآباد، سندھ، کشمیر، پنجاب، بہار اور سرحد کے محکمہ ہائے تعلیم کی طرف سے سرکاری طور پر منظور کیا گیا ہے۔ منیجر

سالنامہ ۱۹۴۳ء

FiRoze 42

پرنٹر پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی، محبوب المطابع پریس، دہلی

بچّوں سے باتیں

لیجئے جناب جیسے تیسے کر کے آخر آپ کا سالنامہ شائع ہو گیا اس سالنامے کی تیاری میں اب کے جو ہمیں پریشانی ہوئی کبھی نہ ہوئی تھی کاغذ کے دام اتنے بڑھ گئے ہیں اتنے بڑھ گئے ہیں کہ تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ بازار میں کاغذ ملتا ہی نہیں۔ جانے ہم نے کتنے جتن کئے ہیں تب بڑی مشکل سے تھوڑا سا کاغذ ملا اور خدا خدا کر کے تمھارے سالنامے کے چھپنے کی نوبت آئی۔

کاغذ کی کمی کی وجہ سے ہمیں دقت کے وقت رسالے کا حجم کم کرنا پڑا اور کئی اچھے اچھے اور دلچسپ مضمون نکالنے پڑے۔ بلاک کی تصویریں بھی زیادہ نہ دے سکے۔ کیا کیا جائے مجبوری سب کچھ کراتی ہے۔ اس سالنامے پر جتنی لاگت آئی ہے اس لاگت میں کئی اچھے اچھے اس سالنامے سے کہیں اچھے سال گرہ نمبر تیار ہو سکتے تھے۔

ہمیں اپنے چند خاص مضمون نگاروں سے بڑی شرمندگی ہے۔ ہم نے اُن سے خاص طور سے مضمون لکھوائے اور انھیں چھاپ نہ سکے۔ محترمی جناب عبدالغفور صاحب لکچرر ٹریننگ کالج علی گڑھ نے دو بہت ہی اچھے اچھے مضمون مرحمت فرمائے تھے اور کئی مضمون اپنے شاگردوں سے لکھوائے تھے ان میں سے ہم صرف ایک مضمون چھاپ سکے۔ اسی طرح کئی اور حضرات کے مضمون نہ چھپ سکے۔

ان میں سے کئی مضمون بہت اچھے ہیں مثلاً :-
دریائے سندھ کی کہانی۔ بچوں کی دکان۔ ہم کیوں روتے ہیں۔ ہماری زمین۔ لوئی پاسچر۔ جگدیش چندر بوس۔ ریڈیو وغیرہ۔ یہ سب اللہ نے کیا تو اگلے پرچوں میں چھپیں گے

اس پرچے میں بھی بہت سے مضمون نا تمام چھپے ہیں۔ اگر پورے پورے چھاپ دئے جاتے تو چار پانچ مضمونوں ہی سے سارا پرچہ بھر جاتا۔

محترمی عبدالغفور صاحب کے علاوہ اس پرچے کی تیاری میں جناب مشتاق احمد صاحب بی اے علیگ سے بھی بہت مدد ملی۔ اُنھوں نے ہماری درخواست پر کئی اچھے اچھے مضمونوں کا ترجمہ کیا ہے۔ ان مضمونوں کو تمھاری دلچسپی کی خاطر ہم نے کہانی کی شکل دے دی ہے۔

پچھلے مہینے سرحد کے محکمۂ تعلیم نے بموجب سرکلر .... صوبہ سرحد کے مدرسوں کے لئے پیام تعلیم کی منظوری مرحمت فرمائی ہے۔ ہم محکمۂ تعلیم کی اس سرپرستی کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔


جوہر چاندوڑی
مژدۂ فرحت سنائے سال نو
کوئی تازہ گل کھلائے سال نو
اس جہاں میں نام پائے سال نو
کوئی رہ جائے نہ جگ میں غم نصیب
ہند کی قوموں میں پیدا ہو خلوص
سربلندی ہو ہمیں یارب نصیب
ہم رہیں ثابت قدم ہر حال میں
ہم نہ ہاریں ہمت اچھے کام سے
غم زمانے کا مٹائے سال نو
اور نیا ہی گیت گائے سال نو
کوئی اچھا رنگ لائے سال نو
عیش کے ایام لائے سال نو
رشتۂ الفت بڑھائے سال نو
بام رفعت پر چڑھائے سال نو
گر ہمیں یہ آزمائے سال نو
حوصلہ اتنا بڑھائے سال نو
ہے یہی جوہر ہماری اب دعا
ہر کسی کو راس آئے سال نو
۱۹۴۲ء
FIROZE 42

پاپ کی ناؤ

مولوی محمد شفیع الدین نیّر

ہمارے دیس میں ایک پہاڑی جنگل تھا۔ اس جنگل میں خرگوش بہت تھے۔ اوّل تو یُوں ہی خرگوش تھوڑے بھی ہوں تو چند سال میں بہت سے ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ جنگل تو ایسا سہانا اَور ہرا بھرا تھا کہ اس پاس کے جنگلوں سے چل چل کر بہت سے خرگوش یہاں آ کر رہنے لگے تھے۔

جنگل کیا تھا بہشت کا نمونہ تھا۔ اُونچے اُونچے پہاڑ، آسمان سے باتیں کرنے والے۔ اُن پر دیودار، چیڑ، تن اَور سال کے لمبے لمبے اَور خُوب صورت درخت اَور ہری بھری جھاڑیاں اپنی بہار دکھا رہی تھیں۔ ایک طرف ایک دریا بھی بہتا تھا۔ اس میں پہاڑ کے بہت سے ندی نالے آ آ کر ملتے تھے۔ زمین زرخیز، پانی کی افراط، آبادی سے دُور، ہری ہری گھاس، نرم نرم پتیوں والے پودے۔

خرگوش جنگل کی نرم نرم گھاس کھاتے، دریا کا نِتھرا ستھرا صاف پانی پیتے۔ ہرے بھرے میدانوں میں گھنٹوں اچھلتے، کُودتے، دوڑتے، بھاگتے۔ بڑے چین سے زندگی بسر ہوتی۔ شکاری اس جنگل میں کم آتے تھے اَور دُوسرے درندے بھی کم تھے۔ اس لئے اَور بھی آرام تھا۔

اس جنگل سے کچھ دُور ایک ریاست تھی۔ اس ریاست کا نام جیت گڑھ تھا۔ جیت گڑھ میں ایک بہت بڑا راجا راج کرتا تھا۔ اس راجا کے پاس فوج بھی بہت تھی۔ اَور ہتھیار بھی ہر قسم کے کافی تھے۔ اس راجا کی دھاک دُور دُور تک لوگوں کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کوئی اَور راجا اس کے سامنے نہ ٹھہر سکتا۔ لڑتا تو ہار جاتا۔ اَور اُس کی فوج اِس کی فوج کے سامنے سے دُم دبا کر بھاگتی۔ اس راجا کا زور بہت بڑھا تو اُس کے دل میں گھمنڈ پیدا ہو گیا۔ یہ اپنی رعایا پر ظلم کرنے لگا۔ ریاست میں کسی کو امیر دیکھتا تو اس کا روپیہ چھین لیتا۔ کسی کے پاس کوئی اچھا گھوڑا یا ہاتھی ہوتا تو اُس سے لے لیتا۔ اپنی طاقت کے گھمنڈ پر جو حکم چاہتا دیتا۔ ریاست کے آدمی چوں بھی نہ کر سکتے۔ اس کی دیکھا دیکھی اس کے درباری یا امیر اَور افسر بھی اس کے رنگ میں رنگ گئے تھے۔ ریاست کے لوگ اُس کے راج سے تنگ آ چکے تھے۔ مگر کیا کر سکتے تھے۔

اس راجا کو شکار کا بہت شوق تھا۔ دنوں ہفتوں، بلکہ مہینوں شکار میں رہتا۔ ریاست کا کام اَور رعایا کی دیکھ بھال اپنے نوکروں پر چھوڑ جاتا۔ ان لوگوں کی خُوب بن آئی۔ طرح طرح سے رعایا کو ستاتے۔

ایک بار یہی راجا اچانک، اس جنگل میں بھی آگیا۔ جنگل کا سہانا منظر دیکھ کر اُس کا جی بہت خوش ہوا۔ حکم دیا کہ چند روز یہیں دریا کے کنارے خیمہ نصب کیا جائے۔ کہنے کو یہ لوگ دو تین ہی روز اس جنگل میں رہے پر خرگوشوں پر تو یوں سمجھیے کہ آفت آگئی۔ راجا اور راجا کے ساتھیوں نے صرف شوق پورا کرنے کی خاطر ہزاروں خرگوشوں کو گولی کا نشانہ بنا ڈالا۔ ہزاروں اس آفت سے بچنے کے لئے بھاگ گئے۔ انھی خرگوشوں میں ایک جوڑا بہت اچھا اور سمجھ دار تھا خرگوش کا نام پدم اور خرگوشنی کا نام پدما تھا۔ پدم بہت دانا اور ہوشیار تھا۔ سب کی خدمت کرنے کے لئے تیار رہتا تھا۔ اس لئے سارے خرگوش اس کو اپنا سردار سمجھتے تھے۔ پدما بھی بہت نیک اور سمجھ دار تھی۔ اس لئے اس کی عزت بھی سب کے دلوں میں گھر کئے ہوئے تھی۔ اُن کے تین خوب صورت بچے بھی تھے۔ سب سے چھوٹا سب سے اچھا تھا۔ اس کا نام ہیرا تھا۔ ابھی یہ چھوٹا ہی سا تھا مگر ایسی پیاری پیاری باتیں کرتا کہ سب اس کو دل سے چاہتے۔

پدم کا برتاؤ کچھ ایسا اچھا تھا اور اس قدر سب کے کام آتا تھا کہ اپنی برادری کے باہر بھی اس کے بہت سے دوست تھے، ان میں اُس کی ایک خاص دوست بادپاتھی جو فرفرام کہلاتی تھی۔ دوسرا دوست جل دیو تھا اس کا نام غرغرام تھا۔ ایک دیوی اور بھی تھیں اُن کا نام سرسرام تھا ان کا مزاج بڑا تیز تھا۔ مگر پدم کے آگے وہ بھی پانی بھرتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ پدم اُن کے بہت دفعہ کام آیا تھا اس لئے یہ سب بھی اس کا بہت خیال رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ کچھ نہ کچھ خدمت کر کے اس کی بھلائی کا بدلا اُتار دیں۔

راجا صاحب اور اُن کے ساتھی شکار میں مصروف تھے۔ ہر طرف سے بندوق کے فیروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ خرگوش گولیاں کھا کھا کر گر رہے تھے پدم اور پدما نے سوچا کہ اس بلا سے بچنے کے لئے پہاڑ پر چڑھ جائیں اور کھوہ میں چھپ کر اپنی جان بچائیں۔ اُنھوں نے اپنے دوسرے بچوں اور ہیرا کو ساتھ لیا، اور اپنے بھٹ سے نکل کر چپکے چپکے پہاڑ کی طرف چلے، دوڑتے، بھاگتے، گرتے، پڑتے چلے جا رہے تھے کہ راجہ کے کچھ آدمی اُدھر سے گزرے۔ ہیرا کو دیکھ کر سب کا جی للچایا۔ وہ بولے اس بچے کو زندہ نہ پکڑا تو کچھ بات نہ ہوئی۔ یہ کہہ کر ہیرا کو پکڑنے کے لئے دوڑے ہیرا اپنی جان بچانے کے لئے بہت تیز بھاگا۔ مگر اچانک اُس کے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا۔ بچارے کو رکنا پڑا جھٹ دو سوار اپنے گھوڑوں سے اُترے، اُنھوں نے ہیرا کو پکڑ لیا، یہ دیکھ کر تو پدم اور پدما کی آنکھوں میں دُنیا اندھیر ہو گئی۔ اُنھوں نے ہاتھ جوڑ کر اُن سے کہا:۔ "ہمارے بچے کو چھوڑ دو، ہماری آہ نہ لوٹ مگر سواروں نے اُن کی فریاد کی مطلق پرواہ نہ کی بلکہ ایک قہقہہ لگایا۔ یہ دونوں اپنا کلیجہ مسوس کر رہ گئے اور سواروں کے پیچھے ہولئے۔ سواروں نے ہیرا کو راجا کے سامنے پیش کیا۔ راجا ہیرا کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اُس نے حکم دیا کہ اُسے ایک پنجرے میں بند رکھا جائے۔

پدم اور پدما راجا کے سامنے آئے اُنھوں نے

جھک کر راجا کو سلام کیا۔ اور ادب سے بولے "مہاراج!
ہم پر دیا کیجئے۔ ہمارے بچے کو بند نہ کیجئے۔ غریبوں اور
کم زوروں کو ستانا بڑا پاپ ہے۔ آپ نے اس جنگل
کے ہزاروں بے زبان اور بے گناہ خرگوشوں کی جان
لے کر بڑا پاپ کمایا ہے۔ اب یہ پاپ کی ناؤ ایسا نہ ہو
کہ بھر کر ڈوب ہی جائے۔"

راجا، پدم کی یہ باتیں سُن کر ہنسا کہنے لگا۔
غریب، کم زور، پاپ، ہونھ۔ یہ کچھ بھی نہیں۔ میری
طاقت کے سامنے کس کی مجال ہے کہ دم مار سکے۔ غریب!
غریب اس زمانے میں پسنے ہی کے لئے ہیں۔ کم زور!
کم زور اس لئے ہیں کہ وہ طاقت ور کا لقمہ بنیں۔ ان کو
پیسنا پاپ نہیں، پُن ہے۔ اپنی جان کی خیر چاہتے ہو
تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ ابھی تمھاری کھال
کھینچ لی جائے گی۔"

پدم بولا: "مہاراج! بڑے بول کا سر نیچا۔ اونچے
اونچے پہاڑ سر کے بل گر جاتے ہیں۔ کسی کی حالت سدا
ایک سی نہیں رہتی۔ اب بھی وقت ہے۔ غریب کی آہ نہ
لیجئے۔ آپ نے تلسی داس جی کا وہ دوہا سُنا ہوگا۔

تلسی آہ غریب کی کبھی نہ خالی جائے
مرے چام کی سانس سے لوہا بھسم ہو جائے

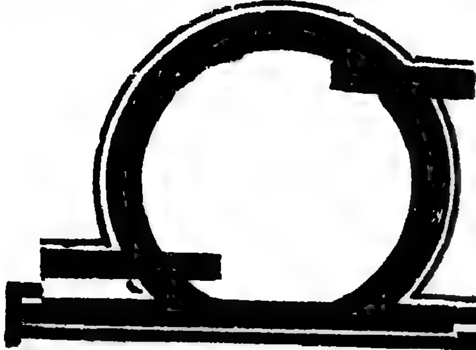
راجا کو یہ دوہا سُن کر تاؤ آگیا وہ بولا "چل چل اپنا راستہ
لے بڑا آیا تلسی داس کا دوہا سنانے والا۔ جو تیرے جی
میں آئے کر۔" پدم بولا: "تو اب تیار ہو جائیے۔ دبی
ہوئی چیونٹی بھی کاٹ لیا کرتی ہے۔ جان جائے یا
رہے میں آپ سے بدلا لے کر چھوڑوں گا۔ میرے
ساتھیوں پر جو ظلم آپ نے کئے ہیں اور میرے پیارے
بچے کو لے کر جو ستم مجھ پر ڈھا رہے ہیں اُس کی سزا
آپ کو بھگتنی پڑے گی۔"

سزا کا لفظ پدم کے مُنہ سے نکلنا تھا کہ راجا کی
آنکھیں مارے غصے کے لال انگارا ہو گئیں۔ اس نے کہا
"کوئی ہے؟ ذرا میری بندوق لاؤ۔ اس گستاخ اور
بے ادب خرگوش کو اس کی گستاخی اور بے ادبی کا مزا
چکھا دوں۔"

یہ سنتے ہی پدم اور پدما اپنے دونوں بچوں کو لے کر
بھاگے۔ راجا نے اُن کا بہت دور تک پیچھا بھی کیا مگر
یہ اُن کے ہاتھ نہ آئے۔ گرتے پڑتے یہ پہاڑ پر پہنچے۔
وہاں اور بھی ہزاروں خرگوش پہلے سے موجود تھے۔
پدم کو دیکھ کر سب خوش ہو گئے۔ مگر جب اُنھوں نے پیارے
کے پکڑے جانے کا حال سُنا تو ان کی خوشی بھی غم سے
بدل گئی۔

پدم بولا:۔ "راجا نے ہم پر آفت ڈھا رکھی ہے
ہمیں چاہیے کہ اس سے بدلا لیں۔" اسی وقت ایک جلسہ
ہوا، ہزاروں خرگوش بیٹھ گئے۔ کئی نوجوان خرگوشوں
نے جوش سے بھری ہوئی تقریریں کیں اور اس بات
پر زور دیا کہ ہم جو گنتی میں اتنے ہیں اک دم راجا اور
اُس کے لشکر پر ٹوٹ پڑیں اور مقابلہ کر کے اس کے
ظلم کا بدلا لیں۔"

(باقی آئندہ)



سائنس دانوں کی کہانی

سید نور الحسن ہاشمی، ایم اے

تم نے سائنس کا لفظ اپنے بڑوں کی زبانی بارہا سُنا ہوگا اگر تم کسی مدرسے یا اسکول میں پڑھتے ہو تو بھی تمھارے مدرسے میں سائنس پڑھائی بھی جاتی ہوگی اور سائنس روم کے نام سے عملی تجربوں کے لئے اس کا ایک کمرہ بھی الگ ہوگا۔ مگر یہ سائنس ہے کیا چیز اور تمھارے ایڈیٹر صاحب آخر اس کے پیچھے اس طرح ہاتھ دھوکے کیوں پڑے ہیں اور کچھ نہیں تو سائنس نمبر ہی نکال دیا تو بھی بات یہ ہے کہ سائنس بہت اچھی چیز ہے۔ اس کے لفظی یا لغوی معنی تو بس علم کے ہیں۔ لیکن اب جو سائنس کا لفظ چل نکلا ہے تو اس سے اس قسم کا علم ہے جس کے ذریعے قدرت کے قانونوں کو سمجھنے اور معلوم کرنے کی کوشش کی جائے۔ قدرت کے قانون بے دیکھے بھالے اور بغیر پرکھے معلوم نہیں ہو سکتے اس کے لئے عمل اور محنت مشاہدہ اور غور و فکر بہت ضروری ہیں۔ اسے ایک مثال سے سمجھو۔ ایک شخص تھا نیوٹن نامی اس نے ایک سیب کو درخت سے زمین پر گرتے دیکھا تب اُس نے سوچنا شروع کیا کہ ایسا کیوں ہوا۔ سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ زمین میں ضرور کوئی کشش ہوگی جس کی وجہ سے سیب زمین پر گر پڑا کشش کے معنی ہیں سمجھتے ہو یعنی کھینچنے کی طاقت۔ نیوٹن نے صرف سوچنے اور غور کرنے ہی پر بس نہیں کیا عملی تجربے بھی کئے۔ آخر اُس نے معلوم کر لیا کہ زمین میں مقناطیسی کشش ہے جس کی وجہ سے اس کے اوپر کی ہر چیز اُس سے لگی رہتی ہے یا وابستہ رہتی ہے اور ہر چیز چاہے کتنی ہی اوپر پھینکی جائے زمین ہی پر آکر گرتی ہے۔

اب تو تم سائنس کا مطلب سمجھ گئے ہو گے یعنی یہ کہ سائنس ایک ایسا علم ہے جس میں عمل کے ذریعے اور غور و فکر کی مدد سے قدرت کے قانونوں کا پتہ چلایا جاتا ہے۔ اب قدرت کے قانون تو ہر جگہ موجود ہیں یہ نباتات، جمادات، حیوانات، زمین، ہوا، بارش آسمان، ستارے کیا ہیں قدرت کے عطیے ہیں اور خدا کا منشا یہ ہے کہ انسان اُن پر غور کرے اور اُن سے فائدہ اُٹھائے۔ تو اِس سائنس کے علم میں رفتہ رفتہ بہت پھیلاؤ پیدا ہو گیا۔ جیسے تناور درخت میں بہت سی شاخیں پھوٹ آتی ہیں اِسی طرح سائنس میں بھی بہت سی شاخیں پھوٹیں۔ اوپر جن چیزوں کا ذکر کیا گیا اُن کے جاننے کے علم مختلف ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں مگر ہیں یہ سب سائنس کے اندر۔ اس تعریف کو سُن کر تم کہہ سکتے ہو کہ سائنس تو جب سے آدمی پیدا ہوا جبھی سے شروع ہو گئی ہوگی، ہے بھی یہی بات۔ مگر انیسویں صدی سے

اسے باقاعدہ طور پر ایک علیحدہ علم مانا جانے لگا۔ اس سے پہلے قدرت کے بھیدوں کا کھوج لگانا مذہبی لوگ بُرا سمجھتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ یہ خُدا کے قانون میں دخل درمعقولات ہے اور یہ شیطان کا کام ہے۔ بہت سے لوگ اسے گناہ سمجھتے تھے۔ بہت سے لوگ سائنس کے علموں کو جادوگری سمجھتے تھے۔ اس لئے علانیہ طور پر لوگ اِن علموں کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے مگر یہ چیزیں صرف یورپ کے عیسائیوں میں تھیں۔ اسلام نے تو کھلے لفظوں میں اِس کی اجازت دی، نہ صرف اجازت دی بلکہ ترغیب دلائی۔

ایک جگہ کلام پاک میں ہے۔

هُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرَاتٌ بِاَمْرِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ط (النحل)

ترجمہ:۔ اور تمھارے قبضے میں دئے گئے رات اور دن نیز آفتاب و ماہتاب اور ستارے اس کے حکم سے تمھارے تابع کر دئے گئے، یقیناً غور و فکر کرنے والوں کے لئے اس میں نشانیاں ہیں۔

اس طرح کی آیتیں قرآن شریف میں کئی جگہ آئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان جب مسلمان تھے انھوں نے سائنس اور فلسفے میں خوب ترقی کی۔ رفتہ رفتہ یورپ کے عیسائیوں نے بھی دیکھا کہ ان علموں کو جاننے میں فائدہ ہی فائدہ ہے اور ان کے جاننے سے خدا کی قدرت کا جلوہ اور بھی اچھی طرح نظر آتا ہے۔ اس لئے اُنیسویں صدی سے علانیہ طور پر ان علموں کا چرچا ہونے لگا۔ یہ نہ سمجھنا کہ اس سے پہلے یہ علوم مثلاً جغرافیہ، علم النجوم (ستاروں کا علم) کیمیا وغیرہ

تھے ہی نہیں۔ نہیں بہت پہلے سے تھے۔ عیسائیوں سے پہلے مسلمانوں نے ان علموں میں بہت ترقی کی اور محنت و کوشش کا حق ادا کر دیا۔ یورپ کے عیسائیوں نے ان علموں کو مسلمانوں ہی سے سیکھا اور انھیں ترقی دی ہاں یہ بات ضرور تھی کہ ان علموں کی بنیاد پہلے قیاس پر زیادہ تھی۔ مشاہدے اور عمل کو زیادہ دخل نہ تھا۔

اب میں شروع سے تمھیں چند سائنس دانوں کے حالات بتاتا ہوں۔ شروع کے سائنس دانوں میں بہت سے ایسے ہیں جنھیں اُن کے زمانے میں کوئی سائنس داں نہیں کہتا تھا۔ مگر اُن کے حالات اور اُن کے کاموں کی تحقیق کے بعد انھیں بھی اسی طبقے میں شمار کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلا نام تھیلس کا آتا ہے۔ یہ یونان کا مشہور فلسفی اور سائنس داں تھا۔ یہ اتنا عقل مند تھا کہ یونان کے سات عقل مندوں میں سب سے اول گنا جاتا ہے۔ یہ ۶۴۰ قبل مسیح میں یعنی اب سے ٹھیک ۲۵۸۲ سال پہلے بمقام ملیٹس پیدا ہوا۔ جامیٹری اور ہیئت (ستاروں) کے علم سے اُسے خاص دلچسپی تھی اس کے بارے میں ایک دلچسپ قصہ بھی مشہور ہے۔ ایک دفعہ وہ ستاروں کے دیکھنے میں بالکل محو چلا جا رہا تھا، راستے میں کنواں پڑا اور وہ کنوئیں میں گر پڑا۔ پاس ہی ایک ماما کھڑی تھی وہ ہنس کر کہنے لگی " واہ حضرت آسمان پر دیکھنے کا تو اتنا شوق اور اپنے قدموں کے نیچے کی زمین کا پتہ نہیں"۔ کہا جاتا ہے کہ تھیلس ہی نے سب سے پہلے پتہ لگایا کہ زمین گول ہے اور زمین سورج کے گرد ۳۶۵ دن میں گھوم جاتی ہے۔ اور یہی پہلا شخص تھا جس نے چاند گرہن اور سورج

کے صحیح اسباب بتلائے۔ ایک بار اس نے عنبر کی لکڑی پر کپڑا خوب گھِسا اور معلوم کر لیا کہ اب اس میں مقناطیسی طاقت پیدا ہو گئی ہے اور تنکے اور سوکھی پتیاں وغیرہ اس میں چمٹ جاتی ہیں غرض تھیلس اسی طرح سائنس کے علم کو اپنی محنت اور کوشش اور غور و فکر سے ترقی دے رہا تھا۔ مگر وہ زمانہ بہت جہالت کا تھا۔ یونان کے لوگ دیوی دیوتاؤں کو پوجتے تھے جب انھوں نے دیکھا کہ یہ اتنا بڑا عالم ہوتا جارہا ہے کہ ان کے دیوتاؤں سے بھی بڑھا جا رہا ہے۔ اور ایسی ایسی باتیں بتاتا ہے جو اُن کے تمام عقیدوں کے خلاف ہیں تو وہ بہت ناراض ہوئے اور اس کے لئے سزائے موت کا حکم دے دیا۔ اس سزا سے تو کسی نہ کسی طرح وہ بچ گیا۔ لیکن جلاوطن کر دیا گیا۔ ۵۴۵ قبل مسیح اس کا انتقال ہوا۔

دوسرا نام اقلیدس کا آتا ہے۔ یہ بھی یونانی تھا اور کوئی ۳۰۰ سنہ قبل مسیح میں موجود تھا۔ اس کی ساری زندگی اسکندریہ (مصر) میں گذری یہیں اس نے اپنی اقلیدس (جامیٹری) کی مستند کتابیں لکھیں۔ اور یہ دو ہزار برس سے زیادہ گذر جانے پر بھی ہر اسکول اور مدرسے میں پڑھائی جاتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ زمین کو ناپنے اور شکلوں کو ترتیب دینے کا اس سے بہتر طریقہ اور کسی نے نہیں نکالا اب اقلیدس (جامیٹری) کچھ آسان کر دی گئی ہے کہ جلد اور آسانی سے بچوں کی سمجھ میں آجائے۔ ورنہ اصل میں جامیٹری کے اصول وہی ہیں جو اقلیدس نے مقرر کئے تھے کہا جاتا ہے کہ اقلیدس اسکندریہ کے بڑے مدرسے میں جامیٹری اور ریاضی پڑھاتا تھا، وہاں بطلیموس اول (شہزادہ مصر) بھی اس کا شاگرد تھا۔ جامیٹری بہت سے بچوں کو مشکل لگتی ہے اس کی سمجھ میں بھی مشکل سے آتی تھی اس نے اپنے اُستاد اقلیدس سے کہا "اسے ذرا آسان کر دیجئے۔" اقلیدس نے جو جواب دیا وہ آج تک مشہور ہے "صاحبزادے! جامیٹری سیکھنے کا کوئی شاہانہ آسان طریقہ نہیں ہے۔"

تیسرا نمبر ایک اور یونانی کا آتا ہے اس کا نام ارشمیدس تھا یہ ۲۸۷ قبل مسیح میں سائرا کیوز کے جزیرے میں پیدا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ وہاں کے بادشاہ ہیرو کا رشتہ دار تھا۔ یہ ایک ماہر انجینیر اور ریاضی داں تھا تم شاید اپنے دل میں کہو کہ ریاضی کا سائنس سے کیا تعلق تو اصل یہ ہے کہ ریاضی سائنس کے لئے بہت ضروری شئے ہے۔ کیونکہ ہر چیز میں ہر چیز کا حساب بہت ہی باقاعدہ ہوتا ہے۔ خاص کر علم نجوم یا ہیئت (ستاروں کے علم) اور علم طبیعات اور علم کیمیا میں تو بغیر ریاضی کے اصولوں کے کام ہی نہیں چلتا (طبیعیات کا علم اسے کہتے ہیں کہ جس سے بجلی بھاپ، ہوا، حرارت، وغیرہ کے اصول معلوم ہوں اور کیمیا اسے کہتے ہیں جس سے مختلف دھاتوں، نمکوں وغیرہ کا حال معلوم ہو۔

ارشمیدس اپنے وطن سائرا کیوز میں انجینیری کا کام کرتا تھا اب یہ تو نہیں معلوم کہ اس نے اس زمانے میں کون کون سی انجینیری کے اصول وضع کئے تھے۔ ہاں دو ایک چیزیں معلوم ہوئی ہیں مثلاً تیرنے کا اصول اسی نے نکالا کوئی چیز پانی پر کیوں تیرتی ہے پیچ دار اسکرو اور گھومتے ہوئے پانی نکالنے کے پمپ بھی اس نے ایجاد کئے تھے۔

باقی آئندہ

پیام تعلیم کے منیجر کو خط لکھنا ہو تو نمبر خریداری ضرور لکھو اور ایڈیٹر کو خط لکھو تو پورا پتہ لکھو۔ "منیجر"

کہانی ہے یہ اک نٹ کی



ننھے پیامیوں کے لئے
مولوی محمد شفیع الدین نیر





کہانی ہے یہ اِک نٹ کی — وہ تھا لیکن بڑا نٹ کھٹ
ہر اِک کرتب دکھانے میں — بہت ہی تیز اور فرّٹ
ہو ورزش کیسی ہی مشکل — وہ کر لیتا اُسے جھٹ پٹ
وہ اُٹھا کھیل کرنے کو — وہ دیکھو اُس نے لی کروٹ
وہ دو لکڑی کے ڈنڈوں پر — چلا، کرتا ہوا کھٹ پٹ
وہ آتا دوڑنے پر جب — تو اکثر دوڑتا سرپٹ
پہن کر ناچتا گھنگرو — نہ ہوتی پر ذرا آہٹ
وہ جب باتیں بناتا تھا — تو بکتا خوب ہی اٹ سٹ
تماشائی جو خوش ہوتے — بجاتے تالیاں چٹ چٹ
تماشا ختم کر چکتا — تو پیسوں کی لگاتا رٹ

کہانی ہے یہ اک نٹ کی
کہ جس میں تھی بڑی پھرتی



گراموفون

سید ابو طاہر بی۔ایس۔سی

میں سہگل کا مشہور ریکارڈ "ایک بنگلہ بنے نیارا" بغل میں دبائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور رفو کو گراموفون کا بکس کھولتے دیکھ کر اس کی طرف مسکراتا ہوا بڑھا۔

میں:۔ کیوں ری چھپکلی! یہاں کیا کر رہی ہے؟

رفو:۔ گراموفون بجاؤں گی۔

میں:۔ دیکھ ہم ایک نیا ریکارڈ لائے ہیں "اک بنگلہ بنے نیارا"

رفو:۔ تو میں کیا کروں؟

میں:۔ تم ذرا ہٹ جاؤ۔ میں اس ریکارڈ کو بجا لوں تو آنا۔

رفو:۔ میں تو نہیں ہٹتی۔

میں:۔ اور جو میں نے ہٹا دیا۔

رفو:۔ آپ ہوتے کون ہیں ہٹانے والے: پکارتی ہوں ابھی باجی کو (زور سے) دیکھئے باجی!

میں بھائی رباب کے خیال سے خاموش ہو گیا کہ وہ انصاف تو کرتی نہیں اور ہمیشہ اپنی بہن کی طرفداری کیا کرتی ہیں۔ پھر باجہ بھی تو میرا نہیں تھا۔

میں:۔ کبھی باجہ بجایا بھی ہے۔

رفو:۔ روز بجاتے ہیں

رفو آنکھیں بند کئے چابی بھر رہی تھیں۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔

میں:۔ چابی زیادہ بھر دو گی تو اندر کی کمانی ٹوٹ جائے گی۔

رفو:۔ (ہاتھ روک کر) اچھا آپ مجھے سبق نہ پڑھایئے۔

(اس نے کھٹکا کھول دیا اور باجے کا توا گھومنے لگا)

میں:۔ جب ریکارڈ رکھنا تب کھٹکا کھولنا ابھی تو بند کر دو

(میں نے کھٹکا بند کر دیا)

اُس نے باجے پر ریکارڈ رکھنے کے بعد صدا بخش میں سوئی لگا کر کھٹکا کھول دیا۔ فوراً ہی صدا بخش ریکارڈ پر خراش ڈالتا ہوا کنارے آ لگا۔

میں:۔ شاباش میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تمھیں بجانا نہیں آتا

(میں نے سوئی جو دیکھی تو بالکل گھسی ہوئی تھی۔ اس لئے نکال کر پھینک دی۔)

رفو:۔ سوئی کیوں پھینک دی آپ نے۔

میں:۔ (غصے میں) کچھ آتا جاتا بھی ہے تمھیں۔

رفو:۔ (نرمی سے) آپ کو سب کچھ آتا ہے۔

میں:۔ جو تمھارا جی چاہے پوچھ کر دیکھ لو۔

رفو:۔ اچھا بتایئے ریکارڈ میں یہ کیا بنا ہوا ہے۔

میں:۔ یہ آواز کی تصویریں ہیں۔

رفو:۔ (منہ دیکھ کر) اچھی اُڑائی۔ آواز بھی کہیں دیکھنے

میں آتی ہے۔

میں نے اپنی جیب سے ربڑ کا چھوٹا سا ٹکڑا نکال کر کاٹ ڈالا۔ اور اس کا ایک ٹکڑا لے کر ہونٹوں پر "تان لے" اک بنگلہ بنے نیارا" گنگنانے لگا۔ پھر اس کو ہٹا کر رفو سے پوچھا۔ کچھ دیکھا تم نے۔ یہی آواز کی تصویریں تھیں جو ربڑ پر بن رہی تھیں۔

رفو :- وہ تو آواز کی لہریں تھیں۔

میں :- اور لہریں آواز کی تصویریں نہیں ہیں تو پھر کیا ہیں۔

رفو :- تو، ریکارڈ بھی اسی طرح بھرتے ہیں کیا؟

میں :- کیسے۔

رفو :- گانے والوں کے منہ پر ریکارڈ لگا کر تصویریں اتار لیتے ہیں۔

میں :- (قہقہہ مار کر) شاباش مادام کیوں ری! (یہ نام عرشی بھائی نے بتایا تھا)

رفو :- (جھینپ کر) اللہ بتلایئے۔

میں :- ارے بے وقوف! اس کے لئے ایک خاص آلہ ہوتا ہے۔ عرشی بھائی نے نام بتایا تھا مگر میں بھول گیا۔

رفو :- منہ میں دبا لیتے ہوں گے۔

میں :- دیکھو! عرشی بھائی نے ایک دن کان کماری کی کہانی کہی تھی۔ وہ تمہیں یاد ہے؟

رفو :- ہاں۔

میں :- بس یہ آلہ ہمارے کان کی بالکل نقل ہے۔ اس کی تصویر عرشی بھائی کی لال کتاب میں بنی ہوئی ہے۔ تم اٹھا لاؤ تو سمجھا دوں (رفو منٹ کے منٹ میں کتاب اٹھا لائی)

میں :- (رفو کا کان پکڑ کر) دیکھو اس تصویر میں تمہارے کان کی طرح ایک بھونپو ہے۔ جب اس میں گویے اپنا منہ ڈال کر گاتے ہیں۔ تو اس کے اندر کی ہوا میں آواز کی لہریں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کے آخر میں شیشے کی نازک تختی لگی ہوئی ہے۔ جیسے تمہارے کان کا پردہ۔ بتاؤں تمہارے کان میں کانا باتی کو کرکے

رفو :- بس رہنے دیجئے میں سمجھ گئی۔

میں :- کیا سمجھیں آپ؟

رفو :- شیشے کی تختی بھی تھرتھرانے لگتی ہے۔

میں :- ٹھیک! اب دیکھو۔ اس کے دوسری طرف ایک سوئی کا موٹا سرا تختی پر جڑا ہوا ہے اور اس کی نوک نیچے لٹک رہی ہے۔ یہ نوک اتنی سخت اور تیز ہے کہ اگر تمہارے پیٹ میں بھونک دی جائے تو.....

رفو :- اچھا میں جاتی ہوں۔

میں :- (جیسے سنا ہی نہیں) ہاں تو! یہ سوئی بھی تھرتھرانے لگتی ہے.........

رفو :- جس طرح کان کے پردے سے تین ہڈیاں تھرتھراتی ہیں۔

میں :- میرے منہ سے بات کیوں چھینے لیتی ہو۔

رفو :- اچھا معاف کیجئے جگدیش چندر ساگر صاحب۔

میں :- (قہقہہ مار کر) ارے وہ جگدیش چندر بوس ہیں، بے وقوف!

خیر! اس سوئی کے نیچے یہ دیکھو۔ ایک چکنی رکھی ہوئی ہے۔ یہ موم کا بیلن ہے۔ بیلن۔ یہ گویا ہمارے کان کے اندر جھلی کا پانی ہوا۔ اب اگر بیلن ریکارڈ کی طرح گھومنے لگے تو کیا ہوگا؟

رفو:۔ مگر وہ گھوم ہی کیسے سکتا ہے۔

میں:۔ ارے احمق! اس کے نیچے ایک کمانی جو لگی ہوئی ہے۔

رفو:۔ ذرا آپ منہ سنبھال کر بات کیجئے۔

میں:۔ (نرم ہو کر) اچھا! خفا نہ ہو! (رفو کھل گئیں)

جب بیلن چکر کھانے لگے گا تو سوئی کی نوک سے اس پر نشان بن جائیں گے۔ چونکہ سوئی کی نوک تھرتھرا رہی ہے اس لئے وہ نشان بھی لہرے کی شکل کے ہوں گے۔

(ایک ریکارڈ کی بجنے والی لہروں کی یک رخی تصویر)

رفو:۔ لہرے تو ہم دوپٹے پر بناتے ہیں۔

میں:۔ (صبر کرکے) یہ دیکھو جیسے میں اسی برس کا بڈھا ہوں۔ میرے ہاتھوں میں رعشہ پڑ گیا ہے۔ اب اگر میں قلم کاڈو دبائے کر کاغذ پر رکھتا ہوں اور تم کاغذ کو آہستہ آہستہ نیچے سے سرکاتی جاتی ہو تو ....

رفو:۔ لہرے بن گئے

میں:۔ ٹھیک اسی طرح موم کے بیلن پر بھی آواز کی لہریں بن جاتی ہیں۔

(ایک ریکارڈ کی بجنے والی لہریں)

رفو:۔ پھر ان موم کو کاٹ کر ریکارڈ بنا لیتے ہوں گے۔

میں:۔ نہیں! اس بیلن کو گلا پار ہے کے تختے پر رکھ کر دباتے ہیں تو لہرے اس پر بھی اتر آتے ہیں۔ وہی تمہارا ریکارڈ ہو جاتا ہے۔ تو اب سہگل کا ریکارڈ باجے پر رکھو۔ شاباش۔

(باجہ بجنے لگتا ہے۔ "اک بنگلہ بنے نیارا رہے کنبہ جس میں سارا")

یہ دیکھو سوئی گھوم گھوم کر آواز کی پگڈنڈیوں پر چل رہی ہے۔

رفو:۔ مگر یہ اوپر نیچے کیوں ہوتی جاتی ہے۔

میں:۔ یہ لہرے ہیں، جیسے اونچی نیچی سڑک، ایسی سڑک پر جس طرح موٹر کو جھٹکے لگتے ہیں، اسی طرح سوئی کو بھی جھٹکے لگتے ہیں۔ یعنی جیسی لہریں ریکارڈ پر بنی ہیں۔ ویسی ہی لہریں سوئی میں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔

رفو:۔ اور اسی طرح سوئی سے آواز آنے لگتی ہے۔

میں:۔ ٹپ ٹپ بولنا بند نہیں کرو گی۔ سوئی کیسے بولے گی

ارے بھئی سوئی کی تھرتھراہٹ "صدابخش" کے پردے میں پہنچ جاتی ہے۔ دیکھو یہ صدابخش ہے، خدابخش نہیں۔

رفو :۔ اچھا اب میں سمجھ گئی۔

میں :۔ کیا سمجھیں۔

رفو :۔ صدابخش کا پردہ تھرتھرانے لگتا ہے تو باہر کی ہوا بھی تھرتھراتی ہے۔

میں :۔ اور وہ ہمارے کان کے پردے سے ٹکراتی ہے۔

رفو :۔ اور آپ کے کان کا پردہ پھٹ جاتا ہے (دکھہ کر بھاگتی ہے۔)

میں :۔ ٹھہر جاؤ۔ (پیچھے بھاگتا ہوں۔)

ٹھوکر لگتی ہے اور گراموفون اُلٹ جاتا ہے میرے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا صدابخش اور سہگل کے ریکارڈ کے ٹکڑے ہیں اور رفو دروازے سے جھانک کر کہتی ہے "خوب ہوا"

ڈراما کیا ہے



پروفیسر محمد مجیب بی اے آکسن
(جامعہ نگر)

(اس سلسلے کا پہلا مضمون پیام تعلیم کے سالنامے سنہ ۴۱ء میں شائع ہوا تھا، اس کا عنوان تھا "آؤ ڈراما کریں" اور اس میں بیان کیا گیا تھا کہ خورشید صاحب کے یہاں ایک تقریب میں محمود، خالد اور راشد نے ایک بسکٹ والے کی نقل کی۔ ماجد صاحب نے ان کے لئے اسٹیج تیار کیا اور ڈراما کرنے کے لئے انھیں ضروری باتیں بتائی تھیں)

محمود نے بسکٹ والے کی نقل اس خوبی سے کی تھی کہ ماجد صاحب سمجھ گئے کہ اگر اسے شوق دلایا جائے تو وہ بہت اچھی نقلیں کرنے لگے گا۔ وہ اسے اور اس کے دوستوں کو اکثر کسی بہانے سے اپنے یہاں بلاتے، ان کی جھجک دور کرنے کے لئے خود کبھی کسی کی، کبھی کسی کی نقل اتارتے، اور پھر لڑکوں سے پوچھتے کہ بتاؤ میں نے ٹھیک نقل اتاری یا نہیں۔ ماجد صاحب کی چھ برس کی بچی رضیہ کو یہ تماشے بہت پسند تھے وہ جب کہیں جاتی تو لوگوں کی صورت، چال ڈھال، بات چیت کے طریقے پر غور کرتی رہتی اور پھر گھر آکر اپنے ابا کو بتاتی کہ یہ بی بی اس طرح چلتی ہیں، وہ بی بی اس طرح بولتی ہیں۔ تھوڑے دنوں میں محمود، راشد اور خالد کو ماننا پڑا کہ رضیہ ان سے کسی بات میں کم نہیں۔

لیکن نقل کرنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ آخر کو سب کا جی اکتا گیا۔ ایک مرتبہ جب سب ماجد صاحب کے یہاں جمع تھے تو محمود نے کہا:۔

"ماجد صاحب ایک اسٹیج بنوائیے"

ماجد صاحب نے پوچھا:

"کیوں"

محمود کا منشا صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ اس کو اب خالی نقلیں اتارنے میں مزہ نہیں آتا، اسٹیج بنوانے کی فرمائش اس نے کچھ سوچ کر نہیں کی تھی۔ لیکن وہ یہ بات اب ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا:

"لوگ کہتے ہیں کہ ڈراما کے لئے ایک اسٹیج بھی چاہئے"

"ہاں اسٹیج بھی چاہئے لیکن وہ اتنا ضروری نہیں، جیسے لکھنے کے لئے میز ہو تو اچھا ہے، لیکن وہ نہ ہو تب بھی کام چل جاتا ہے۔ اگر آدمی کو لکھنا آتا ہو اور اسے معلوم ہو کہ لکھنا کیا ہے"۔

"جی ہاں"

"تو اصل میں ہم کو سوچنا یہ ہے کہ ہم کس کی نقل کریں اور کیوں کریں۔ جب یہ سمجھ میں آجائے گا تو اسٹیج بھی بنا لیں گے۔ اب تک تم ایسے لوگوں کی چال ڈھال اور بول چال

کی نقل کرتے رہتے جو انھیں عجیب معلوم ہوتی تھی، اسی وجہ سے
وہ دلچسپ بھی تھی اس کے علاوہ ایک اور چیز ہوتی ہے کیفیت
تم نے بسکٹ والے کی نقل کی تھی تو یہ دکھایا تھا کہ وہ خالد
کے پیچھے دوڑا تھا اور انھیں پکڑ نہیں پایا۔ اور واپس آکر دیکھا
تو راشد نے ٹوکری خالی کر دی تھی۔ اس وقت وہ کھسیانا
ہو کر رہ گیا۔ یہ اس کی کیفیت تھی اور یہ ایک خاص وجہ سے
پیدا ہوئی۔ رضیہ جانتی ہو کیسے؟"

رضیہ نے زور سے سر ہلایا۔

"جی ہاں اس کے بسکٹ دو شریر لڑکوں نے چرائے تھے
بہت شریر لڑکوں نے۔ اور اب وہ بے چارے کی نقل
اتارتے ہیں اور اس کی ہنسی اڑاتے ہیں۔"

"جناب کیا آپ سمجھتی ہیں کہ ہم نے سچ مچ کسی بسکٹ
والے کے بسکٹ چرائے؟" خالد نے خفا ہو کر کہا۔

رضیہ نے منہ بنا کر جواب دیا۔

"میں کیا جانوں!"

ماجد صاحب بیچ میں بول دیے

"مگر میں جانتا ہوں، انھوں نے سچ مچ چوری نہیں
کی تھی، چوری کی نقل اس طرح اتاری تھی کہ معلوم ہوتا تھا
انھوں نے چوری کی مشق کی ہے۔ مگر رضیہ بیگم، آپ لڑنے جھگڑنے
کا قصہ کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھئے مجھے پوری بات
کہہ لینے دیجئے۔"

رضیہ معصوم بن کر بیٹھ گئی۔

"جی ابا جان"

"میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ آدمیوں کی صورت شکل
بول چال وغیرہ کی نقل ہم اس لئے کرتے ہیں کہ ان کی کیفیت
دکھا سکیں۔ یہ کیفیت کسی خاص وجہ سے، کسی خاص موقع
پر پیدا ہوتی ہے۔ کوئی لڑکا شرارت کرتا ہے اور مار کھاتا
ہے تو وہ روتا ہے۔ یہ رونا ایک کیفیت ہے۔"

رضیہ سے پھر نہ رہا گیا۔ اس نے چھت کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا:

"بعض لڑکے ایسے بے شرم ہوتے ہیں کہ مار
کھانے پر بھی نہیں روتے۔"

"یہ بھی ایک کیفیت ہے۔ اس کی نقل اتارنا البتہ
بہت مشکل ہے۔ خوشی بھی ایک کیفیت ہے۔ موٹا آدمی
تیز دوڑنا چاہے اور نہ دوڑ پائے، یہ بھی ایک کیفیت
ہے۔ رضیہ بھولی بن کر فساد کی باتیں کریں، یہ بھی"

"جی ابا۔۔۔۔۔"

"اب ذرا سب لوگ رضیہ کی صورت دیکھو۔ صاف
معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کوئی چوری کھول دی گئی ہے چہرے
سے حیرت ٹپکتی ہے، آنکھیں میری ملامت کرتی ہیں، کہتی
ہیں: "ابا جان بھلا آپ کے دل نے کیسے گوارا کیا کہ اپنی لڑکی
کی نسبت آپ ایسی بات کہیں" لیکن مجھے ان آنکھوں میں کوئی
اور بھی منہ چھپائے بیٹھا ہوا نظر آرہا ہے جسے ایسی باتوں
میں بڑا لطف آتا ہے۔ اصل میں وہی ہے رضیہ۔ ظاہر میں
جو کچھ دکھائی دے رہا ہے۔ وہ اسی اصل رضیہ کی بنائی ہوئی
جھوٹ موٹ کی کیفیت ہے۔ مگر رضیہ کو ایسی صورت بنانے
میں بڑا کمال ہے۔ جو انھیں جانتا نہ ہو وہ آسانی سے
دھوکا کھا سکتا ہے۔"

لڑکے سب ہنسنے لگے۔ رضیہ نے اپنا منہ ہاتھوں
میں چھپا لیا۔ ماجد صاحب نے کہا:-

"اچھا اب ایک قصہ سنو۔ ایک مرتبہ رضیہ کی اماں میں رضیہ اور اُن کے بھائی شاہد نمائش میں گئے تھے۔ رضیہ اس زمانے میں دو برس کی تھیں۔ نیا نیا چلنا سیکھا تھا، اس لئے چلنے کا بہت شوق تھا۔ ان کو شاید خیال تھا کہ چاہے جدھر چلی جائیں اُن کی اماں جان اور ابا جان وقت پر ہاتھ پکڑ لینے اور گود میں اُٹھا لینے کو ضرور پہنچ جائیں گے جب ہم لوگ گھر سے چلے تو یہ بہت خوش تھیں۔ شاہد کو بھی بازاروں اور میلوں کی سیر کرنے کا بہت شوق ہے۔ وہ بھی خوشی سے اُچھل رہے تھے۔ ہم لوگ نمائش میں پہنچے دیر تک چیزیں خریدتے اور گھومتے رہے۔ ایک دُکان پر رضیہ کی اماں اور میں سامان دیکھنے لگے اور رضیہ کا خیال نہیں رہا۔ ایک بار خیال آیا اور دیکھا تو رضیہ غائب! پہلے ہم سمجھے کہ آس پاس کہیں ہوں گی، شاہد نے دوڑ دوڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنا اور پکارنا شروع کیا۔ رضیہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اب ان کی اماں جان نے رونا شروع کیا۔ میں بھی کچھ پریشان ہو گیا۔ میں نے شاہد سے کہا کہ اماں جان کے پاس رہو اور خود نمائش کے دفتر میں گیا کہ وہاں کسی سے کہوں کہ میری لڑکی کھو گئی ہے جیسے ہی وہاں پہنچا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی رضیہ کو کندھے پر سوار کئے چلا آ رہا ہے۔ رضیہ مجھے دیکھ کر میری طرف لپکیں اور میں نے اُنھیں گود میں لے لیا۔ دفتر میں جو صاحب تھے اُنھوں نے سارا قصہ سُنا اور پھر مجھے رضیہ کو لے جانے کی اجازت دے دی۔"

رضیہ نے پوچھا:

"تو کیا وہ آپ کو روک بھی سکتے تھے؟"

"ہاں۔ کیوں نہیں۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ میں پرائی لڑکی کو چرا کر لے جانے نہیں آیا ہوں۔ ایسے لوگ بھی تو ہوتے ہیں جو لڑکیوں کو چرا لے جاتے ہیں۔"

"ہائے اللہ۔"

"خیر یہ تو ہو گیا۔ مگر مجھے اسی وقت خیال آیا کہ اس کا ایک بہت اچھا ڈراما بنایا جا سکتا ہے۔"

محمود نے کہا:

"مگر دو برس کی بچّی کیسے ڈراما کر سکتی ہے؟"

"ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔ اس لئے ہمیں قصّے کو ذرا بدلنا ہوگا۔ کچھ بڑھانا بھی ہوگا۔ مگر یہ تو تم سمجھ سکتے ہو کہ اس میں بہت سے ایسے موقع اور اُن کے ساتھ ایسی کیفیتیں دکھائی جا سکتی ہیں جن کا دل پر بہت اثر ہوتا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ تم لوگوں میں سے ہر ایک ڈراما کا ایک قصہ سوچے، اور پھر جو قصہ سب سے اچھا ہوگا اُسے ہم ڈراما کر کے دکھائیں گے۔ اس کا تم کو خیال رکھنا چاہئے کہ ڈراما کی جان موقع اور کیفیت ہے، اور تمھارے قصوں میں جتنے اچھے وہ موقعے اور کیفیتیں ہوں گی جن کی نقل کی جا سکتی ہے اتنا ہی اچھا ڈراما ہوگا۔ اچھا اب چلو۔ تمھارے لئے رضیہ کی اماں نے ناشتہ تیار کیا ہے۔ اس کے بعد پھر بیٹھ کر ڈراما کا قصہ تیار کریں گے۔





میکائیل فیراڈے

مرزا محمد حسن ایم ایس سی

سرہمفری ڈیوی علم کیمیا کا سب سے بڑا ماہر تھا جب وہ اپنی عمر کے آخری لمحے گذار رہا تھا تو اس سے اس کے کسی دوست نے پوچھا "آپ کی سب سے بڑی ایجاد کیا ہے" جواب میں اس نے مختلف ایجادوں کا ذکر کیا۔ اس سلسلے میں اس نے اپنی ایک بجلی کی ایجاد، کچھ کیمیاوی تجربوں کے نتیجے اور اپنی سب سے مشہور ایجاد سیفٹی لیمپ (safety lamp) کے نام لئے۔ آخر میں کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا "میری سب سے بڑی ایجاد فیراڈے ہے"۔ فیراڈے کی بابت جو خیال ڈیوی نے ظاہر کیا وہ حرف بہ حرف صحیح تھا۔

میکائیل فیراڈے نیونگٹن بٹس میں ۲۲ ستمبر ۱۷۹۱ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ جیمس فیراڈے ایک لوہار تھا یہ یارک شائر سے آکر لندن میں آباد ہوا تھا جیمس بہت غریب آدمی تھا۔ اور فیراڈے کا سارا بچپن غربت اور تکلیفوں میں گذرا۔

فیراڈے کی پیدائش کے پانچ برس بعد یہ خاندان چارلس اسٹریٹ مانچسٹر اسکوائر میں رہنے لگا۔ اور یہاں سے فیراڈے تعلیم کے لئے اسکول بھیجا جانے لگا۔ اس کی تعلیم بالکل معمولی ہوئی، وہ بس تھوڑا بہت لکھ پڑھ سکتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت گھر میں یا سڑکوں پر کھیلتے گذرتا تھا۔ اپنی شہرت اور ثروت کے زمانے میں جب وہ ان سڑکوں کی طرف سے گذرتا تو لوگوں کو بتاتا تھا کہ وہ یہاں بچپن میں سڑک پر پتھروں سے کھیلا کرتا تھا۔ لیکن نوجوان فیراڈے اس طرح زیادہ دن آزاد نہ رہ سکا۔

تیرہ برس کی عمر میں فیراڈے کو اسکول چھوڑنا پڑا اور وہ کھانے کمانے کی فکر میں پڑ گیا۔ اس نے ایک کتب فروش کے یہاں نوکری کرلی۔ اس کتب فروش کا نام ربو تھا۔ اس کا کام صرف یہ تھا کہ روزانہ اخبار لوگوں کے گھروں پر پہنچائے پروفیسر ٹنڈل جو بعد میں فیراڈے کا دوست اور جانشین ہوا۔ اس کے اس زمانے کو اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے "ایک چمکدار اور گھنگرالے بالوں والا لڑکا اپنی بغل میں اخبار دبائے بلند ہلائے ہوئے لندن کی سڑکوں پر تیزی سے گذرتا تھا"۔

فیراڈے نے اپنا کام اس خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ اکتوبر ۱۸۰۵ء میں ربو نے اسے جلد سازی اور اسٹیشنری کا کام سکھانا شروع کیا۔ اس نے صرف کام ہی نہیں سیکھا بلکہ اس سلسلے میں اُسے مختلف کتابوں کے پڑھنے کا موقع ملتا رہا۔ ربو بہت مہربان آدمی تھا۔ اس نے فیراڈے کو نیچرل فلاسفی کے لکچر سننے کی اجازت دے دی۔ فیراڈے نے

وہاں بہت سے دوست پیدا کر لئے، اور رسالوں اور کتابوں کی مدد سے علم حاصل کرنا شروع کر دیا۔ اُسے سائنس اور خاص طور پر علم کیمیا (chamistry) سے بے حد دلچسپی پیدا ہو گئی اس کے دل میں ایک دم یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ تجارت چھوڑ کر ایک سائنس داں کی زندگی بسر کرے اسی زمانے میں ایک اہم واقعہ پیش آیا جو اس کی زندگی میں ایک خاص تبدیلی کا باعث ہوا۔ اس واقعے کو خود فیراڈے یوں لکھتا ہے:

"میری ملازمت کے زمانے میں میری خوش قسمتی اور میرے مالک کے ایک گاہک اور رائل انسٹی ٹیوشن کے ممبر مسٹر ڈانس کی مہربانی اور عنایت سے مجھے سر ہمفری ڈیوی کی چار تقریریں سننے کا موقع ملا۔ میں نے ان تقریروں کے اہم حصوں کو مختصر نوٹ کر لیا اور بعد میں ان کی مدد سے پوری تقریریں لکھ ڈالیں باوجود علمی کم مائگی کے سائنس کی تحقیقات کے شوق نے مجھے اس بات پر مجبور کیا کہ رائل سوسائٹی کے صدر سر جوزف بینکس (SIR JOSEPH BANKS) کو اپنی خدمات پیش کروں لیکن جیسا کہ اُمید تھی مجھے اس کا جواب نفی میں ملا۔"

فیراڈے نے ڈیوی کی تقریروں کا خلاصہ خود سر ہمفری کے پاس بھیجا اور اس سے اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ وہ تجارت چھوڑ کر اپنی زندگی سائنس کی تحقیقات میں وقف کرنا چاہتا ہے۔ ڈیوی نے اس کا جواب بہت اُمید افزا دیا۔ ایک رات جب میکائیل فیراڈے سونے کی تیاری کر رہا تھا، کسی آدمی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہ سر ہمفری ڈیوی کا نوکر تھا اس نے فیراڈے کو ایک خط دیا۔ اس میں لکھا تھا کہ تم کل صبح رائل انسٹی ٹیوٹ میں آؤ۔ تمھیں ۲۵ شلنگ فی ہفتہ کے حساب سے لیبوریٹری کا اسسٹنٹ مقرر کیا گیا ہے۔ فیراڈے بہت جلد ڈیوی کا مددگار بن گیا اور دونوں نے مل کر کلورین پر تجربہ کرنا شروع کیا۔ اس دوران میں کئی دفعہ ڈیوی اور فیراڈے دونوں کلورین اور نائٹروجن کے مرکب کے جل اُٹھنے کی وجہ سے زخمی ہو گئے۔ یہ گیس بہت خطرناک ہوتی ہے۔

۱۸۱۳ء کے موسم خزاں میں سر ہمفری ڈیوی اور اس کی بیوی نے سیر و سیاحت کے لئے دوسرے ملکوں کا دورہ شروع کیا۔ فیراڈے بھی اُن کے ساتھ تھا۔ فیراڈے نے اتنے دنوں میں ڈیوی کے دل میں اس حد تک جگہ حاصل کر لی تھی کہ وہ بالکل بھائیوں کا سلوک کرتا تھا لیکن باوجود اس کے کہ وہ ڈیوی کا سکریٹری اور اسسٹنٹ تھا۔ اس کی بیوی اُسے ایک معمولی نوکر سے زیادہ نہیں سمجھتی تھی۔ ایک بار تو اُسے گھر سے نکالے دیتی تھی۔ جنیوا میں ڈیوی اپنے ایک دوست ڈی، لا، ریو کے یہاں مہمان ہوا۔ یہ بجلی کا سب سے بڑا ماہر سمجھا جاتا تھا اُسے یہ دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا کہ فیراڈے جو دراصل ڈیوی کا اسسٹنٹ ہے ایک نوکر کی حیثیت بھی نہیں رکھتا۔ ڈیوی لاریو نے کہا کہ فیراڈے کو سب کے ساتھ کھانا کھانا چاہئے۔ مگر لیڈی ڈیوی نے پر زور مخالفت کی۔ مہربان میزبان کچھ نہ کر سکا اور وہ اس پر راضی ہو گیا کہ فیراڈے کا کھانا اس کے کمرے پر بھیج دیا جائے۔ فیراڈے دو سال تک ڈیوی کے ساتھ گھومتا رہا اس نے ایک دلچسپ اور مختصر سفرنامہ فرانس، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کی سیر کا لکھا۔ اس زمانے میں جو محبت آمیز خط اس نے اپنی ماں کو لکھے وہ بہت دلچسپ ہیں۔

یہ سیاح ۱۸۱۵ء میں لندن واپس آگئے۔ اور فیراڈے پھر رائل انسٹی ٹیوٹ میں کام کرنے لگا۔ اب اس نے اپنی زندگی تحقیقات اور ایجادوں میں صرف کرنا شروع کردی، مئی ۱۸۱۵ء کے بعد سے اُس کی دماغی ترقی کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے میں اُس نے بہت سی کیمیاوی ایجادیں کیں اور قدرتی قوانین دریافت کئے۔ سب سے زیادہ مفید کام اُس نے یہ کیا کہ سائنس کو عام کرنے کی کوشش کی۔

فیراڈے نے اپنی تحقیقات کو پہلے تو انھی راستوں پر جاری رکھا جن کو ڈیوی نے کھول دیا تھا مگر بہت جلد ان تحقیقاتوں کے مفید اور اہم نتیجے نکلنے لگے۔ اُس نے خاص طور پر کلورین گیس کی جانچ کی۔ ایک روز اپنی لیبورٹری میں کام کر رہا تھا کہ ڈاکٹر پیرس اُس کے پاس آیا اور ایک ٹیوب کو غور سے دیکھنے لگا اس میں تیل کی قسم کا ایک رقیق مادہ تھا اس نے فیراڈے کا مذاق اُڑایا اور کہا "کیسے میلے ٹیوب استعمال کرتے ہو"۔ دوسرے روز ڈاکٹر پیرس کو رقعہ ملا۔

"جو تیل آپ نے کل دیکھا تھا وہ رقیق کلورین (Chlorine) نکلا"۔

"خیر خواہ میکائیل فیراڈے"۔

فیراڈے کلورین گیس رقیق حالت میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ گیس کے خود اپنے دباؤ سے اُس نے ایسا کیا۔ یہ ایک اہم تحقیق تھی جس کے اُصول پر دوسری گیسیں بھی رقیق حالت میں تبدیل کی جاسکتی ہیں۔ اسی زمانے میں اُس نے دو نئے کاربن اور کلورین کے مرکب معلوم کئے اور ۱۸۲۵ء میں بینزول دریافت کیا۔ ان اہم تحقیقاتوں کے علاوہ فیراڈے وہ پہلا شخص تھا جس نے لیبورٹری میں کام کرنے کے اچھے اور عمدہ طریقے نکالے، جن پر اب تک عمل کیا جا رہا ہے۔

۱۸۲۴ء میں فیراڈے رائل سوسائٹی کا فیلو منتخب کیا گیا اور دو برس بعد رائل انسٹی ٹیوٹ کی لیبورٹری کا ڈائرکٹر مقرر ہوگیا۔ ۱۸۳۳ء میں وہ عمر بھر کے لئے رائل انسٹی ٹیوٹ میں علم کیمیا کا پروفیسر مقرر ہوگیا۔ بغیر اس شرط کے کہ وہ لکچر دے۔

اسی دوران میں وہ بجلی کے متعلق تجربات کرتا رہا اور اس نے ایک ایسی ایجاد کی جس کی وجہ سے ہر گھر جو بجلی سے روشن ہے اس کی یاد تازہ کرتا ہے۔ ۱۸۳۱ء میں فیراڈے نے اپنی بہترین ایجاد رائل سوسائٹی کے سامنے پیش کی۔

تجربہ گاہ

شجاع احمد قائد



اعلانچی :- پیارے بچّو اب تم ایک ڈراما سُنو اس کا نام ہے "تجربہ گاہ" اس میں کام کرنے والے پانچ ہیں

(۱) رشید

(۲) سرور

(۳) ظفر

(۴) رضیہ

(۵) نصیبن

رشید اور ظفر دوست ہیں، رشید کم پڑھا لکھا ہے۔ سرور، ظفر کا چھوٹا بھائی اور رضیہ ظفر کی سب سے چھوٹی بہن ہے۔

(آنے کی آواز)

رشید :- ارے غائب، واہ واہ واہ ----
ارے نصیبن ذرا اِدھر آؤ، اِدھر

نصیبن :- جی

رشید :- ظفر کہاں ہیں۔

نصیبن :- ابھی ابھی تو یہیں تھے میاں۔

رشید :- پھر کہاں گئے۔

ماما :- مجھے نہیں معلوم میاں

(مُنہ سے سیٹی بجانے کی آواز)

رشید :- ہائیں یہ تو ظفر سیٹی بجا رہے ہیں (بلند آواز سے) ظفر او ظفر۔

ظفر :- (دُور سے) کیا ہے۔

رشید :- لو ہم تو تمھارے پاس آئے اور تم چلے دُوسروں کے پاس

ظفر :- بھائی ذرا ضروری کام ہے۔

رشید :- ارے بھائی تم اور تمھارے کام دونوں ضروری ہیں لیکن کیا ہم سے کہنے کا بھی نہیں ہے۔

ظفر :- ہاں یار وہ جگہ بتانے کی نہیں ہے۔

رشید :- تو کیا چوری کرنے جا رہے ہو یا ڈاکا ڈالنے۔

ظفر :- (ہنستے ہوئے) نہیں بھائی!

رشید :- دُنیا میں یہی دو چار کام ایسے ہیں جو بتائے نہیں جاتے۔

ظفر :- (ہنستے ہوئے) نہیں یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ

رضیہ :- اچھا اچھا ہم سب سُن رہے تھے ...... ہوں ظفر بھائی ..... آپ چھپا چھپ کے روز اس جگہ جاتے ہیں ..... ہم ابھی جا کے امّاں جان سے سب باتیں کہہ دیں گے۔ امّاں جان

کہتی ہیں ہم سے چھپا کے کوئی کام نہ کرنا پھر آپ کیوں کرتے ہیں۔

ظفر:۔ ارے تو کدھر دبکی بیٹھی تھی .... بلّی کہیں کی۔

رضیہ:۔ (روتے ہوئے) آں آں آں .... ہم کو بلّی کہا .... آں آں آں۔

رشید:۔ ارے تم نے رونا شروع کر دیا .... تم تو بڑی رونی ہو۔

رضیہ:۔ تو پھر انھوں نے ہم کو بلّی کیوں کہا۔

ظفر:۔ اس لئے کہ تم بلّی کی طرح چلتی ہو، بے پاؤں اور بلّی کی طرح دبک کے بیٹھ جاتی ہو۔ کسی کو ذرا سی آہٹ تک نہیں ہوتی۔

رضیہ:۔ (روتے ہوئے) آں آں آں، ہم کو بلّی کہا

رشید:۔ جانے دو رضیہ .... لو تم اِن کو کہہ دو .... بس۔

رضیہ:۔ (منہ بنا کر) بلّا .... اب ہم جاتے ہیں۔ جا کے امّاں جان سے ظفر بھائی کی شکایت کر دیں گے۔

(بھاگتے ہوئے آنے کی آواز)

سرور:۔ (ہانپتے ہوئے) رضیہ رضیہ۔

رضیہ:۔ کیا۔

سرور:۔ تم نے ریکارڈ توڑ دیا تھا نا .... ابّا جان آ گئے ہیں۔ اب تمھاری خیر نہیں۔

رضیہ:۔ ہونہہ .... ابّا جان سے ہم کہہ دیں گے ہم نے نہیں توڑا۔ اور یہ کہہ کے پھر ظفر بھائی کی شکایت بھی کر دیں گے کہ وہ روز چھپ چھپ کے کہیں جاتے ہیں۔ بس وہ ریکارڈ والی بات بھول جائیں گے

سرور:۔ ظفر بھائی کہاں جاتے ہیں آپ روز چھپ چھپ کے

ظفر:۔ ارے بھئی تم سب کے سب کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو .... اگر میں بتاؤں گا بھی، تو تم سمجھو گے کیا، خاک۔

رشید:۔ خاک پتھر کچھ بھی سمجھ لیں گے .... تم بتا دو نا

ظفر:۔ اچھا تو سنو، وہ ایسی جگہ ہے، جہاں بہت سی چیزیں ایسی آتی ہیں جن کو شاید تم نے آج تک نہیں دیکھا اور اگر دیکھا بھی ہے تو اچھی طرح پہچانتے نہیں۔

سرور:۔ ایسی کون سی چیزیں ہیں ظفر بھائی۔

رضیہ:۔ ٹھہرو ٹھہرو ہم بتاتے ہیں۔

سرور:۔ (جھنجھلا کر) تمھیں کیا معلوم۔ بڑی آئیں۔ وہاں سے۔ (منہ بنا کر) ہم بتاتے ہیں۔

رضیہ: اچھا تو نہ سنو، ہم رونا شروع کر دیں گے آں آں آں۔

سرور:۔ اچھا ٹھہرو .... ہم سب یہاں سے چلے جاتے ہیں۔ شیخ سدّو اگر تم کو لے جائیں گے۔

رضیہ:۔ بس بس، یہی وہ ہیں جن کو ہم نے آج تک نہیں دیکھا .... بس یہی ظفر بھائی کے پاس آتے ہوں گے۔

(سب ہنستے ہیں)

سرور:۔ نہیں۔ ٹھہرو۔ ہم بتاتے ہیں۔

رشید:۔ بتاؤ بتاؤ۔ مگر ایسی بتانا کہ ہماری ج

پیٹ میں رہ گئی ہے وہ بھی نکل جائے۔

(ہنسی)

سرور (روٹھی ہوئی آواز میں) تو پھر ہم نہیں بتاتے، آپ ہم کو بناتے ہیں۔

رشید:۔ اچھا جانے دو بھئی۔

سرور:۔ اللہ میاں ہوں گے .... ہم روز امّاں جان سے کہتے ہیں، اللہ میاں کو دکھلئے اللہ میاں کو دکھلئے .... وہ کہتی ہیں بڑے ہونے کے بعد دیکھ لینا ...... ظفر بھائی بڑے ہو گئے ہیں۔ اِس لئے ان کو دکھائی دیتے ہوں گے

(ہنسی)

ظفر:۔ (ہنستے ہوئے) نہیں میاں یہ کچھ نہیں ہے۔

رشید:۔ اچھا ظفر تم اور نہ بتاؤ .... بس اتنا بتادو کہ وہ چیزیں کھاتے پیتے ہیں یا دیکھتے ہیں۔

ظفر:۔ (ہنستے ہوئے) دیکھنے میں بھی ہیں اور کھانے پینے میں بھی .... لیکن بعض ایسی ہیں جو ان میں کسی میں بھی نہیں ہیں۔

رشید:۔ واہ خوب پہیلی بجھائی اُستاد۔

سرور:۔ ذرا سا اور بتا دیجئے ظفر بھائی۔

ظفر:۔ (ہنستے ہوئے) آخر اور کیا بتاؤں، اپنا سر اچھا تم نے پانی تو دیکھا ہوگا۔

سرور:۔ (ہنستے ہوئے) واہ پانی ...... یہ تو ہم روز دیکھتے ہیں۔

رضیہ:۔ آج تو ہم اتنا پانی پی گئے ...... ہمارا پیٹ مشک ہو گیا۔

(ہنسی)

ظفر:۔ اچھا کبھی تم کو پانی نے اپنی طبیعت بھی بتائی۔

سرور:۔ واہ کیا وہ بھی کوئی آدمی ہے۔

ظفر:۔ (ہنستے ہوئے) اچھا ہوا تم نے دیکھی ہے؟

رشید:۔ (ہنستے ہوئے) دیکھی تو نہیں ہے۔ مگر پڑھی ضرور ہے۔ فٹ بال، بائیسکل اور موٹر کے ٹائر میں خوب ٹھونس ٹھونس کے اس کو بھرا ہے۔

ظفر:۔ اچھا کبھی اُس نے اپنا مزاج تمھیں بتایا۔

رشید:۔ بھلا ہواؤں کا بھی مزاج ہوتا ہے .... کہیں تم گھاس واس تو نہیں کھا گئے ہو۔

ظفر:۔ اچھا جانے دو .... ہاں اتنا سمجھ لو کہ ہم جہاں جا رہے ہیں، وہاں ہوا، پانی اور ہر چیز اپنا اپنا نام پتہ اور مزاج سب بتاتی ہیں۔

سرور:۔ اچھا کیا آپ ہی وہاں جاتے ہیں یا اور لوگ بھی۔

ظفر:۔ بہت سے جاتے ہیں ...... اور وہاں کا آنا جانا آج کا تھوڑی ہے۔ برسیں ہو گئیں بہت سے وہاں گئے اور بڑے بڑے کام کئے۔

رشید:۔ اچھا وہاں لوگ جاکر کرتے کیا ہیں۔

ظفر:۔ کرتے کیا ہیں، جیسے تم یہاں آدمیوں سے ملاقات کرتے اور ملتے جلتے ہو ویسے ہی وہاں سب پانی اور ہوا وغیرہ سے ملاقات کرتے ہیں، اُن کا مزاج پوچھتے ہیں اور پھر جوڑ توڑ کرکے اچھی اچھی چیزیں ایجاد کرتے ہیں۔ بجلی کی روشنی، ریڈیو، سنیما، گراموفون

یہ سب اسی جگہ جانے والوں نے بنائے ہیں۔

رشید :۔ تو پھر ہم بھی وہاں جائیں گے ۔

ظفر :۔ جانے کا کیا ہے ۔ بچہ بھی وہاں جا سکتا ہے لیکن جس کام کے لئے تم جانا چاہتے ہو وہ ابھی پورا نہ ہوگا ، ابھی تم کچھ اور پڑھ لو۔

رشید :۔ اچھا جانے دو .... ہاں اب تو وہاں کا نام بتا دو۔

ظفر :۔ سائنس کی تجربہ گاہ .... لو اب جانے دو۔ دس بج گئے۔

رشید :۔ خدا حافظ ۔

ظفر :۔ خدا حافظ ...... خدا حافظ رضیہ ۔ خدا حافظ سرور ۔

سرور اور رضیہ :۔ خدا حافظ ظفر بھائی خدا حافظ ... مگر کل ہم کو بھی ساتھ لے چلئے گا ۔

ظفر :۔ اچھا ....

محنت

شفیع الدین نیر

اے نونہال بچو! محنت سے کام کرنا　　محنت کے بل پہ ساری دُنیا کو رام کرنا

محنت سے مل رہے ہیں ہر قوم کو خزانے　　محنت سے چل رہے ہیں دُنیا کے کارخانے

علم و ہُنر کا دریا ہو جس کو پار کرنا　　اُس کو نہیں مناسب محنت سے عار کرنا

محنت کی رَوشنی سے پُر نور یہ جہاں ہے　　محنت کی زندگی میں پھل عیش کا نہاں ہے

سب دستکاریوں میں ڈالی ہے جان اُس نے　　مزدور کو دکھا دی دَولت کی کان اُس نے

سَوداگری کو اُس نے اتنا فروغ بخشا　　ہر سمت اُڑ رہا ہے سوداگری کا جھنڈا

محنت کرے جو دل سے دَولت اُسے ملے گی　　راحت اُسے ملے گی عزت اُسے ملے گی

یہ بند اور یہ نہریں یہ پُل یہ شاہ راہیں　　مینار رَوشنی کے یہ طُرفہ سیر گاہیں

یہ ریل اور یہ موٹر یہ کشتیاں ہوائی　　بحری جہاز، انجن، اور یہ کلیں نرالی

ہیں یہ تمام چیزیں پیدا اُسی کے دم سے　　سارے جہاں کی رَونق ہے اُس کے دم قدم سے

غربت کا یہ سہارا مفلس کا یہ عصا ہے　　ہے سچ تو یہ جہاں میں محنت ہی کیمیا ہے

جو قوم چاہتی ہے دنیا میں نام کرنا
نیر وہ جانتی ہے محنت سے کام کرنا



موجدوں کی کہانی

سید نور الحسن ہاشمی ایم اے

کسی کام کی دھن لگ جانا بھی بڑی بات ہے محنت صبر و استقلال اور غور و فکر سے کسی کام کو کیے جاؤ تو نتیجہ کچھ نہ کچھ اچھا ہی نکلتا ہے۔ دنیا میں جتنی ایجادیں ہوئی ہیں سب بڑے غور و فکر اور مسلسل محنت کا نتیجہ ہیں۔ اکثر تو ایسا ہوا ہے کہ ایک شخص کسی چیز کی ایجاد یا تحقیق کے سلسلے میں ساری عمر کام کرتا رہا اور اسے پورا نہ کر پایا بعد کے آنے والوں نے اس کام کو مکمل کیا۔

آج میں تمھیں چند ایسے بڑے بڑے موجدوں کا حال بتاؤں گا جنھوں نے صبر و استقلال غور و فکر اور ہمت و کوشش سے کام کیا اور ایسی ایسی مفید ایجادیں کر گئے جن سے آج ساری دنیا فائدہ اٹھا رہی ہے۔ تمھیں ان ایجادوں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ زیادہ نہیں اگر سو ڈیڑھ سو برس پہلے کا کوئی آدمی زندہ ہو جائے تو ان سب چیزوں کو دیکھ کر دیوانہ ہو جائے۔ اس زمانے میں نہ تو ریلیں تھیں نہ ہوائی جہاز نہ بجلی نہ تار نہ وائرلیس نہ ریڈیو نہ موٹر ایسا نہیں تھا کہ دلی سے بمبئی جانے کا خیال آیا اور جھٹ سے تانگے پہ اسٹیشن پہنچے ٹکٹ لیا ریل میں بیٹھے اور ۲۴ گھنٹے میں بمبئی پہنچ گئے۔ سوار ہونے سے پہلے بمبئی کے عزیزوں اور دوستوں کو تار دے دیا کہ ہم فلاں گاڑی سے آ رہے ہیں۔ اب سے سو برس پہلے یہ سہولتیں کہاں تھیں پہلے تو اتنے دور کے سفر کی کوئی ہمت بھی نہ کر سکتا تھا۔ بہت جان جوکھم کا کام تھا۔ اگر کوئی ہمت کا دھنی تیار بھی ہوا تو مہینے لگ جاتے تھے اور راستے کے خطروں کا تو کچھ شمار ہی نہیں۔ اب یہ بات کہاں ہے۔ ان ایجادوں نے زمین کی طنابیں کھینچ دی ہیں اس کے علاوہ اور بہت سے کاموں میں لاکھوں گنا زیادہ سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ ایک مشین چلانے والے انجن ہی کی ایجاد کو لے لو۔ پہلے ایک کام کو سینکڑوں لوگ مل کر کرتے تھے تب ہو پاتا تھا۔ اب اس انجن کی بدولت بہت جلد بغیر کسی کی مدد کے پورا ہو جاتا ہے۔ اس انجن کی ایجاد میں بہت سے لوگوں کی کوششیں شامل ہیں مثلاً سیوری (یہ کارنوال (انگلستان) کی کان کا ایک مزدور تھا)۔ نیوکامن (یہ ڈارتماؤتھ کا لوہار تھا) پاٹر (ایک مشین چلانے والا لڑکا تھا) اسمیٹن (یہ ایک انجینیر تھا) اور سب سے بڑھ کر محنتی مستقل مزاج اور کبھی نہ تھکنے والا جیمس واٹ جو ایک ریاضی داں تھا اور جامیٹری کے آلات بنایا کرتا تھا غرض یہ مشین چلانے والا انجن ان سب کی محنت کوشش کا نتیجہ ہے۔

اِس سلسلے میں سب سے نمایاں آدمی ٹامس نیوکامین تھا۔ ۱۷۲۹ء میں انتقال کیا اس سے پہلے لوگ نامعلوم مدت سے اپنے ہاتھوں کی یا پھر گھوڑوں بیلوں خچروں اور اونٹوں کی مدد سے اپنا کام کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ لوگوں میں یہ خیال ہوا کہ یہی کام مشینوں سے بھی لیا جا سکتا ہے اور لوگوں کا کام کو ہلکا کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے گہرے کنوؤں سے پانی نکالنے کی مشین ایجاد کی گئی۔ اس کے بعد اس بھاپ کے انجن میں بہت سی ترمیمیں ہوتی رہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ کام نیوکامین نے کیا۔ یہ ڈیوین شائر (انگلستان) کا رہنے والا تھا۔ قوم کا لوہار تھا اور لوہے کے کاموں میں اُسے خاص طور سے دلچسپی تھی۔ اس زمانے تک جتنے انجن بنے تھے نیوکامین نے انھیں بہت غور سے دیکھا۔ یہ سب پُرانی قسم کے انجن تھے اور ان سے پرانی قسم کی مشینیں چلائی جاتی تھیں۔ نیوکامین کو اس انجن میں بہت سی خرابیاں نظر آئیں۔ اس نے ایک نئے قسم کا انجن بنانے کا ارادہ کیا اور کارنوال (انگلستان) کی ایک کان کے منیجر اور ایک شیشہ پھونکنے والے کی مدد سے ایک انجن بنانے میں کامیاب بھی ہو گیا۔ اس انجن کا نام اُس نے آگ انجن رکھا۔ کانوں میں گہری کھدائی پر اکثر پانی بھر آتا ہے اس انجن سے اس پانی کو نکالنے کا کام لیا جانے لگا۔ تھوڑے دنوں بعد اس نکلے ہوئے پانی سے دوسری مشینیں چلائی جانے لگیں۔ نیوکامین کا انجن کوئی ۵۰ سال تک اس کام کو انجام دیتا رہا۔ آخر جیمس واٹ میدان میں آیا اس نے اس انجن میں کچھ خرابیاں نکالیں، بس جب سے اس آگ انجن کا استعمال چھوڑ دیا گیا۔

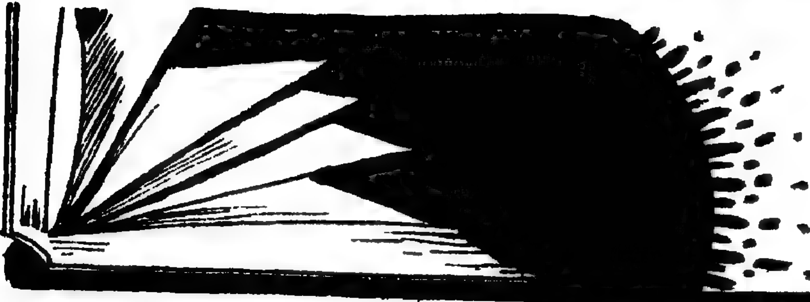
جیمس واٹ کے بنائے ہوئے انجن کو ہم نئے قسم کا انجن کہہ سکتے ہیں۔ واٹ گرینک کا رہنے والا تھا اور بہت غریب ماں باپ کا لڑکا تھا۔ اس کا باپ بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ واٹ بچپن میں بہت دُبلا پتلا اور کمزور تھا اس لئے جو کچھ پڑھا لکھا وہ گھر ہی پر۔ مدرسے جانے کی نوبت نہ آئی۔ اسے بچپن ہی سے اوزاروں سے کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ مختلف اوزاروں کو بنا کر اس طرح رکھتا کہ کوئی نہ کوئی کھلونا بن جاتا۔ باپ تو بڑھئی تھا ہی۔ اس قسم کے اوزار اس کے ہاں بہت سے رہتے تھے۔ اس میں ایک خاص عادت تھی جس کام میں ہاتھ لگاتا دل و جان سے کرتا۔ جب کچھ بڑا ہوا تو انھی جامیٹری کے اوزاروں کی مدد سے ستاروں کے متعلق اس نے اپنی معلومات خوب بڑھالیں ایک دفعہ بہت دنوں تک بیمار رہا اس زمانے میں طب کے متعلق اُس نے بہت سی معلومات حاصل کر لیں۔ ایک زمانے میں وہ گاؤں میں اکیلا ٹہلنے جاتا۔ اس وقت اُسے نباتات کا علم حاصل کرنے کا شوق ہوا۔ اُس نے نباتات ہی کا علم نہیں بلکہ تاریخ اور پرانے پتھروں کا علم بھی سیکھ لیا، غرض وہ دُھن کا پکا تھا اور جس بات کے پیچھے پڑ جاتا اُسے پُورا کر کے چھوڑتا اور اس کے بارے میں ایک ایک بات معلوم کرنا اُس کی زندگی کا مشغلہ بن جاتا۔ اُسے گانے کا فن نہ آتا تھا لیکن ایک مرتبہ ایک ارگن باجہ مرمت کے لئے اُس کے پاس آیا بس اس باجے کی مرمت کی خاطر اس نے موسیقی کے بہت سے گُر سیکھ لیے۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کی شہرت دُور دُور پھیل گئی۔ اور وہ گلاسکو کالج میں جامیٹری اور مساحت کے اوزار بنانے پر ملازم ہو گیا۔ واٹ مزاج

کا بہت نیک تھا۔ جو کوئی اس سے کسی کام کو کہتا وہ انکار نہ کرتا۔ اسی لیے طالب علم اور پروفیسر سبھی اس کے دوست ہوگئے۔ ہر شخص اس کی ہنرمندی اور مہارت کا قائل تھا ایک دفعہ ایک پروفیسر نے اس سے کہا میرے پاس نیوکامین والا آگ انجن ہے مگر اب کام نہیں دیتا تم ذرا اسے ٹھیک کردو۔ واٹ کو انجنوں کے بارے میں اب تک کچھ بھی معلوم نہ تھا لیکن ایک طرف تو اس نے پروفیسر سے انجن کی مرمت کا وعدہ کرلیا اور دوسری طرف اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں لگ گیا۔ آخر اس پر محنت کرنا شروع کی اور اسے چند ہی دنوں میں ٹھیک کر دیا۔ مرمت کے وقت اس انجن میں بہت سی خرابیاں نظر آئیں اس نے دس سال کی محنت میں اپنا انجن تیار کیا، یہ نیوکامین کے انجن سے کئی گنا کام کرسکتا تھا۔ پھر یہ کوئلہ بھی پرانے انجن کے مقابلے میں بہت کم خرچ کرتا تھا۔ ان دس سالوں میں غریبی نے اُسے بہت ستایا مگر وہ اپنے کھانے پینے کا خرچ جامیٹری کے اوزار، باجے اور دوسری چیزیں بنا بناکر نکالتا رہا۔ انجن تیار (۱۷۹۳ء) ہونے کے بعد بھی اس کے پاس اتنا خرچ نہیں تھا کہ وہ بہت سے انجن بناکر انھیں بازار میں بیچے۔ خوش قسمتی سے اسے برمنگھم کا ایک دولت مند مل گیا اس نے واٹ کے انجن بنانے کا کارخانہ کھول دیا۔

یہ انجن ایسا کامیاب ثابت ہوا کہ اس سے جہاز چلانے، اناج پیسنے، کتابیں چھاپنے، سکّے بنانے ہتھوڑا چلانے، لوہا پگھلانے، غرض ہر قسم کی مشین چلانے کا کام لیا جانے لگا۔ بعد میں اس انجن میں بھی ترمیمیں ہوئیں سب سے بہتر ترمیم کارنوال (انگلستان) کے ایک مزدور ٹریویتھک نے کی اس ترمیم کو بعد میں جارج اسٹیفنسن نے مکمل کیا۔

جارج اسٹیفنسن کا حال تو تمھیں شاید معلوم ہو۔ ریل کا انجن اسی کی ایجاد تھی۔ یہ کوئلے کی ایک کان میں پانی نکالنے والے انجن پر ملازم تھا۔ یہاں اُسے ہفتے میں بارہ شلنگ ملتے تھے غریبی کی وجہ سے اُسے کسی مدرسے میں پڑھنے لکھنے کا موقع نہ ملا تھا۔ بچپن میں مزدوری پر کسانوں کا کام کرتا تھا۔ کچھ بڑا ہوا تو کوئلے کی ایک کان میں ایک انجن کی بھٹی چلانے کی نوکری مل گئی۔ لکھنے پڑھنے کا شوق اُسے بہت تھا۔ شام کو چھٹی ملتی تو لکھنا پڑھنا سیکھتا۔ تھوڑے دنوں بعد ایک پانی نکالنے والا انجن اس کے سپرد کردیا گیا وہ اپنا کام بہت محنت اور شوق سے کرتا اور انجن کے کل پرزوں کو بہت غور سے دیکھتا۔ اسی زمانے میں ایک بھاپ والا انجن بگڑ گیا۔ کئی انجینیروں نے اس کی مرمت کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ آخر جارڈی (اسٹیفنسن کا پیار کا نام) نے یہ کام اپنے ذمے لیا اور چند ہی دنوں میں وہ انجن باقاعدہ کام کرنے لگا۔ سب لوگوں کو حیرت ہوئی۔ اس کامیابی کی وجہ سے وہ کافی مشہور ہوگیا۔ اس عرصے میں اس نے سوچا کہ کیوں نہ ایک انجن بنایا جائے جو زمین پر چل سکے اور سامان گھسیٹ سکے چنانچہ ۱۸۱۴ء میں اُس نے ایک انجن بنایا یہ کوئلے سے بھری ہوئی آٹھ گاڑیاں کان سے گھسیٹ کر سمندر تک لے جاسکتا تھا اس کا نام اُس نے مائی لارڈ رکھا۔ یہ ایک گھنٹے میں چار میل جاتا تھا۔ اس چار میل والے انجن کا آج کل کے انجنوں سے مقابلہ کرو جو سو میل فی گھنٹہ تک کی رفتار سے ریل گاڑی کے بے شمار ڈبّوں کو لے کر بھاگتے ہیں۔ مگر یہ سب انجن اسی چار میل فی گھنٹہ چلنے والے انجن کی اولاد۔

(باقی آئندہ)



لچک

مشتاق احمد بی اے - علیگ

ارے بھئی نیاز میاں تم بھی بالکل بچہ بن گئے بھلا اس گیند سے کھیل رہے ہو، یہ تو ہم تمھارے چھوٹے بھائی کے لئے لائے ہیں۔ کہیں کھو گئی تو وہ روئے گا تم تو ماشاء اللہ اب ساتویں درجے میں پڑھتے ہو، کوئی اور کھیل کھیلو۔ اب میں نام کیا بتاؤں تمھارے مدرسے میں گیند بلا، ہاکی وغیرہ کا انتظام ضرور ہوگا، ان کھیلوں کو جی نہیں چاہتا تو مدرسے کے دو چار ساتھیوں کو بلا لاؤ اور کبڈی یا ڈھائی بچونا کھیلو۔ کیا کہا؟ گیند اتنا اچھلتی کیوں ہے، واہ بھئی تمھیں اتنا بھی نہیں معلوم! اس لئے اچھلتی ہے کہ ربر کی بنی ہوتی ہے۔ ربر میں لچک ہوتی ہے۔ اچھا ایک بات بتاؤ۔ ربر کے علاوہ کسی اور چیز میں بھی لچک ہوتی ہے؟ کیا خوب! ارے بھائی صرف ربر ہی میں نہیں دوسری اور بہت سی چیزوں میں لچک ہوتی ہے۔ یہ چیزیں شاید تمھارے وہم و گمان میں بھی نہ آئیں۔ مجھ سے سنو شیشے، لوہے اور ہاتھی دانت وغیرہ میں سکڑنے اور بڑھنے کی صلاحیت ربر سے کہیں زیادہ ہوتی ہے ہا ہا ہا آپ کو یقین نہیں آیا۔ اچھا آپ پہلے تو یہ بتائیے کہ لچک کا مطلب کیا ہے؟ ارے جناب لچک کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم کسی چیز کو موڑ دیں، بڑھا دیں یا اس کی صورت بگاڑ دیں تو پھر وہ جوں کی توں اپنی حالت پر آ جائے۔ تم ایک ربر کے ٹکڑے کو دوہرا کر دو یا اتنا کھینچو کہ وہ اپنی اصلی لمبائی کا دگنا ہو جائے۔ پھر چھوڑ دو بس ایک سکنڈ میں جوں کا توں اپنی اصلی حالت پر آ جائے گا۔ اسی طرح ایک ربر کے ٹکڑے کو خوب زور سے دباؤ گے تو وہ دب کر چپٹا ہو جائے گا لیکن جیسے ہی ہاتھ ہٹاؤ گے وہ اپنی اصلی حالت پر آ جائے گا۔

ربر کی مثال سے کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ بس یہی سب سے زیادہ سکڑنے اور بڑھنے والی چیز ہے۔ شیشے اور ہاتھی دانت میں ربر سے کہیں زیادہ یہ صلاحیت موجود ہے اور لوہا تو سب سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اچھا دیکھو میز پر وہ سرخ جلد والی کتاب رکھی ہے، ہاں ہاں یہی بس لے اٹھا لاؤ۔ ہم تمھیں کچھ تصویریں دکھائیں گے ان سے تمھیں یہ اندازہ ہوگا کہ کن چیزوں میں بڑھنے اور سکڑنے کی کتنی صلاحیت ہے، اور کچھ ان تصویروں ہی پر نہیں تم خود تجربہ کرکے دیکھ سکتے ہو۔ ایک لوہے کی گولی کو سخت زمین پر پھینک کر دیکھو ربر کی گیند سے کہیں زیادہ اوپر اچھلے گی۔

ہاں یہ بات بھی تم نے اچھی پوچھی سب لچک دار

چیزوں کا حال ایک سا نہیں۔ بعض میں یہ صلاحیت زیادہ ہوتی ہے بعض میں کم۔ مثلاً بید کو تم اچھی طرح موڑ سکتے ہو اتنا کہ بالکل گول ہو جائے اور جہاں تم نے اسے چھوڑا وہ پھر سیدھا ہو جائے گا۔ اس کے مقابلے میں لکڑی کی پٹی یا ڈنڈے میں بھی کچھ نہ کچھ لچک موجود ہے مگر اسے زیادہ موڑنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ چٹ کی آواز ہوگی اور اس کا ایک ٹکڑا تمھارے اس ہاتھ میں ہوگا اور ایک ٹکڑا دوسرے ہاتھ میں۔ اب ہم تمھیں ایک مزے کی بات بتائیں لکڑی کے ٹوٹنے کو کوئی سائنس داں ٹوٹنا نہیں کہے گا، بلکہ یوں کہے گا کہ لکڑی میں لچکنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے۔ ان سائنس دانوں کی باتیں بھی عجیب ہوتی ہیں مگر ایک بات ہے، جی کو لگتی ہیں۔

ہاں ایک بات اور سن لو، لوہے یا ہاتھی دانت کی طرح سبھی ٹھوس چیزوں میں اس صلاحیت کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ مثلاً گندھے ہوئے آٹے کو تم کافی لمبا کر سکتے ہو۔ مگر وہ چھوڑنے کے بعد ویسا کا ویسا ہی رہے گا۔ اپنی اصلی حالت پر نہیں آئے گا، یہی حال مٹی کا ہے۔ اس میں بڑھنے اور سکڑنے کی صلاحیت بالکل نہیں ہے۔

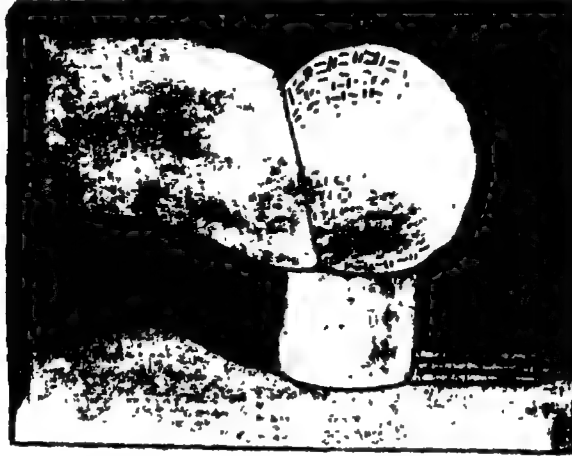
پھر یہ کہ لچک دار چیزوں میں بھی لچکنے کی ایک حد ہوتی ہے۔ یا لچک کا ایک درجہ ہوتا ہے۔ اگر اس حد یا درجے سے زیادہ لچکانے کی کوشش کی گئی تو لچکنے کی صلاحیت بالکل ختم ہو جائے گی۔ دیکھو اس بید کو ہم اس جگہ سے موڑتے ہیں یہ دیکھو ہم نے اسے بالکل دُہرا کر دیا ہے۔ ارے! یہ تو اپنی اصلی حالت پر واپس نہیں گیا، یعنی سیدھا نہیں ہوا۔ کیا خرابی ہو گئی؟ شاباش اس میں لچکنے کی جتنی صلاحیت تھی اس سے زیادہ موڑ دیا گیا۔ اس کے مقابلے میں لوہے کی تلوار کو موڑ کر گول کر دیا جائے تو ہاتھ سے چھٹتے ہی فوراً سیدھی ہو جائے گی۔ اچھی تلواروں کی پہچان بھی یہی ہے، ہاں بھئی آج کل تلواریں اور دوسرے ہتھیار گھروں میں کہاں؟ اب تو یہ عجائب خانوں میں نظر آتے ہیں۔

غرض لچک دار چیز کو اس کی صلاحیت سے زیادہ موڑا یا بڑھایا جائے تو اس کی یہ خوبی ختم ہو جاتی ہے۔ موٹر کار میں پہیوں کے اوپر اسپرنگ لگی ہوتی ہے۔ موٹر میں بیٹھ کر تمھیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اچھل رہے ہو یہ اسی اسپرنگ کی وجہ سے۔ اب اگر موٹر پر حد سے زیادہ بوجھ لاد دیا جائے تو اسپرنگ کی لچک ختم ہو جائے گی۔ اور یہ معمولی لوہے کی طرح ہو جائے گی۔ اسی طرح کسی اسپرنگ والی آرام کرسی پر تم بہت سی وزنی کتابیں رکھ دو اور کئی دن تک انھیں یوں ہی پڑا رہنے دو تو اس کی اسپرنگ کی لچک بھی غائب ہو جائے گی۔ اور اس کا حال بھی موٹر کی اسپرنگ کا سا ہو جائے گا۔

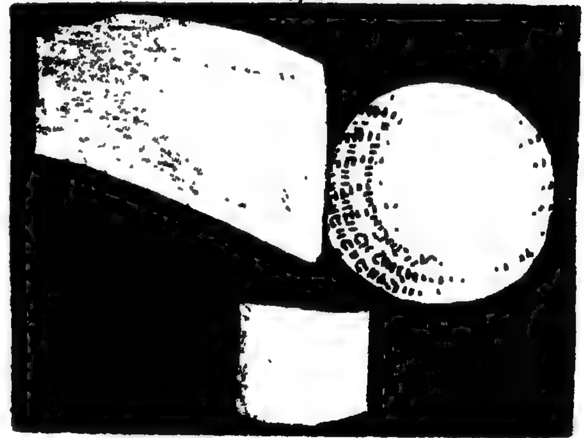
کسی چیز کے دبانے یا موڑنے کو سائنس کی اصطلاح میں "زور ڈالنا" کہیں گے۔ تم نے بید اور ربر کو موڑنے یا لمبا کرتے وقت ایک بات پر غور نہیں کیا یہ دونوں چیزیں برابر اس کوشش میں رہیں کہ تمھارے زور کو ہٹا کر سیدھی ہو جائیں یا سکڑ کر اپنی اصلی حالت پر آ جائیں تو لچک کیا ہوئی تمھارے زور کی مخالفت یا ردّ عمل۔ ردّ عمل کے معنی بھی جانتے ہو یا یوں ہی گردن ہلا دی۔ ردّ کے معنی

واپس کرنا، لوٹانا، عمل معنی کام یعنی تم جو زور ڈالنے کا عمل
یا کام کرتے ہو اسے لوٹانا بھولنا مت!
اچھا آؤ اب تصویریں دکھائیں دیکھو اس تصویر

(۱)



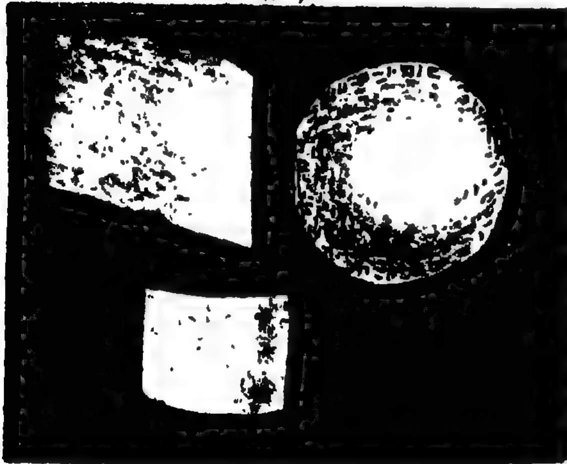
(۲)



میں ایک گاف کی گیند کی لچک دکھائی گئی ہے۔ تصویر
ایک خاص کیمرے سے لی گئی ہے اس کیمرے میں بہت
زیادہ بجلی کی قوت تھی۔ اتنی تیزی سے تصویر لی گئی ہے
کہ گیند پہلی اور تیسری تصویر کے درمیان صرف آدھا انچ

طے کر سکی تھی۔ پہلی تصویر سے گیند کی لچک ظاہر ہوتی ہے
دیکھو اسٹک کی ضرب سے گیند دب کر کیسی چپٹی ہو گئی
ہے۔ دوسری تصویر میں دبا ہوا حصّہ اُبھر رہا ہے۔

(۳)



تیسری تصویر میں گیند اپنی اصلی حالت پر واپس آگئی ہے۔
تم گھبرا تو نہیں گئے۔ آؤ کچھ تجربے بھی کرتے چلیں
ربر کا ٹکڑا اور بید کی چھڑی تو موجود ہے۔ لکڑی کی پٹی
ہاتھی دانت کا ایک ٹکڑا، لوہے کی سلاخ اور تانبے پیتل

اور تیل کے ایک ایک تیر لے آؤ۔ یہ چیزیں کہاں سے ملیں
گی؟ ہم بتائیں دادی اماں کے صندوقچے میں ہاتھی دانت
کا ٹکڑا پڑا ہوگا۔ لوہے کی سلاخ باورچی خانے میں ہوگی
باقی چیزیں میری الماری کے سب سے نیچے کے خانے میں دیکھو لے آئے!
شاباش! اب ان چیزوں کو بڑھا کر یا موڑ کر دیکھو۔ دیکھا ربر
لوہا، ہاتھی دانت کتنی جلدی اپنی جگہ پر واپس آگئے، مگر تانبے
اور سیسے میں وہ بات نہیں۔

وہ تمھاری کمان کیا ہوئی؟۔ ہاں ہاں وہی
دیکھو یہ تیر لے کر پیڑ کے اس پتے کو نشانہ بناؤ۔



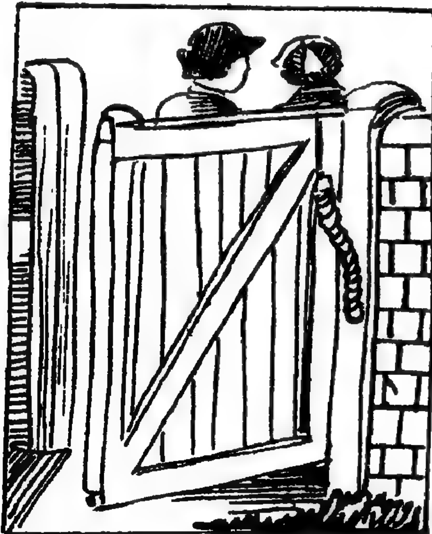
ارے ادھر تھا! تیر چلا ادھر کمان بھی انتہائی تیزی سے
اپنی اصلی حالت پر آگئی کچھ سمجھے ایسا کیوں ہوا۔ اس لئے
کہ تمھاری کمان بانس کی بنی ہوئی ہے اور بانس میں
انتہائی لچک کی صلاحیت موجود ہے۔

اچھا اب اس بید کی چھڑی کو خوب زور سے
جلدی جلدی ہلاؤ۔ اب بند کردو۔ چھڑی فوراً اپنی اصلی
حالت پر آگئی۔ آگئی نا؟ لیکن اگر اسے بری طرح زور
سے موڑ دو گے تو وہ پھر اچھل کر ہرگز سیدھی نہ ہوگی
لچک کی بھی تو آخر کوئی حد ہوتی ہے۔

لوہے میں بڑھنے اور سکڑنے کی صلاحیت سب
سے زیادہ ہوتی ہے اسی لئے یہ اتنی کثرت سے استعمال



ہوتا ہے۔ بعض دروازوں میں لوہے کی اسپرنگ
لگی ہوتی ہے۔ تم کسی ایسے دروازے سے گذرو تو اسے
غور سے دیکھنا۔ تم نے کھولا اور وہ بند ہوا۔ اسپرنگ
میں گھٹنے بڑھنے کی صلاحیت ہے۔ دروازہ کھولنے سے



بڑھ جاتی ہے پھر خود بخود گھٹ کر دروازہ بند کرلیتی
ہے

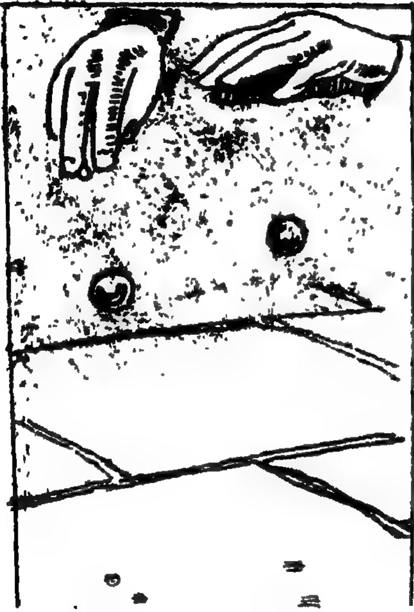
اب تمھیں یہ یقین دلانا ہے کہ لوہا ربر سے زیادہ
لچک رکھتا ہے یہ بھی کہ مٹی میں اس کی ذرا بھی صلاحیت
نہیں تو ایک کام کرو ایک چھوٹی سی گیند مٹی کی بنا لو ایک
ربر کی لے لو، ایک لوہے کی گولی لے آؤ۔ آ گئیں سب



چیزیں! اب تینوں کو اس پتھر پر گراؤ ارے لو مٹی کی گیند تو
وہیں ڈھیر ہو گئی ربر کی گیند کتنی اوپر اُچھلی اور لوہے کی گولی کو تو دیکھو
کتنی تیزی سے ربر کی گیند سے بھی اوپر پہنچی۔

ایک اس سے بھی دلچسپ تجربہ! اس پتھر پر تھوڑی
سی ویسلین لگا دو، اور لوہے اور شیشے کی دو گولیاں
برابر اونچائی سے گراؤ جوں ہی اُچھل کر اوپر آئیں انھیں
پکڑ لو ہاں اس طرح۔ اب اِن گولیوں میں لگی ہوئی ویسلین
کو دیکھو، گولیوں نے پتھر پر جو نشان ڈالے ہیں وہ بھی غور
سے دیکھ لو۔ اب؟ اب اِن گولیوں کو آہستہ سے
سے پتھر پر رکھو اور آہستہ سے اُٹھا لو گولیاں

گھومنے نہ پائیں۔ بالکل ٹھیک! دیکھو اس وقت ان میں
بہت تھوڑی سی ویسلین لگی ہے۔ اور گولیوں نے
پتھر پر بہت ذرا ذرا سے نشان بنائے ہیں۔ اس کی وجہ



بھی سمجھ میں آئی؟ تم نے گولیوں کو آہستہ سے پتھر پر رکھا
تو ان کا بس اتنا ہی حصہ پتھر پر لگا جتنے پر ویسلین چپک گئی تو
تو پھر پہلے نشان اتنے چوڑے کیوں ہیں؟ اور گولیوں میں اتنی
زیادہ ویسلین کیوں لگ گئی تھی؟ اس لئے کہ اوپر سے گرنے کی
وجہ سے گولیاں دب کر چپٹی ہو گئی تھیں اور ہاں لوہے کی گولی کا
نشان شیشے کی گولی سے زیادہ چوڑا تھا اب تو تمھیں یقین آیا کہ
ٹھوس چیزوں میں لوہا ہی ایک ایسی چیز ہے جس میں گھٹنے بڑھنے کی
صلاحیت سب سے زیادہ ہے اچھا اب ساری چیزیں جہاں کی تہاں
رکھ آؤ ننھے میاں کی گیند میرے حوالے کرو اور فارغ ہو جاؤ



چندا ماموں

کوئی ایک ہفتے سے ساون کی جھڑی لگی تھی سورج دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں۔ اندر، باہر، گلیوں میں، سڑکوں پر، ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ۔ ہر شخص اکتایا ہوا، خیر آج شام کو بادل پھٹا۔ اور گھنٹے دو گھنٹے میں سوائے بادل کے چند ٹکڑوں کے آسمان بالکل صاف ہو گیا۔ چندا ماموں نے ایک کونے سے جھانکنا شروع کیا اور تھوڑی دیر میں اپنی روپہلی چاندنی زمین پر پھیلا دی۔ آج یہ چاندنی بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ ہمارے حبیب میاں تو امی کے روکنے پر بھی چاروں طرف کلیلیں کرتے پھر رہے تھے۔ ہم سب سے ان کا تقاضا تھا کہ آؤ کھیلیں۔ جب پوچھا گیا کہ کیا کھیلو گے تو کہنے لگے "آؤ تو بھائی جی، آنکھ مچولی کھیلیں گے"۔ حبیب میاں سے اس طرح کی باتیں ہو رہی تھیں کہ واجد میاں بھی آ گئے اور کہنے لگے "پیارے بھائی آج تو چاندنی بڑی اچھی لگ رہی ہے۔ کہیں سیر کو چلئے نا!" واجد میاں اپنا فقرہ پورا بھی نہ کرنے پائے تھے کہ ایک طرف سے آواز آئی۔ "اے لو انھیں آدھی رات کو سیر کی سوجھی ہے۔ نگوڑا الّو کا خواص (خاصیت یا عادت)" یہ ان کی عائشہ بہن تھیں۔ واجد میاں کی ذرا ان سے بنتی نہیں تھی۔ ان کی بہن آصفہ خاتون باہر آنگن میں بیٹھی کچھ پکا رہی تھیں انھیں یہ بات ناگوار گذری۔ کہنے لگیں "اے بہن تو کیا ہوا بچہ ہی تو ہے تم خواہ مخواہ اس کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔ آؤ بھیا ہمارے پاس ہم تمھیں گھر بیٹھے بڑی اچھی سیر کرا دیں۔ دیکھو یہ چاند میں کون بیٹھا ہے۔ غور سے دیکھو۔ بڑھیا بیٹھی چرخہ کات رہی ہے۔ کیوں کچھ نظر آیا؟" واجد میاں بولے: "ہاں کچھ نظر تو آ رہا ہے۔ کیوں پیارے بھائی کیا سچ مچ بڑھیا بیٹھی چرخہ کات رہی ہے؟" میں نے کہا "ہاں بھئی تمھیں جو کچھ نظر آ رہا ہے ٹھیک ہی ہو گا ویسے تو جتنے منھ اتنی ہی باتیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک آدمی چاند میں بہت سے ڈنڈے لئے بیٹھا ہے بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ کوئی بوڑھی عورت کتاب پڑھ رہی ہے تم نے چینیوں کو تو دیکھا ہو گا وہی جو سائیکلوں پر کپڑوں کا گٹھر لادے ادھر ادھر بیچتے پھرتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ چاند میں ایک خرگوش ہے جو اچھل کود رہا ہے۔ مگر یہ سب پرانے زمانے کی باتیں ہیں اتنے پرانے زمانے کی کہ تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ بس یہ سمجھ لو کہ بالکل جاہل اور وحشی لوگ تھے۔ ان میں پڑھنے لکھنے کا رواج بالکل نہیں تھا۔ پھر جب پڑھنے لکھنے کا رواج ہوا تو لوگوں نے چاند سورج کے بارے میں اور دلچسپ باتیں کہنا شروع

کیں۔ مثلاً یونان کے ایک عالم اناکسی مینڈر کا دعویٰ تھا کہ سورج، چاند اور ستارے آسمان کا سوراخ ہیں۔ چاند والا سوراخ آہستہ آہستہ کھلتا اور بند ہوتا رہتا ہے۔ چاند جو شروع مہینے میں بالکل ذرا سا نظر آتا ہے اور روزانہ کچھ نہ کچھ بڑھتا رہتا ہے اور پھر پورا چاند نکلنے کے بعد روز بروز گھٹنے لگتا ہے تو اس کی یہی وجہ ہے۔ یہ سوراخ تھوڑی دیر کے لئے بالکل بند ہو جاتا ہے تو چاند گویا گہن میں آ جاتا ہے۔" واجد میاں بولے "پیارے بھائی یہ تو آپ نے بڑے مزے کی بات بتائی اور یہ یونان کہاں ہے۔ کہیں لکھنؤ کے پاس ہوگا اور یہ نام تو عجیب ہے۔ ہماری سمجھ میں تو آیا نہیں۔" میں نے کہا "نہیں میاں لکھنؤ وکھنؤ کے پاس نہیں یہ یورپ میں ایک ملک ہے۔ بڑے درجوں میں پہنچ کر جغرافیہ پڑھوگے تو تمھیں معلوم ہوگا۔ پرانے زمانے میں اس ملک میں پڑھنے لکھنے کا بہت رواج تھا اور بڑے بڑے قابل لوگ یہاں پیدا ہوئے ہیں۔ اناکسی مینڈر بھی اسی ملک کا ایک عالم تھا۔" میں یہ باتیں کر ہی رہا تھا کہ ماموں زاہد حسین صاحب کھانا کھانے گھر میں آ گئے۔ میں نے اپنی باتوں کا سلسلہ جاری رکھا اور کہا "اسی طرح کے ایک عالم کا ایک اور دلچسپ خیال تھا یعنی سورج اور چاند آگ کے ایک چوڑے پتے کی طرح آسماں میں چاروں طرف گھومتے پھرتے ہیں۔ ستاروں کو وہ آگ کی گھنڈیاں بتاتا تھا۔ یہ گھنڈیاں آسمان میں جڑی ہوئی ہیں۔ ایک اور صاحب زینافن تھے (یہ حضرت عیسیٰؑ سے کوئی ۵۰۰ برس پہلے پیدا ہوئے تھے یعنی اب سے کوئی ڈھائی ہزار سال پہلے) یہ چاند اور سورج کو آگ کے بادلوں کا سلسلہ سمجھتے تھے۔ یہ آگ کے بادل آسماں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ پچھلے دن کا سورج پچھم کی طرف اتنی دور چلا جاتا ہے کہ نظر نہیں آسکتا۔ اُن کے ۵۰ برس بعد ایک اور صاحب پیدا ہوئے اُن کا نام تھا ہیراقلیطس یہ کہتے تھے کہ چاند سورج اور ستارے اصل میں کٹورے ہیں۔ چاند والی کٹوری آہستہ آہستہ گھومتی پھرتی رہتی ہے۔" ماموں صاحب ہنس کر بولے "بھئی ان لوگوں کے خیالات بڑے دلچسپ تھے مگر ان میں سے کس کی بات ٹھیک سمجھی جائے۔" میں نے کہا "کسی کی بھی نہیں۔" "مگر ہمیں ان کا مذاق نہیں اُڑانا چاہئے۔ یہی کیا کم ہے کہ انھوں نے بلکہ اُن سے بہت پہلے بہت ہی پہلے کے لوگوں نے چاند سورج اور دوسرے ستاروں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ بے چاروں نے غلط سوچا اور غلط سمجھا مگر وہ بھی کیا کرتے اُس زمانے کا علم ہی تو کچھ یوں ہی سا تھا ہاں اُسی زمانے سے ترقی ضرور کر رہا تھا چنانچہ میں نے جو آخری نام لیا تھا ہیراقلیطس تو اس عالم کے کوئی ۴۰ ۵۰ برس بعد ایک اور حکیم پیدا ہوا، انکساگورس۔ اُس نے چاند اور سورج کے بارے میں کچھ ٹھیک ٹھیک سوچا اور پتے کی باتیں بتائیں۔ اس نے کہا کہ چاند بھی ہماری زمین کی طرح ہے جس طرح زمین میں میدان اور گھاٹیاں ہیں اسی طرح چاند میں بھی ہیں۔ چاند کی روشنی اس کی اپنی روشنی نہیں ہے جس طرح سورج ہماری زمین کو روشنی پہنچاتا ہے۔ اسی طرح چاند بھی اس سے روشنی مانگ کر ہم تک اپنی سفید چاندنی پہنچاتا ہے اس عالم نے صحیح طریقے پر سوچا

اِس کے بعد اَور لوگوں نے بھی چاند کے بارے میں اپنی تحقیقات جاری رکھی یہاں تک کہ اب سے کوئی ۳۶۲ برس پہلے ایک مشہور عالم گلیلیو نے دوربین کی مدد سے سورج اَور چاند اَور دوسرے ستاروں کی طرح اَور بھی ٹھیک ٹھیک باتوں کا پتہ چلایا۔" آصفہ بہن اِن باتوں کو بہت غور سے سُن رہی تھیں کہنے لگیں: "کیوں پیارے بھائی جب چاند ہماری زمین کی طرح ہے تو وہاں بھی ہماری طرح آدمی بستے ہوں گے۔" میں نے کہا "شروع شروع میں لوگوں کا یہی خیال تھا اس لئے کہ چاند کو بعض لوگوں نے دوربین سے دیکھا تو اُنھیں پہاڑ، دادیاں، سمندر سبھی کچھ نظر آئے اَور اُنھوں نے قیاس کیا کہ جب یہ چیزیں موجود ہیں تو آبادی بھی ضرور ہو گی مگر بعد میں تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ چاند پر نہ ہوا ہے نہ پانی نہ سمندر۔ دوربین سے دیکھنے والے جن چیزوں کو سمندر سمجھتے تھے وہ اصل میں بڑے بڑے غار ہیں اَور وہاں موسم کا یہ حال ہے کہ ذرا دیر میں اتنی گرمی پڑتی ہے اتنی گرمی پڑتی ہے کہ تم جل بھن کر راکھ ہو جاؤ۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں اتنی سردی کہ برف کی طرح جم جاؤ۔ ایسی جگہ میں انسان کا تو کیا ذکر، درخت، پھول، پودے کوئی چیز بھی زندہ نہیں رہ سکتی، پاس ہی فہمیدہ خاتون بیٹھی چھالیا کتر رہی تھیں بولیں "اچھا بتاؤ چاند میں کوئی جا بھی سکتا ہے" اس پر عائشہ خاتون نے ہنس کر کہا "واہ آپا تم نے بھی کیا بچوں کی سی بات پوچھی" بھلا چاند پر بھی کوئی پہنچ سکتا ہے! اتنی دور!! آسمان پر!!! اَور پھر نگوڑا اتنا سا تو ہے۔ بالکل تھال جیسا۔ ہمارا ایک پاؤں بھی اس پر مشکل سے آئے گا۔"

میں نے کہا "فہمیدہ بی کچھ لوگ اس چکر میں تو ہیں کہ چاند یا مریخ تک کیسے پہنچیں ان کی تجویز ہے کہ غبارے کی طرح کی ہوائی بنائی جائے اَور جس طرح توپ سے گولا چھوٹتا ہے اسی طرح اسے چھوڑا جائے۔ مگر ابھی اِس کا تجربہ ہی ہو رہا ہے۔ چاند ہم سے کوئی ۲۳۶۰۰۰ میل دور ہے سمجھیں! اتنی تو تمھیں گنتی بھی نہیں آتی۔ عائشہ بہن اب تو تمھاری سمجھ میں بھی آ گیا ہوگا کہ اِس قدر دور ہونے کی وجہ سے چاند ہمیں اتنا چھوٹا معلوم ہوتا ہے اہاں ایک بات یاد آئی میں نے ایک کتاب میں ایک نقشہ دیکھا تھا ابھی لاتا ہوں ہاں دیکھو اس سے سمجھ میں آ جائے گا





- بندوق کی گولی ۹۹ گھنٹے میں
- سب سے زیادہ تیز ہوائی جہاز ۲۲ دن میں۔
- سب سے زیادہ تیز موٹر ۸۰ دن میں۔
- " " " " کشتی ۹۰ دن میں
- " " " " ریل کا انجن ۱۷ ہفتوں میں۔
- ایک تیز دوڑنے والا کتا ۲۵ ہفتوں میں۔
- گھوڑ دوڑ کا گھوڑا ۲۷ ہفتوں میں۔
- سائیکل سوار ۲ سال ۳۷ ہفتوں میں۔ اَور
- پیدل آدمی ۷ سال تک لگاتار چلتا رہے تو چاند تک پہنچ سکے گا۔

(باقی آئندہ)

دریائے حیات

فضل الدین اثر۔ ایم اے

ننھی ثروت ودیا بھون ہائی اسکول کے آٹھویں درجے میں پڑھتی ہے۔ ان کے چچا مسٹر فصیح ودیا ٹریننگ کالج میں استاد ہیں۔ ثروت بہت سمجھ دار اور ذہین لڑکی ہے۔ وہ ویسے تو سبھی مضمون شوق سے پڑھتی ہے مگر اُسے جغرافیے سے زیادہ دلچسپی ہے۔ خصوصاً دریاؤں کا حال پڑھنے میں اُسے خاص لطف آتا ہے۔

ایک دن شام کو فصیح صاحب کالج سے واپس آئے تو وہ بڑی محویت سے کتاب پڑھ رہی تھی۔ اُسے اُن کے آنے کی خبر نہ ہوئی۔ فصیح صاحب اُس کے پاس ہی بیٹھ کر بولے: "کہو ثروت کیا ہو رہا ہے"۔

ثروت: (چونک کر) اہا آپ آگئے چچا جان۔ چائے لاؤں۔

فصیح:۔ نہیں میں پی چکا ہوں، تم اس وقت کیا پڑھ رہی تھیں۔ (اٹلس کو ثروت کے قریب پڑا دیکھ کر) پھر وہی دریاؤں کی سیر!

ثروت:۔ ہاں چچا جان آج میں نے دنیا کے سب سے لمبے دریا کا حال پڑھا ہے۔

فصیح:۔ مسی سپی کا۔

ثروت: جی ہاں! مجھے کتنا شوق ہے دریا کی سیر کرنے کا! نیل..... وہ نیل جسے مصر کا تحفہ کہتے ہیں۔ جی چاہتا ہے چچا جان کہ نیل کے دہانے سے اس کے کنارے کنارے چلی جاؤں۔ بس برابر چلتی رہوں یہاں تک اس کے منبع تک پہنچ جاؤں۔

فصیح:۔ لیکن ثروت۔ شاید تمھیں معلوم نہیں مسی سپی جیسے لمبے دریا سے بھی زیادہ دل کش اور نیل جیسے بڑے دریا سے بھی زیادہ حیرت انگیز قدرت کا بنایا ہوا دریا ایک اور بھی ہے۔

ثروت:۔ اور بھی ہے؟ اس کا حال تو میں نے کبھی نہیں پڑھا۔ چچا جان! اس دریا میں کیا عجیب بات ہے؟

فصیح:۔ سنو، ثروت، وہ دریا بند نالیوں میں بہتا ہے۔ نہ کہیں سے شروع ہوتا ہے نہ کہیں پر ختم ہوتا ہے۔

ثروت:۔ تو یہ دریا کس ملک میں بہتا ہے؟ (اٹلس سامنے کرتے ہوئے) دکھائیے اس میں۔

فصیح:۔ وہ دریا، ثروت، اٹلس میں نہیں مل سکتا۔ وہ دریا تو تم میں بہتا ہے اور مجھ میں بہتا ہے۔

ثروت:۔ آپ میں بہتا ہے! اور مجھ میں بہتا ہے!! اور کس میں بہتا ہے؟ غفور میں بھی بہتا ہے؟

فصیح:۔ ہاں غفور میں بہتا ہے۔ اور ہر انسان میں بہتا ہے۔

ثروت:- چچا جان آج آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

فصیح:- (ثروت کا ہاتھ لے کر فصیح نے کہنی کے اوپر سے دبایا اور فوراً اسی کہنی سے لے کر پہنچے تک نیلی نیلی نالیاں جلد کے نیچے اُبھر آئیں) یہ دیکھو ثروت، مجھ میں اور تم میں بہنے والا دریا ان نالیوں میں بہتا ہے!

ثروت:- (خوشی سے تالی بجاتے ہوئے) اچھا چچا جان آپ کا مطلب خون اور اس کی نالیوں سے تھا۔

فصیح:- شاباش بالکل ٹھیک سمجھیں۔ قدرت کا سب سے عجیب و غریب دریا فی الحقیقت یہی ہے۔

ثروت:- اچھا چچا جان، جن دریاؤں کو میں جانتی ہوں اُن کا حال تو بڑے بڑے سیاحوں نے بڑی مشکلوں سے دریافت کیا تھا۔ آپ کے اس "دریائے حیات" کیوں چچا جان اسے یوں ہی کہیں گے نا؟

فصیح:- ہاں ثروت، تم نے میرے بتائے ہوئے دریا کا نام تو بالکل صحیح تجویز کیا۔ ہاں تو تم کیا بات پوچھ رہی تھیں۔

ثروت:- یہی کہ دریائے حیات کے متعلق چھان بین کس نے کی؟

فصیح:- اس دریا کی سیاحت کرنے والے کا نام ولیم ہاروے تھا۔

ثروت:- اور اس نے اس دریا کی کب تحقیق کی تھی چچا جان؟

فصیح:- یہی آج سے کوئی تین سو پندرہ برس پہلے۔

ثروت (اپنی سلیٹ پر حساب لگاتے ہوئے) یعنی ۱۶۲۸ء میں۔

فصیح:- ہاں ٹھیک۔ ۱۶۲۸ء میں، تم نے حساب تو جلدی لگا لیا۔

ثروت:- اچھا چچا جان ایک بات بتائیے۔ نئے نئے ملکوں، سمندروں اور دریاؤں کی تحقیق اتنے بعد میں ہوئی یہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے، جہاز نہیں ہوں گے کھانے پینے کے سامان کی کمی ہوتی ہوگی۔ پیسہ نہیں ہوتا ہوگا۔ لیکن یہ ہم سے اتنے قریب کی چیز ۱۶۲۸ء تک نامعلوم کیوں پڑی رہی؟

فصیح:- تمہارا سوال تو بڑے مزے کا ہے ثروت سنو پہلی رکاوٹ تو کچھ اس قسم کی تھی جس کا تم نے اپنے دریاؤں وغیرہ کی تحقیق کے سلسلے میں ذکر کیا یعنی اوزار نہیں ملتے تھے یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ انسانی جسم کو کاٹنے، کھولنے کے لئے بڑے نفیس آلات کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ پرانے زمانے کے مذہبی لوگ انسانی جسم کے بارے میں غور و تحقیق کو بُرا سمجھتے تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ یونان کے مشہور فلسفی ارسطو نے دوران خون کے بارے میں بہت غلط تحقیق کی تھی۔ ارسطو کا خیال تھا کہ خون ہمارے جسم میں کبھی دورہ کرتا ہے کبھی نہیں کرتا، اس کا یہ بھی خیال تھا کہ ہمارے جسم میں دو طرح کا خون ہے ایک شریانوں (صاف خون کی نالیوں میں) میں دورہ کرتا ہے۔ دوسرا وریدوں

گندے خون کی نالیوں ہیں۔ دل کے بارے میں اس کا خیال اور بھی عجیب ہے وہ کہتا تھا کہ ہمارا دل اس لئے دھک دھک کرتا ہے کہ اس میں کوئی روح بند ہے۔ یہ سب باتیں ظاہر ہے کہ غلط ہیں مگر ارسطو کی قابلیت کی دھاک کچھ اس طرح لوگوں کے دلوں پر بیٹھی ہوئی تھی کہ بہت عرصے تک کسی کو اس کی مخالفت کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اچھا تم ذرا اپنی سلیٹ مجھے دو پھر میں تمھیں بتاؤں کہ دل روح کا پنجرا ہے یا کیا ہے۔

ثروت :- تو چچا جان پہلے تو یہ بتایئے کہ دل ہوتا کس شکل کا ہے۔

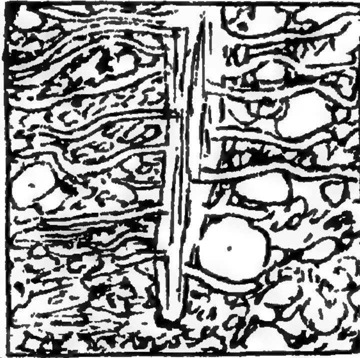
فصیح :- (سلیٹ پر خاکہ کھینچتے ہوئے) دیکھو باہر سے دل ایسا ہوتا ہے۔



(باقی آیندہ)



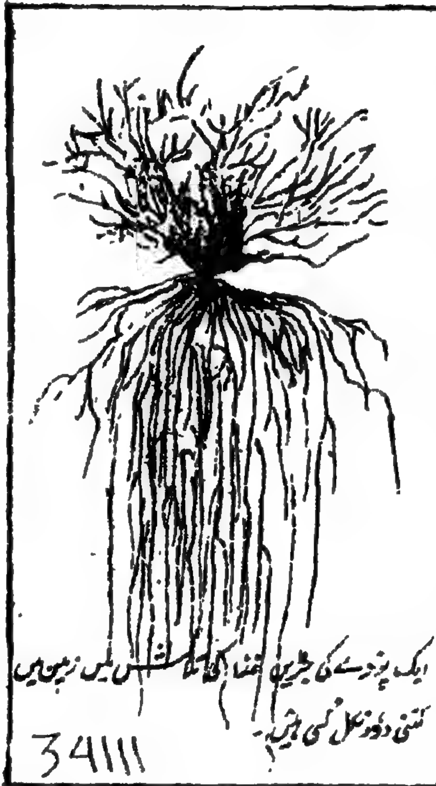
پہلے پہل جب میں دلّی آیا تو یوسف صاحب کے مکان میں ٹھہرنے کا موقع ملا۔ بڑے دلچسپ زندہ دل اور بے تکلف آدمی ہیں۔ جلد ہی دنوں میں خوب گھل مل گئے یہ اوپر کی منزل میں رہتے ہیں۔ مکان مردانہ ہے بس، دو کمرے ہیں اور چھوٹا سا صحن، مگر یوسف صاحب نے اپنی خوش ذوقی سے اُسے جنت کا نمونہ بنا دیا ہے، چھوٹے بڑے بیسوں گملے بڑے سلیقے سے اِدھر اُدھر رکھے ہیں، ان میں انگریزی اور دیسی پھولوں کے پودے ہیں کسی میں کروٹن ہے۔ کسی میں جوہی، کسی میں گلاب۔ کسی میں رات کی رانی۔ یوسف صاحب اچھے اچھے پھولوں کے پودوں کی تلاش میں دلی کے باغوں اور نرسری کا چکر لگاتے رہتے ہیں انھوں نے اسے اپنا ایک مشغلہ سا بنا لیا ہے۔ لطیف صاحب بھی اسی مکان میں رہتے ہیں۔ مگر انھیں بس لکھنے پڑھنے سے کام ہے۔ باغبانی وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بلکہ اکثر یوسف صاحب پر فقرے بھی کستے رہتے ہیں۔ ایک دن شام کو یوسف صاحب نرسری سے بہت سے پودے لائے، بہت اچھے اچھے۔


زمین میں ایک پودے کی جڑیں

لطیف صاحب شام کی چائے پی رہے تھے۔ اُنھیں دیکھتے ہی کہنے لگے۔ "کہیے یوسف صاحب آج تو معلوم ہوتا ہے آپ نے بڑا تیر مارا خوب گھر بار چلے گا۔ مگر کھاد تو ہے ہی نہیں وہ تو لائیے۔ دیکھیے وہ سامنے ٹوکری رکھی ہے" یوسف صاحب تھکے ہارے آئے تھے ان باتوں سے جھلا گئے مگر بہت نرم مزاج کے آدمی ہیں دوستوں کی جانے ایسی کتنی باتیں پی جاتے ہیں۔ اس وقت بھی انھوں نے سنی ان سنی کردی اور اپنے کام میں لگے رہے۔ فارغ ہوگئے تو لطیف صاحب کے کمرے میں آئے اور بولے "بھائی لطیف سب سے پہلی بات آپ کو یہ بتاؤں کہ انسان کو فرصت کے وقت میں کوئی نہ کوئی مشغلہ ضرور اختیار کرنا چاہیے۔ اس سے وقت بہت اچھا کٹ جاتا ہے۔ گھر بار اور دفتر کی فکروں سے دھیان بٹ جاتا ہے۔ دماغ کو سکون حاصل ہوتا ہے اور کسی طرح کے بیہودہ خیال دماغ میں نہیں گھستے۔" لطیف صاحب کے طنزیہ فقرے مجھے بھی کچھ ناگوار معلوم ہوئے تھے۔ میں نے بڑے جوش سے

ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "ہاں یوسف صاحب! آپ نے بڑے کام کی بات بتائی۔ ہر آدمی کا کوئی مشغلہ ضرور ہونا چاہیے اور یہ مشغلہ اس کے روز مرہ کے کاموں سے الگ ہونا چاہیے۔" لطیف صاحب کہنے لگے "ارے بھائی آپ لوگ تو مشغلوں کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ مشغلے نہ ہوئے مصیبت ہو گئے۔ ارے ہم جو کام کرتے ہیں وہی ہمارا مشغلہ ہے۔" میں نے کہا "واہ جناب یہ آپ نے خوب بات کہی۔ ایک کام کرتے کرتے آدمی کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔ اور کوئی دوسرا کام کرنے کو بے اختیار اس کا جی چاہتا ہے۔" یوسف صاحب بولے "ارے بھائی ان بحثوں کے لیے بہتیرا وقت پڑا ہے۔ شام ہو گئی ہے۔ آیئے ذرا پارک تک ٹہل آئیں۔"

راستے میں یوسف صاحب مجھ سے بولے "دیکھئے مشتاق صاحب ہمارے بھائی لطیف میرے اس شغل کا مذاق اڑاتے ہیں مگر میں اس شغل کے فائدے بتاؤں! پودوں کی تلاش میں ہر دوسرے تیسرے اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا ہوں۔ انھیں گملوں میں لگاتا ہوں۔ انھیں روزانہ پانی دیتا ہوں اس سے میری تندرستی پر بہت ہی اچھا اثر ہوا ہے۔ پھر یہ پودے آہستہ آہستہ بڑھتے ہیں اور ان میں اچھے اچھے خوب صورت خوب صورت پھول آتے ہیں تو اپنی محنت کی کامیابی پر مجھے جو خوشی ہوتی ہے آپ اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے علاوہ اس کے جب میں بیج کے زمین سے اُگنے اور پودے یا درخت بننے پر غور کرتا ہوں تو مجھے خدا کی قدرت کا عجیب کرشمہ نظر آتا ہے۔" لطیف صاحب ہنس کر بولے "لیجیے خدا خیر کرے اب آپ کو فلسفے اور سائنس سے بھی دلچسپی ہو گئی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا "یوسف صاحب آپ اپنی بات جاری رکھیے لطیف صاحب کو بات کاٹنے کی عادت ہو گئی ہے۔ انھیں تو بس اِدھر اُدھر کی بحثوں میں مزا آتا ہے۔" یوسف صاحب بولے "ہاں بھئی میں بھی اب ان حضرت کو خوب سمجھ گیا ہوں۔ آہا دیکھئے وہ درخت کے چاروں طرف چبوترہ سا بنا کر مالی نے کیسے ننھے ننھے پھول لگائے ہیں اور بیچ کے گول چکر میں گُل داؤدی اور اور ولایتی پھولوں کی کیاریاں کیسی بھلی لگ رہی ہیں۔" میں نے کہا "اور یہ سڑک کے دونوں طرف اونچے اونچے درختوں کی قطاریں کیسی اچھی معلوم ہو رہی ہیں۔" لطیف صاحب ہنس کر کہنے لگے "واللہ کیا بات کہی ہے۔" یوسف صاحب عجیب انداز سے میری طرف دیکھ کر کہنے لگے "اچھا اب آپ بھی مذاق کرنے لگے۔" میں نے کہا "ارے بھائی یوسف صاحب آپ بھی لطیف صاحب کی باتوں میں آ گئے۔ مجھے سچ مچ اس وقت کا منظر بہت

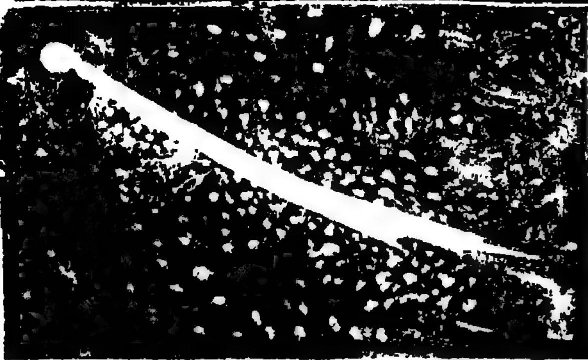


ایک پودے کی جڑیں غذا کی تلاش میں زمین میں کتنی دور نکل گئی ہیں۔

گے ہیں ۔ یوسف صاحب نے جیسے بات ٹال دی اور کہنے لگے آج نرسری میں اچھے اچھے پودے دیکھے میرا تو جی چاہتا تھا کہ سبھی خرید لاؤں مگر ایک تو پیسے کی کمی پھر جگہ کی کمی بس دل مسوس کے رہ گیا۔ میں نے پوچھا آخر کچھ نام تو بتائیے۔ انھوں نے جواب دیا "مثلاً سفید اور کالے پھول والا گلاب بیلے، جوہی اور دوسرے نوبہار پھولوں کی نئی نئی قسمیں" لطیف صاحب بولے اور چھتری کی طرح کا ککرمتا" میں نے کہا "لاحول ولاقوۃ۔ اس میں سے تو بس گڑے سڑے ہوئے گوشت کی بو آتی ہے" لطیف صاحب کہنے لگے "کیوں صاحب کیا وہ پودا نہیں ہے اور زمین سے پیدا نہیں ہوتا ہے؟" یوسف صاحب بولے "ہاں بھئی پودا تو ضرور ہے مگر زمین سے تو آپ کا برگد کا درخت بھی پیدا ہوتا ہے۔ آپ نے اوکھلے میں دیکھا ہوگا اس کا گھیرا کوئی ۴۰ فٹ کا ہوگا۔ میں نے کہا "جی ہاں کلکتے میں تو ایک درخت اتنا بڑا ہے کہ اس کے سائے میں دس ہزار آدمی آسکتے ہیں" یوسف صاحب نے کہا "ہاں تو بھئی اتنے بڑے بڑے درخت اور یہ پودے بہر حال زمین سے تو سبھی پیدا ہوتے ہیں مگر ..." لطیف صاحب بات کاٹ کر بولے مگر کیا بس زمین ہی سب کی ماں ہے۔ اسی میں سے برگد شیشم پیپل اور دیودار پیدا ہوتے ہیں اور اسی میں سے گلاب چنبیلی جیسے نازک پودے" میں نے لقمہ دیا "اور آلو گوبھی ٹماٹر، پالک، میتھی، بتھوا، بھنڈی، گھیا، اروی مولی گاجر......" لطیف صاحب بولے "بس کیجیے بس کیجیے معلوم ہو گیا کہ آپ کا حافظہ بہت تیز ہے" یوسف صاحب بولے "پھر آپ بحث میں الجھ گئے" میں نے جواب دیا "نہیں جناب آپ کے لطیف صاحب، ادھر ادھر گھسیٹ لے جاتے ہیں" لطیف صاحب نے کہا "خوب! میں تو بس یہ کہنا چاہتا تھا کہ ککرمتا جیسی بدبودار چیز ہو یا گلاب جیسا خوشبودار پودا سبھی زمین سے اُگتے ہیں اور زمین ہی سے اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں۔ زمین ہی انھیں اُگاتی بڑھاتی اور پھول پھل دیتی ہے ہمارے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی کتاب میں مثلاً نیکی اور بھلائی کے پھیلانے کو پودے کی نشوو نما کے راز سے تعبیر کیا ہے فرماتے ہیں "گویا ایک شخص زمین میں بیج ڈال کر بے فکر ہو جاتا ہے۔ پودا اپنے آپ بڑھتا اور بڑھ کر پھول اور پھل لے آتا ہے۔ لیکن وہ شخص اس کے بڑھنے اور پھل لانے کے بھید سے انجان رہتا ہے زمین خود ہی یہ سارے کام انجام دے لیتی ہے پہلے اکھوا نکلتا ہے پھر بال اور پھر بال میں دانے" میں نے کہا "اچھا یوسف صاحب یہ بتائیے کہ پودے بڑھتے کیوں کر ہیں۔ زمین سے اپنی خوراک کیسے حاصل کرتے ہیں اور ان کے پاس وہ کون سی طاقت ہے جس کے بل پر وہ اپنی تمام مشکلات پر قابو پا لیتے ہیں"۔ یوسف صاحب کچھ گردن جھکا کر بولے "بھئی یہ آپ نے بہت مشکل سوال کیا اگر اس کا جواب ہم نے معلوم کر لیا تو سمجھیے کہ ایک پودا ہی نہیں بہتے انسان کی زندگی کا بھید بھی معلوم کر لیا۔ انگریزی زبان کا مشہور شاعر ٹینی سن ایک جگہ لکھتا ہے:-

اے وہ پھول جو دیوار کی دراز میں اُگا ہوا تھا۔
میں نے تجھے شگاف سے اکھیڑ لیا۔
میں نے تجھے جڑ اور تنے سمیت ہاتھ میں پکڑ رکھا ہے۔
اے چھوٹے سے پھول کاش میں سمجھ سکتا کہ
تو کیا ہے۔ تیری حقیقت کیا ہے
تو میں یہ بھی جان جاتا کہ انسان کیا ہے اور خدا کیا ہے۔

(باقی آئندہ)



ٹوٹنے والے تارے

رات کا وقت تھا اور گرمیوں کا موسم، ہم سب کھانا کھا کر اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے تھے۔ واجد میاں ابا سے کہانی سُن رہے تھے۔ اتنے میں آسمان پر ایک لمبی لکیر سی بنی اور کوئی تارا ٹوٹتا ہوا نظر آیا۔ واجد میاں کی نظر پڑ گئی بولے "ابا ابا وہ دیکھو تارا ٹوٹا۔ ابا یہ کہیں اِدھر آ جائے تو کیا ہو۔" ماموں زاہد حسین نے جو یہ سُنا تو ہنسے اور کہنے لگے "نہیں میاں یہ دمدار ستارہ ہے یہ ٹوٹتا ووٹتا نہیں۔ یہ تو تمھیں ویسے ہی نظر آ رہا ہے۔" میں نے کہا نہیں ماموں صاحب یہ دمدار ستارہ نہیں ہے دُمدار ستارہ تو ہم سے کروڑوں میل دُور سورج کے گرد چکر لگا رہا ہوگا۔ وہ ہر وقت نظر نہیں آتا۔ صرف اس وقت دکھائی دیتا ہے جب سورج کے بہت قریب آ جاتا ہے۔ اس وقت اس پر آفتاب کی شعاعیں پڑتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ایک لمبی سی دُم بھی ہے۔ پہلے زمانے میں دمدار ستارے کو لوگ بہت منحوس سمجھتے تھے اور کچھ اتفاق ایسا کہ جب جب یہ دکھائی دیا لوگوں پر کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آئی مگر اب تحقیق سے معلوم ہوا کہ دُوسرے ستاروں کی طرح یہ بھی ایک ستارہ ہے اور اپنے وقت پر دکھائی دیتا ہے بس جبھی سے لوگوں کے دلوں سے اس کی نحوست کا خیال دُور ہوا"

ماموں زاہد حسین صاحب پان کی پیک تھوک کر بولے تو میاں پھر یہ ٹوٹنے والا تارہ کیا چیز ہے؟" میں نے کہا "اس کو ستارہ کہنا ہی غلط ہے۔ یہ اصل میں سخت چٹانوں یا کسی دھات والے مادّے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوتے ہیں اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں لاکھوں ہماری مٹھی میں آ سکتے ہیں۔ یہ ہم سے بہت قریب ہوتے ہیں کبھی کبھی تو صرف چند میل کی اونچائی پر یہ ذرّے یا یوں کہئے کہ گولیاں کسی بہت ہی سخت مادّے کی ہوتی ہیں۔ یہ اوپر فضا میں ہر وقت



ڈوڑتی رہتی ہیں - اِن میں سے لاکھوں، کروڑوں ہماری ہوا سے ٹکراتی ہیں، اُن کی اِس وقت کی تیزی کا حال میں آپ کو کس طرح بتاؤں۔ بس یہ سمجھئے کہ رائفل کی

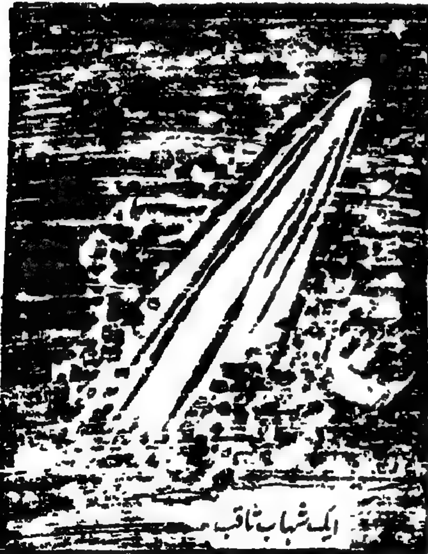


ایک شہاب ثاقب ہوا سے رگڑ کھانے کے بعد

گولی سے بھی لئی سو گنا زیادہ۔ ہوا سے رگڑ کھا کر یہ گرم ہو جاتی ہیں۔ بس اسی وقت ہمیں نظر آتی ہیں۔ آخر میں انتہائی گرمی کی وجہ سے خاکستر بن جاتی اور ہماری نظروں سے غائب ہو جاتی ہیں۔ بس یہ ہے ان کی حقیقت۔

ماموں صاحب بولے "واہ بھئی یہ نئی بات معلوم ہوئی۔ ہم تو بڑی غلط فہمی میں تھے۔" واجد میاں بولے "پیارے بھائی آپ تو ہمیشہ اسی طرح کی انوکھی انوکھی باتیں بتاتے ہیں۔ ارے وہ دیکھئے وہ تارا ٹوٹا۔ کتنا لمبا سا تھا۔" میں نے کہا "رات کو آسمان صاف ہو تو یہ درجنوں کی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو کروڑوں کی تعداد میں آسمان پر لپکتے ہوئے

معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ایسے دلچسپ نظارے بہت کم لوگوں کو دیکھنا نصیب ہوتے ہیں۔ اب سے کوئی چار سو سوا چار سو برس پہلے (۱۵۱۹ء) جاپان کے پاس کوریا کے علاقے میں لوگوں نے ایک ایسا ہی دلچسپ منظر دیکھا تھا۔ اس وقت یہ ٹوٹنے والے تارے کروڑوں سے بھی زیادہ تھے ان میں سے بعض تو تیر کی طرح اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے بعض اوپر چڑھتے معلوم ہوتے تھے بالکل جیسے سُرخ اژدہے۔ بعض کمان کی طرح خم کھائے تھے اور دو پہلوؤں کے خنجر کی طرح زبان نکالے نظر آتے تھے غرض ان کی عجب عجب شکلیں بن رہی تھیں۔ ہاں میں نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ ان ٹوٹنے والے تاروں کو شہاب ثاقب کہتے ہیں۔



ایک شہاب ثاقب

ان کی ایک قسم اور بھی ہے جنہیں سنگ شہابی کہتے ہیں، یعنی شہابی پتھر۔ یہ بھی اسی مادے کے ہوتے ہیں مگر بہت بڑے بڑے۔ ہوا سے رگڑ کھانے کے وقت ان

کی روشنی بھی شہاب ثاقب سے کہیں زیادہ ہوتی ہے کبھی کبھی یہ ہوا سے رگڑ کھانے سے تڑق جاتے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ جیسے سرد شیشے پر کھولتا ہوا پانی ڈال دیا جائے تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ ان کے ٹوٹتے وقت بڑی ہی ہیبت ناک آواز ہوتی ہے اب سے کوئی ۹۰۰ برس پہلے جاپان میں ایک ایسا ہی حادثہ ہوا تھا۔" ماموں صاحب تکیے کا سہارا لے کر اور میری طرف مُنہ کرکے بولے "تو کیا بھئی اس طرح کی باتیں بس جاپان ہی میں ہوتی ہیں ؟" میں نے کہا "جی نہیں اور جگہ بھی ایسے واقعات پیش آئے ہوں گے۔ مگر جاپانیوں میں مذہبی حیثیت سے بھی ان کی بہت اہمیت تھی۔ اس لئے وہ انھیں لکھ لیتے تھے۔ ہاں تو بہت سے چمکدار تاروں نے آسمان کو یکایک روشن کر دیا اور جب زمین اور سمندر کی طرف رُخ کیا تو پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی طرح گرنے لگے ایسی ہیبت ناک آواز ہوئی کہ معلوم ہوتا تھا ساری زمین ہل جائے گی اور سلطنت تباہ و برباد ہو جائے گی لوگ گھبرا کر چیخنے چلّانے لگے۔"

ماموں صاحب کہنے لگے بھئی واقعی یہ تو بڑی خطرناک چیز ہے۔" میں نے کہا "جی ہاں، اور شہابِ ثاقب تو زمین تک پہنچتے پہنچتے یوں سمجھئے کہ راکھ بن جاتے ہیں۔ مگر سنگِ شہابی زمین تک پہنچ جاتے ہیں۔ چھوٹے شہابی اکثر کھیتوں، میدانوں اور ریگستانوں میں پڑے ملتے ہیں اور سائنس داں انھیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر [illegible] خانوں میں رکھتے ہیں۔

بڑے سنگِ شہابی زمین میں دھنس جاتے ہیں بعض تو اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ زمین میں بڑے بڑے غار ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ایری زونا میں اسی طرح کا ایک بہت بڑا غار ہے یہ ۵۰۰ فٹ گہرا ہے اور کوئی تین میل کے گھیرے میں ہے۔ اب سے کوئی ۳۵ سال پہلے (۱۹۰۸) ایک سنگِ شہابی سائبریا میں گرا تھا۔ اس سے ۲۰ میل تک تو درخت جھلس گئے اور ہزاروں میل رقبے کی زمین برباد ہو گئی۔ ماموں صاحب نے یہ بات سُنی تو ایک جُھرجُھری لی اور بولے "ایسے عذابوں سے خدا پناہ میں رکھے یہ کم بخت تھا۔ پھر خدانخواستہ کسی آبادی پر گر جاتا تو قیامت آجاتی۔"

(دبیرِ کائنات کو سامنے رکھ کر لکھا گیا)



سوئی

محمد عبدالحی - حیدرآباد

آج کل لڑائی کی وجہ سے عام چیزوں خصوصاً بدیسی چیزوں کے دام اتنی تیزی سے بڑھ رہے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ننھی بہن کی تلے دانی میں سب سوئیاں ختم ہو گئی تھیں۔ پہلے تو خوانچے والے روزانہ پھیری لگاتے تھے اور ایک پیسے میں پچیس سوئیوں کی آواز لگاتے تھے۔ مگر اب وہ ایسے غائب ہوئے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ خیر صاحب بازار پہنچے تو دکان دار نے بڑی مشکل سے ایک پیسے میں دو سوئیاں دیں۔ کہنے لگا صاحب کیا کیا جائے باہر کے ملکوں سے مال ہی نہیں آ رہا ہے جو کچھ بچا کھچا ہے اسی کو سنبھال سنبھال کے بیچ رہے ہیں۔ یہ بھی ختم ہو گیا تو ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھ جائیں گے۔"

میں نے گھر میں آ کر سوئیاں ننھی بہن کے حوالے کیں اور تاکید کی کہ انھیں احتیاط سے استعمال کرنا اور حفاظت سے رکھنا۔ تھوڑے دنوں میں ان کا ملنا بھی دشوار ہو جائے گا۔ ننھی بہن بولیں: "اے ہے اتنی ذرا سی چیز کے لئے کتنا پریشان ہونا پڑا۔" میں نے کہا "ہاں اور یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اتنی ننھی اور حقیر سی چیز بھی ہندوستان میں نہیں بنتی۔" ننھی بہن نے کہا۔ "اچھے بھائی جان اللہ بتا دیجئے یہ کہاں بنتی ہیں اور کیسے بنتی ہیں۔" میں نے جواب دیا "لو اور سنو تمھیں آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے تم اپنے مزے سے سیتی پروتی رہو۔ تمھیں اس سے کیا دلچسپی کہ سوئیاں کہاں بنتی ہیں۔ اور کیسے بنتی ہیں۔" اس پر اماں بولیں "ہاں بیٹی یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے اور پھر اس بے چارے کو کیا خبر ہے۔" میں نے کہا "نہیں اماں مجھے سب کچھ خبر ہے لیجئے ابھی بتاتا ہوں۔ دیکھو ننھی بہن سوئی کا رواج جانے کن وقتوں سے ہے۔ ہماری اماں کی دادی کی سکڑ دادی کی سکڑ دادی کے زمانے سے بھی بہت بہت پہلے سے شروع شروع میں لوگ ہڈی اور لکڑی کی سوئیاں بنا کر سیتے تھے۔ بعض وحشی قبیلے تو اب تک ہڈی کی سوئیاں استعمال کرتے ہیں۔

پرانے زمانے کی لوہے کی سوئی بھی بہت بھدی اور بدشکل ہوتی تھی۔ کہیں موٹی، کہیں پتلی کالی کالی۔ اگر ستر، اسی سال پہلے کی سوئی کا (بعض لوگوں کے پاس یہ سوئیاں محفوظ ہیں) آج کل کی سوئی سے مقابلہ کرو تو زمین آسمان کا فرق معلوم ہوگا۔ دیکھو اس کی نوک کیسی تیز ہے اور اوپر سے نیچے تک کیسی گاؤدم

ہے۔ پھر کیسی سجل بنی ہوئی ہے چمکیلی اور سفید۔ بس سوراخ کے پاس ذرا چپٹی ہے۔ اور سوراخ کتنا گول ہے، تاگا ڈالنے میں ذرا دقت نہیں ہوتی۔

ولایت میں ایک شہر ہے لندن، وہی لندن جہاں کے صاحب لوگ ہم غلاموں پر حکومت کرتے ہیں، ہاں تو اسی لندن میں اب سے کوئی تین سو برس (۱۵۴۰ء) پہلے اسپین کا ایک حبشی سوئیاں تیار کرتا تھا۔ مگر وہ کسی کو یہ ہنر سکھائے بغیر مر گیا۔ اس کے بیس برس بعد ایک جرمن نے یہ کام شروع کیا۔ بس اسی زمانے سے انگلستان کے ایک چھوٹے سے شہر میں اور لوگوں نے بھی یہ سوئیاں بنانی شروع کر دیں پھر ایک اور شہر رڈچ میں سوئیاں بنانے کا کارخانہ کھول دیا گیا اور ہزاروں آدمی کام کرنے لگے۔

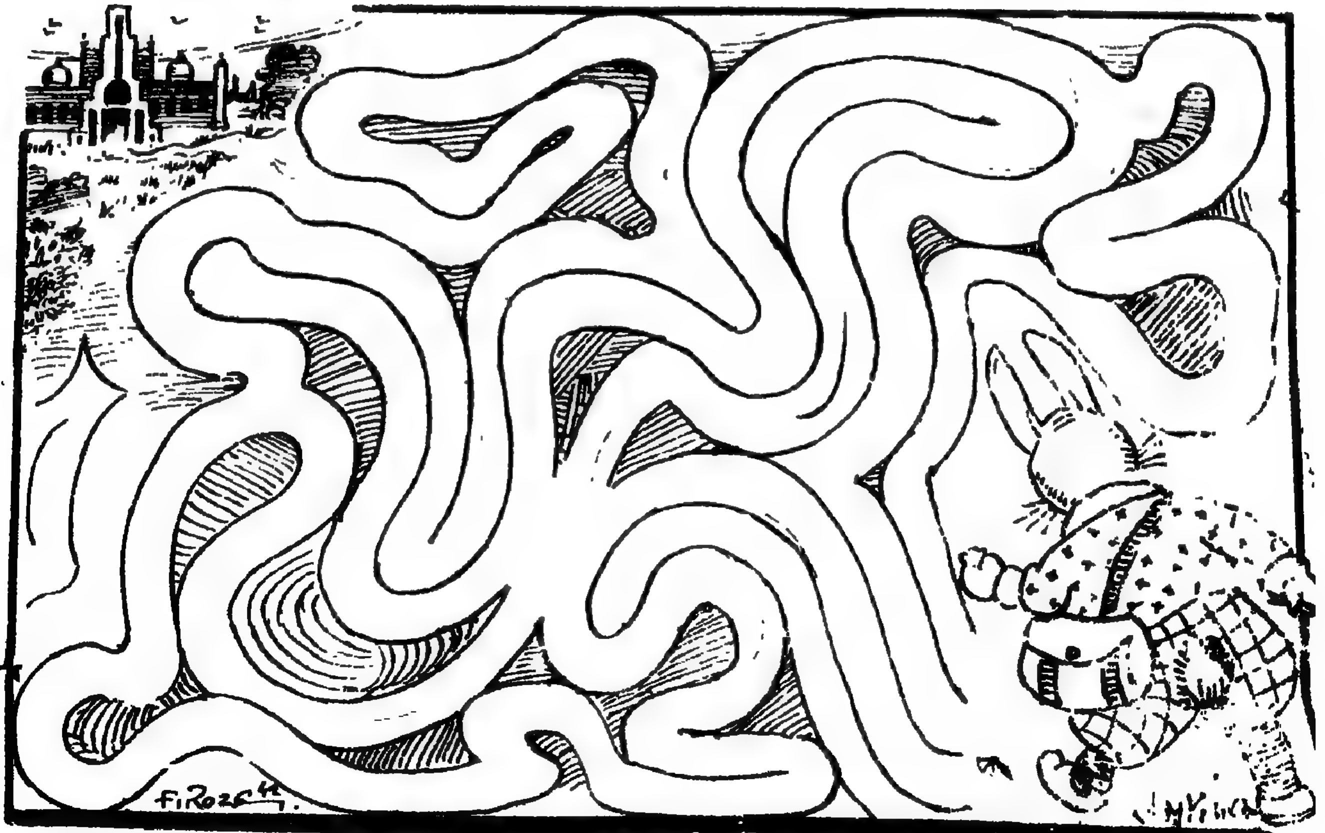
دیکھو یہ ننھی سی سوئی ہے لیکن تمھیں یہ بتایا جائے کہ اس کی تیاری میں بہت کافی وقت اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے تو تمھیں یقین نہ آئے گا۔ سوئی بنانے کا کام کم سے کم بائیس حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان میں سے بہت سے کام تمھاری بہن یعنی عورتیں کرتی ہیں اُن کی اُنگلیاں اس کام کے لئے بہت موزوں ہوتی ہیں۔

سوئی باریک فولادی تار سے بنائی جاتی ہے یہ تار خاص طور پر سوئیاں بنانے کے لئے تیار کیا جاتا ہے اس تار کے کوئی دو سوئیوں کی برابر لمبے ٹکڑے کئے جاتے ہیں پھر انھیں گرم کر کے سیدھا کر لیا جاتا ہے پہلے کاریگر ہاتھوں سے نوکیں بناتے تھے چند سوئیاں چمٹے سے پکڑ کر سان پر گھستے تھے۔ ایک اچھا کاریگر دن بھر میں ہزاروں سوئیوں کی نوکیں بنا لیتا تھا مگر اس میں ایک خرابی تھی فولاد اور پتھر کے ننھے ننھے ریزے سانس کے ذریعے پھیپھڑوں میں چلے جاتے تھے اور کاریگر دق اور سل کا شکار ہو جاتا تھا اس لئے اب یہ کام مشین کرتی ہے۔ مشین کے ذریعے ایک وقت میں سو سوئیوں کی نوکیں تیار ہو جاتی ہیں۔ یہ تار کے دونوں طرف بنائی جاتی ہیں۔ دونوں طرف نوکیں تیار ہو جاتی ہیں تو تار کے بیچ کے حصے کو مشین کے ذریعے دبلتے ہیں اس طرح سوراخ والا حصہ دب کر چپٹا ہو جاتا ہے یہ کام کبھی کبھی کاریگر ہاتھ سے بھی کرتے ہیں۔

اب اس دبے ہوئے یا چپٹے حصے میں سوراخ کیا جاتا ہے یہ کام عورتیں کرتی ہیں۔ سوراخ کرنے کے لئے مختلف قسم کی مشینیں ہوتی ہیں۔ پہلے سوراخ بھی ہاتھ ہی سے کرتے تھے اور ایک دن میں بیس سے لے کر پچیس ہزار سوئیوں میں سوراخ کر لیتے تھے۔ مگر مشین اس سے بھی کم وقت میں کئی گُنا کام کر لیتی ہے۔

اِن دُہری سوئیوں کو ایک تار میں پرو لیا جاتا ہے اور سوئی کی آنکھ یا سوراخ کے کھردرے پن کو دور کیا جاتا ہے۔ مشین ہی کے ذریعے انھیں بیچ میں سے توڑ دیتے ہیں پھر سوراخ یا آنکھ کے نچلے حصے کو گول بناتے ہیں۔ لیجئے صاحب سوئی تیار ہو گئی مگر ابھی یہ استعمال کے قابل نہیں ہوئی، ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ سوراخ کے اندرونی حصے کا کھردرا پن دور کرنا ہے اور سوئیوں کو صاف ستھرا بنانا ہے۔ سوئیوں کو ایک کھردرے تار میں پرو کر اِدھر سے اُدھر خوب

بلاتے ہیں۔ اس طرح اندر کا حصہ بھی خوب صاف ہو جاتا ہے۔ پھر انھیں ایک خاص حد تک گرمی پہنچائی جاتی ہے تاکہ خوب مضبوط ہو جائیں۔ پھر انھیں ٹھنڈا کیا جاتا ہے اب یہ بالکل تیار ہو گئیں۔ تم انھیں استعمال کر سکتی ہو مگر ابھی نہیں۔ پہلے انھیں صاف تو کر لینے دو نہیں تو کالی کالی بری معلوم ہوں گی۔ ہاں تو انھیں دوائیوں میں ڈال کر اس طرح جلا دیتے ہیں کہ بالکل سفید نکل آتی ہیں پھر دوسری دوائیوں کے ذریعے ان میں چمک پیدا کی جاتی ہے۔ اب یہ بالکل تیار ہیں۔ انھیں گننے اور پیک کرنے کا کام بھی مشین سے لیا جاتا ہے۔ گراموفون کی سوئیاں اور بڑے بڑے سوئے بھی اسی اصول پر بنائے جاتے ہیں طریقے ذرا مختلف ہوتے ہیں۔ یہ سوئیاں سال میں لاکھوں کروڑوں ہی تو بنتی ہوں گی، مگر ان کی مانگ ہے کہ دن پر دن بڑھتی ہی جاتی ہے آخر یہ لاکھوں، کروروں سوئیاں کہاں چلی جاتی ہیں۔ ننھی بہن تم تو خیر کیا کوئی سمجھ دار لڑکی ہی اس پہیلی کو بوجھ سکتی ہے۔ اماں بولیں "اے چل ہٹ بڑا آیا پہیلی بوجھنے والا اتنی دیر میں دماغ چاٹ لیا۔ جاؤ بیٹی ننھی پکانے ریندھنے کی فکر کرو۔ شام ہونے کو آئی +



ننھا انھیں دیکھو راستے کی تلاش میں پریشان کھڑے ہیں۔ اسکول کو دیر ہو رہی ہے پر کیا کریں۔ بے چارے جس راستے سے جاتے ہیں ہر پھر کے وہیں آ جاتے ہیں۔ تم ذرا ان کی مشکل آسان کر دو۔
(فیروز آرٹسٹ)



بجلی کا کڑکا

مشتاق احمد بی اے علیگ

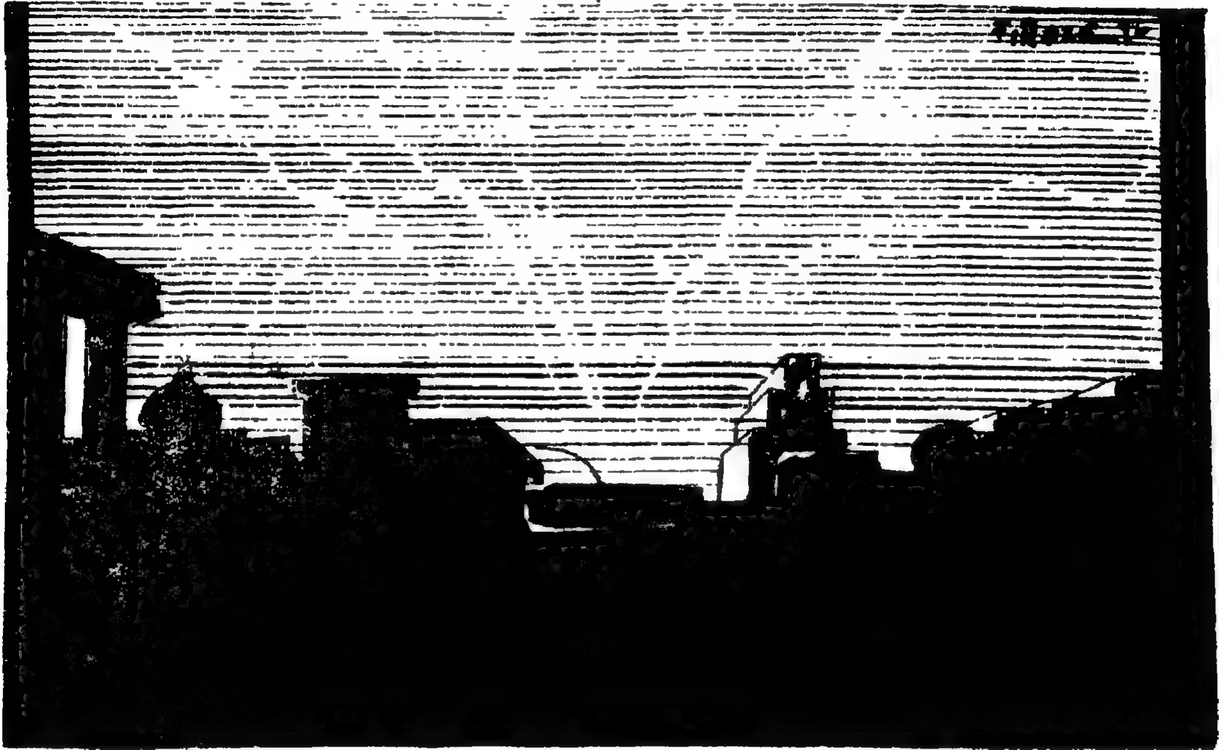
شام کا وقت تھا، میں اور بدر الدین صاحب کمرے میں بیٹھے تھے آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں گڑگڑاہٹ شروع ہو گئی۔ کوندا بھی ہونے لگا۔ بدر الدین صاحب ذرا کم زور دل کے آدمی ہیں۔ اس لگاتار گڑگڑاہٹ سے وہ کچھ پریشان ہونے لگے۔ ویسے بھی گھنگور گھٹا کی وجہ سے اندھیرا برابر بڑھتا ہی جاتا تھا اور بادلوں کی گرج کے علاوہ ہر طرف سناٹا تھا۔ میں نے سوچا انھیں باتوں میں لگاؤں دل بہل جائے گا۔ ان سے کہا "ارے بھئی بدر صاحب آپ خواہ مخواہ گھبرا رہے ہیں۔ بادل کی گڑگڑاہٹ بھی کوئی ڈرنے کی چیز ہے۔ اصل میں آپ کو اس کی وجہ معلوم نہیں ہے ورنہ کبھی پریشان نہ ہوتے دیکھئے میں آپ کو شروع سے سمجھاؤں ہمارے سروں پر جو یہ بادل منڈلاتے رہتے ہیں ان میں سے اکثر بجلی سے بھرے ہوتے ہیں۔ بھاپ کے چھوٹے چھوٹے قطرے (جن سے بادل بنتا ہے) جب مل کر ایک بڑا قطرہ بنا لیتے ہیں تو ان کے ساتھ ساتھ بجلی کی طاقت بھی بڑھتی جاتی ہے مثلاً اگر آٹھ چھوٹے چھوٹے قطرے مل جائیں تو اُن کا حجم بس دُگنا ہو جائے گا مگر ان میں بجلی کی طاقت کوئی آٹھ گنی ہو گی۔ اس طرح بادل کا ایک دل کا دل جو چھوٹے چھوٹے لاتعداد قطروں سے مل کر بنتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ بجلی کا ایک خزانہ ہوتا ہے۔ جب یہ بادل ایک دوسرے بادل کے پاس سے ہو کر گذرتا ہے (جس میں ایک دوسری قسم کی بجلی بھری ہوتی ہے) تو ایک تیز لپک کے ساتھ ایک شعلہ خارج ہوتا ہے اسی کو ہم بجلی کہتے ہیں۔ بدر صاحب کہنے لگے "آپ تو الٹا کہنے لگے یہ بتلایئے کہ یہ خوفناک گرج کیوں ہوتی ہے جس سے دل دہلنے لگتا ہے۔ میں نے کہا "دیکھئے پھر آپ نے میری بات کاٹی، یہ عادت آپ کی کبھی نہیں جائے گی۔ دیکھئے بجلی کبھی تو ایک بادل کے ٹکڑے سے دوسرے بادل میں داخل ہوتی ہے۔ کبھی ایک بادل کے ٹکڑے سے نکل کر زمین میں جا سماتی ہے۔ یہ بجلی کا شعلہ اپنے راستے کی ہوا کو اتنا گرم کر دیتا ہے اتنا گرم کر دیتا ہے کہ وہ خوب پھیل جاتی ہے۔ اس کے پھیلنے سے جو جگہ خالی ہوتی ہے اُس کو بھرنے کے لئے آس پاس کی ہوا پوری تیزی سے دندناتی ہوئی آتی ہے ہوا کے اس طرح ہجوم یا رش کرنے یا تیز دوڑنے سے زبردست آواز پیدا ہوتی ہے۔ اُسی کو آپ کڑک کہہ لیجئے گڑگڑاہٹ کہہ لیجئے یا گرج کہہ لیجئے۔

اس شعلے کا راستہ چھوٹا اور سیدھا ہوتا ہے تو بس ایک دھیمی سی آواز سنائی دیتی ہے لمبا اور پیچ دار ہوتا ہے تو آواز کا ایک سلسلہ ہمارے کانوں میں پہنچتا

رہتا ہے۔

ہمارے ہندوستان میں بجلی کی گرج زیادہ سننے میں نہیں آتی۔ پھر بھی سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ایک گھنٹے میں اوسطاً ایک ہزار آٹھ سو بار۔ دُنیا میں کہیں نہ کہیں بجلی چمکتی رہتی ہے۔ یوں تو طوفان میں ہر وقت بجلی

۱۱۰۰ فٹ فی سکنڈ۔ آپ گھڑی لے کر بیٹھیے اور بجلی کے چمکنے کے بعد سکنڈ گنتے رہیے اس سے آپ کو ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو جائے گا کہ بجلی چمکنے کے کتنے سکنڈ بعد آواز آپ کے کانوں تک پہنچتی ہے اور ہاں ایک بات اور معلوم ہوگی بجلی کی چمک اور اس کی کڑک کے درمیان جو وقفہ ہے اگر وہ



طوفان چمکتی ہوئی بجلی کے ساتھ دنیا میں ہر جگہ آتا ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ سال بھر میں ۱۶ ملین طوفان آتے ہیں یعنی ایک دن میں ۴۴۰۰۰

گرنے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ لیکن ہمیں آپ کو زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے اس لئے بجلی کے شعلوں کی لپک زمین تک ذرا کم ہی پہنچتی ہے اور بدر صاحب کبھی آپ نے اس پر بھی غور کیا کہ بجلی کی چمک ہمیں پہلے نظر آتی ہے اور گرج بعد میں سُنائی دیتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بجلی کی رفتار ایک سکنڈ میں ۱۸۶۰۰۰ میل ہے اور ہوا کی کل

زیادہ ہوتا جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ طوفان بھی کم زور ہوتا جاتا ہے اگر کم ہوتا جاتا ہے تو پھر گویا طوفان ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔

بجلی کی چمک کبھی کبھی ہمیں بہت دیر تک نظر آتی ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ صرف ہماری نظر کا دھوکا ہے۔ مگر بہت سے سائنس دانوں نے مذکورہ تجربے

کے بعد یہ بتایا ہے کہ یہ چمک سچ مچ اتنی ہی لمبی ہوتی ہے جتنی ہمیں نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی تو بجلی کا شعلہ پانچ میل لمبا ہوتا ہے۔ ایک اوسط درجے کے بجلی کے شعلے میں بھی انتہائی طاقت ہوتی ہے یوں سمجھیے کہ ایک ایسا شعلہ ایک .. ۲۰۰ وزنی ریل کو پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلا سکتا ہے۔

[illegible] بجلی کے شعلے [illegible] [illegible] لمبے [illegible] [illegible] رہتے ہیں [illegible] اُن کی قوت [illegible] گھوڑوں کی طاقت سے کہیں زیادہ ہے (وہ بھی اگر گھوڑے دن رات کام کرتے رہیں) یہ طاقت اس طاقت سے زیادہ ہے جو آبشار نیاگرا سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ بجلی کا ایک میل لمبا شعلہ پیدا کرنے کے لئے ۵۰ لاکھ سے زیادہ بیٹریوں کی ضرورت ہوگی۔

بجلی کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم کی بجلی تو ایسی ہے کہ بہت تحقیقات کرنے پر بھی اس کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہ ہو سکا۔ سخت طوفان کی حالت میں جو شعلہ نظر آتا ہے اُسے کانٹے دار یا پیچ دار بجلی کہتے ہیں۔ یہ بجلی بظاہر زاویہ یا روہ بناتی ہوئی چلتی ہے۔ پرانے زمانے کے مُصوّر یا آرٹسٹ اس کی شکل بھی ایسی ہی بناتے تھے مگر حقیقت میں ایسی بجلی صرف ایک پیچ دار راستہ بناتی ہوئی چلتی ہے۔ بس جیسے کوئی دریا جس کی بہت سی شاخیں نکل رہی ہوں۔

بجلی کی ایک اور قسم ہے اُسے چادر یا حررمی کی بجلی کہتے ہیں۔ یہ بجلی بھی ایک طرح سے پیچ دار ہوتی ہے، مگر یہ بہت دُور (کوئی پچاس میل تک) کے طوفان میں جب چمکتی ہے تو اس کا عکس بادلوں پر پڑتا ہے۔

یہ بہت غنیمت ہے کہ سو میں کہیں ایک بجلی زمین تک پہنچ پاتی ہے۔ اس کا اثر درختوں یا بجلی کے تاروں کے ذریعے زائل کر دیا جاتا ہے۔ بہت سی عمارتیں بار بار بجلی کا نشانہ بن چکی ہیں مگر ان پر ایک تار لگا ہوتا ہے۔ بجلی اس تار کے ذریعے زمین میں گھس جاتی ہے اور ان عمارتوں کو بالکل نقصان نہیں پہنچتا۔

عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ بجلی ایک ہی چیز پر دوبارہ نہیں گرتی۔ مگر یہ بالکل بے بنیاد بات ہے

بجلی کی پانچ میل لمبی لیک یہ بالٹی مور کے ساحل پر چمکی تھی

تجربے اور مشاہدے سے معلوم ہوا ہے کہ ایک ہی چیز پر بار بار بجلی گری ہے۔ بدر صاحب میری باتیں بہت غور سے سن رہے تھے۔ کہنے لگے "بھائی آپ کی باتوں سے تو بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ اچھا یہ تو بتایئے کہ اگر آدمی طوفان میں گھر جائے تو کیا کرے" میں نے کہا طوفان میں درختوں کے نیچے کھڑا ہونا خطرے سے خالی نہیں اکثر کسی درخت پر بجلی گری ہے اور اس کے نیچے کھڑے ہوئے لوگوں کی جانیں ضائع ہو گئی ہیں۔ مگر کھلے میدان یا کھیت میں چلنا بھی خطرناک ہے خصوصاً جب دھات یا اس کی بنی ہوئی کوئی چیز بھی ساتھ ہو مثلاً پھاوڑا یا لوہے کے بنے ہوئے ڈنڈے کی چھتری وغیرہ

بچاؤ کا سب سے اچھا طریقہ تو یہ ہے کہ آدمی زمین پر چت لیٹ جائے۔ دھات کی بنی ہوئی چیزوں کو اپنے سے کم سے کم تین سو فٹ دور رکھے۔ اس سے بھی اچھا یہ ہے کہ کسی گھنی جھاڑی میں چھپ جائے مگر یہ جھاڑی درخت سے کم سے کم سو گز کے فاصلے پر ہو۔ یہ بات آپ کو عجیب معلوم ہو گی کہ بجلی نے اب تک ریلوں کا مزاج نہیں پوچھا اچھا ہاں جہاز اس کی زد میں آ چکے ہیں۔ مگر ایسے واقعات بہت کم، گویا نہ ہونے کے برابر ہیں۔

بجلی سے آپ کی طرح اس طرح ڈرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ مگر یہ بھی ہے کہ بچاؤ کے مناسب طریقوں کو نظر انداز بھی نہ کرنا چاہیئے۔ اگر آپ کی چارپائی پر تانبے کی رکابیاں رکھی ہیں اور آپ بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں یا میز پر چھری کانٹے رکھے ہیں تو خواہ مخواہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایک سائنسداں کا قول ہے کہ ان چھری کانٹوں کو بجلی نہیں کھینچ سکتی۔ اگر آپ کے نزدیک اس کا امکان ہے تو اس کا بھی امکان ہے کہ ایک مکھی اپنے پر مار کر کسی بڑے محل کو ہلا دے۔

مگر بعض لوگ اس وہم میں بھی مبتلا ہیں کہ جوتے کے تلے میں یا کوٹ پر ربر ہو یا سائکل اور موٹر پر سوار ہوں تو بجلی کا خطرہ نہیں رہتا۔ ایک پروفیسر کہتے ہیں یہ تو ممکن ہے کہ پانی کے قطرے کے برابر حصے سے آگ بجھ جائے لیکن ایسی ترکیبوں سے بچاؤ ناممکن ہے،، اول تو بجلی کی رفتار اتنی تیز ہوتی ہے پھر اس میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ یہ معمولی چیزیں اس کے لئے رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتیں۔



بجلی روک تار کی وجہ سے بجلی مکانوں کو نقصان نہیں پہنچاتی۔

اور سنئے بدر صاحب بجلی طرح طرح کی حرکتیں بھی کرتی ہے۔ اب سے کوئی چالیس بیالیس سال پہلے فرانس میں تین عورتیں کھیت کاٹنے کی ایک مشین کے پاس کھڑی تھیں۔ ایک پر بجلی گری وہ بے چاری تو وہیں کی وہیں بھسم ہو گئی باقی دو کچھ زخمی ہو گئیں، مگر ان کے کپڑے

تو کپڑے جوتا تک غائب ہوگیا۔

پچھلی بڑی لڑائی (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء) سے پہلے ایک طوفانی رات میں ویلس (انگلستان) کے کسی مکان پر بجلی گری۔ یہ چمنی کے راستے ہوتی ہوئی چولہے کے پاس آپہنچی۔ وہاں کچھ کوئلے پڑے تھے انھیں روشن کرکے غائب ہوگئی، چیشائر (انگلستان) میں ایک مکان پر بجلی گری۔ میز پر ایک برش پڑا تھا اس کے ایک ایک بال کو الگ الگ کرکے چلتی بنی۔ دیکھیں آپ نے بجلی کی ستم ظریفیاں۔ ------- اس کی ان عجیب وغریب حرکتوں کی کوئی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک طوفان میں کسی درخت کے نیچے چالیس بھیڑیں کھڑی تھیں۔ درخت پر بجلی گری اور بیس بھیڑیں ہلاک ہوگئیں۔ یہ بیس ایک ساتھ نہیں کھڑی تھیں۔ بلکہ سارے گلے میں پھیلی ہوئی تھیں۔

بجلی ہمیشہ اس راستے کو اختیار کرتی ہے جہاں اُسے کم سے کم مقابلہ کرنا پڑے۔ جب یہ چمکتی ہے تو ٹیڑھی ترچھی لکیر سی معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہوا میں جو سخت ذرے ہوتے ہیں وہ اس کے راستے میں حائل ہوتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بعض خاص خاص درختوں پر بجلی نہیں گرتی مثلاً انجیر، شہتوت، ساگوان وغیرہ لیکن ان میں سے ہر درخت پر بجلی گر چکی ہے۔ درخت جتنا اونچا ہوتا ہے اُسی قدر اُس پر بجلی گرنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ درختوں کے ایک جھنڈ میں سب سے اونچے درخت پر ہی بجلی گرے۔

جس درخت پر بجلی گرتی ہے وہ اکثر ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ پھٹ پڑتا ہے اس کی وجہ بھی سن لیجئے درخت کے اندر کا رس اور پانی گرمی کی وجہ سے بھاپ بن جاتے ہیں یہ بھاپ گیس کی شکل اختیار کرلیتی ہے اب اس کے پھیلنے کے لئے جگہ چاہیئے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ درخت پھٹ پڑتا ہے

بدر صاحب یہ سب باتیں بہت غور سے سن رہے تھے۔ بادلوں کی گرج کا ڈر اُن کے دل سے دور ہوگیا تھا۔ کہنے لگے: "بھئی آج تو آپ نے بجلی کے بارے میں بہت اچھی اچھی باتیں بتائیں۔ اب میں بجلی سے اتنا نہیں ڈروں گا۔ اب بجلی کا طوفان قریب قریب ختم ہوگیا تھا باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی میں نے ایک پان کھایا۔ پھر گھر کا دروازہ بند کیا لوٹ کر آیا تو بدر صاحب خراٹے لے رہے تھے ؎

(ایک انگریزی مضمون کو دیکھ کر لکھا گیا۔)

تتلی

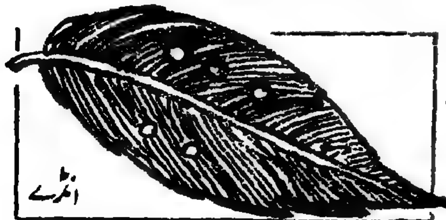


مسٹر شوکت علی۔ ابتدائی ششم۔ جامعہ نگر

جامعہ کے ابتدائی مدرسے (جامعہ نگر، دہلی) میں سائنس کے نصاب میں تتلی پر بھی کام کرنا ہی تھا۔ چھٹی جماعت کے بچوں نے اس کام میں بہت شوق سے حصہ لیا اور اتنی دلچسپی ظاہر کی کہ استادوں کو ان کا جوش دیکھ کر خوشی اور تعجب ہوتا تھا۔ بچے اکثر میدان میں نکل جاتے اور وہاں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تتلی کے انڈے لاتے۔ پھر انھیں باقاعدہ پالتے۔ انڈے سے لے کر تتلی بننے تک جتنے مرحلے طے ہوتے ہیں انھیں غور سے دیکھتے۔ تتلی کے سلسلے میں انھیں دوسرے کیڑوں اور پتنگوں کے جمع کرنے کا شوق ہو گیا اور انھوں نے بہت سے کیڑے جمع کر لیے۔ جامعہ کی عمارتیں کھلے میں ہیں۔ ان عمارتوں اور چند مکانوں کے علاوہ یہاں کھیت ہیں یا سرسبز میدان ہیں۔ اس ماحول سے بچوں کو بہت مدد ملی۔ اگر جامعہ کی عمارتیں شہر میں ہوتیں تو بچوں کو اپنے مقصد میں اتنی کامیابی نہ ہوتی۔ جب سب کام پورا ہو گیا تو تتلی اور دوسرے کیڑوں کی نمائش بھی ہوئی۔ یہ نمائش بہت کامیاب رہی۔ نمائش کا سب کام بچوں نے کیا تھا۔ نیچے ہم نمائش کی رپورٹ اور تتلی پر ایک مضمون شائع کرتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں بچوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ دیکھو تتلی والا مضمون کتنا اچھا ہے۔ یہ اس لئے اچھا ہے کہ عزیزی شوکت نے تتلی کی مختلف حالتیں خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ (ایڈیٹر)

تتلی

تتلی؟ ارے ہاں بھئی وہی جسے تم پھولوں کے پاس دیکھتے ہو! جسے تم بڑے شوق سے پکڑتے ہو! اور تمھیں پالنے کا بھی تو شوق ہے۔ اچھا تم سے اگر کوئی کہے کہ اس کے متعلق یہ تو بتاؤ کہ یہ کیسے انڈے سے نکلتی ہے اور اس کے بعد اس کے پر کیسے نکلتے ہیں؟ کیا؟ واہ بھئی واہ! انڈے سے نکلتے ہی پر بھی نکل آتے ہیں!! سنو! میں تمھیں بتاتا ہوں کہ یہ انڈے سے نکلتی ہے تو کیسی ہوتی ہے۔ پھر کیا ہوتی ہے اور پھر کیا؟

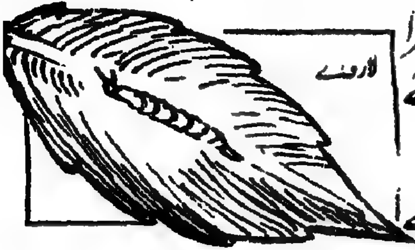


انڈے

سب سے پہلے تتلی مادہ کسی پودے کے پتے پر انڈے دیتی ہے۔ یہ انڈا اسفید رنگ کا اور ذرا لمبا اور بالکل

چھوٹا ہوتا ہے اگر تم غور سے دیکھوگے تو تمھیں اس پر سفید رنگ کی لکیریں سی دکھائی دیں گی ۔ یہ پتے سے چپکا ہوتا ہے ۔ یہ انڈا تقریباً تین دن تک اسی طرح رہتا ہے ۔ تیسرے دن اس کا رنگ بدلتا ہے اور ہلکے کالے رنگ کا ہو جاتا ہے ۔

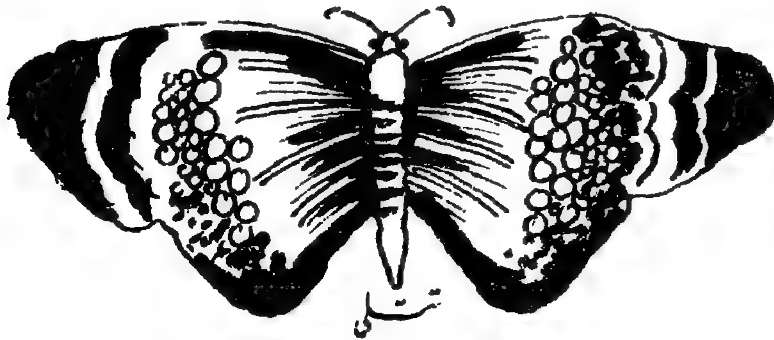
ارے یہ کیا ؟ تو بھئی تم کہہ رہے تھے کہ اس میں سے تتلی نکلتی ہے مگر اس میں سے تو ایک چھوٹا سا کیڑا نکلا ۔ یہ کتنا چھوٹا ہے سوئی کی طرح اور آدھے چاول کے برابر ۔ اچھا بتاؤ یہ کتنے دن تک ایسا یعنی کیڑا ہی بنا رہے گا ۔ نہیں یہ چودہ پندرہ دن تک بڑھتا رہے گا ۔ اس کا رنگ ہرا ہے اور کہیں کہیں دوسرے رنگوں کے دھبے بھی ہیں ۔ اور ہاں اس کے رونگٹے تو دیکھو کتنے بڑے بڑے ہیں ۔ اور کھاتا بھی کتنا ہے خدا کی پناہ ! ہر دو دو تین تین گھنٹے کے بعد پتے ڈالنے پڑتے ہیں ۔ اچھا ہاں ! تو یہ چودہ پندرہ دن تک یوں ہی بڑھتا رہے گا ۔ پندرھویں دن جب تم دیکھوگے تو تمھیں یہ بہت سست معلوم ہوگا ۔ اس کے رونگٹے جو ہر وقت تنے رہتے تھے گر جائیں گے ۔ پھر یہ اپنے آپ کو پتے پر سر کے بل لٹکائے گا اور اپنی کھال اُتار دے گا اور پھر آہستہ آہستہ سمٹ جائے گا ۔



لو بھئی یہ اُس سے لٹک بھی گیا ۔ اپنے اُس پاس کیسی جھلّی منڈھ رکھی ہے ۔ اب یہ پیوپا بن گیا ہے ۔ دیکھنا اپنی بہن کو بندہ بتاکر دھوکا نہ دے دینا ۔ کیونکہ یہ ہے بھی بندے کی طرح ۔ یہ تقریباً ایک ہفتے تک اسی حالت میں رہے گا اور ساتویں دن اس کا رنگ بدلے گا ۔ لو یہ جھلّی ۔ پھٹی ! ایں وہ تتلی نکلی ۔ ابھی یہ اُڑ سکے گی نہیں کیونکہ اس کے پر آپس میں ملے ہوئے ہیں ۔ اور آہستہ آہستہ پر کھل جائیں گے اور دھڑ چھوٹا ہو جائے گا ۔



کیا کہا ! ارے بھائی سب سے پہلے پیوپے میں سے سر نکلا ۔ پھر دھڑ اور دم ۔ اور ہاں ایک بات اور سنتے جاؤ تم تتلی



کے کیڑوں کو پتے باقاعدہ دیا کرو نہیں تو جب یہ بھوک سے مجبور ہو جاتے ہیں تو اپنے سے کم زور ساتھی کو کھا لیتے ہیں

سمجھے تتلی کتنی منزلیں طے کر کے بنتی ہے!
جاؤ! ارے جلدی بھاگو!! اسکول کی تیاری کرو۔ ورنہ تمھیں دیر ہو جائے گی۔

کیڑوں کی نمائش

ہم لوگوں کے درجے میں تتلی کا عملی کام کرانے کا مضمون ہے جب یہ مضمون شروع ہوا تو لڑکوں نے تتلی کے انڈے دریوپے جمع کرنے شروع کئے۔ روزانہ ایک دو ایک دو نئی معلومات حاصل ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ اتنی معلومات حاصل ہوئی کہ ہم لوگوں کا ارادہ ہوا کہ ایک نمائش کرنی چاہئے۔ چنانچہ ہم لوگوں نے ایک نمائش کی۔ وہ نمائش لوگوں نے پسند کی اور رائے ہوئی کہ دوبارا کی جائے اس لئے دوسرے دن وہی نمائش اور دھوم دھام سے ہوئی۔ خاکر صاحب (شیخ الجامعہ) اور بہت سے استاد نمائش دیکھنے آئے۔ نمائش انصاری منزل کے سامنے تھی۔ انصاری منزل میں سیڑھیوں کے سامنے جو دو درتھیں اس پر احسان، عثمان، جمیل اور میری بنائی ہوئی تصویریں رکھی تھیں۔ بیچ میں خوردبین سے میں مچھر کے انڈے دکھا رہا تھا۔ دائیں طرف ششم اور پنجم کی میز تھی۔ بائیں طرف چہارم اور سوم کی میز تھی، سیڑھیوں کے آگے ایک بورڈ پر "بچوں کی نمائش" لکھا رکھا تھا۔ جب ذاکر صاحب میرے سامنے آئے تو میں نے پہلے انھیں ایک شیشی دکھائی جس میں پانی تھا اور پانی پر مچھر کے انڈے تھے۔ پھر میں نے دوسری شیشی دکھائی جس میں مچھر کے لاروے اور پیوپے تھے۔ میں نے ذاکر صاحب کو بتایا کہ یہ مچھر کا انڈا ہے اب اس میں سے ایک دن میں لاروا بنے گا۔ پھر ۹ یا ۵ دن میں پیوپا بن جائے گا۔ اس کے دو دن بعد یہ مچھر ہو جائے گا۔ یہ ایک مچھر دس آدمیوں کو کاٹ کر بیمار کر سکتا ہے۔ اس کی مادہ ہفتے میں سینکڑوں انڈے دیتی ہے۔

پیام برادری

پیارے بچیو اور بچو! نیا سال مبارک۔ خدا کرے تم پورے سال خوش و خرم رہو اور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرو۔

تم نے اپنا سالنامہ پڑھا۔ کہو کیسا ہے۔ کون کون سے مضمون پسند آئے اور کیا کمی رہ گئی؟ جو ہم سے پوچھو تو بڑی کمی تو یہ رہ گئی۔ بہت سے ضروری ضروری مضمون چھپنے سے رہ گئے۔ سائنس کی بہت سی دلچسپ باتوں اور چٹکلوں کے لئے جگہ نہ نکل سکی مگر بھئی آج کل کی حالت تو تم دیکھ رہے ہو کاغذ سونے کے بھاؤ بھی نہیں ملتا۔ ان حالات میں جو کچھ ہو گیا اسی کو غنیمت سمجھو۔

پچھلے مہینوں میں افریقہ میں اور روس میں لڑائی بڑی شدت سے جاری رہی۔ افریقہ میں جرمنی برابر پیچھے ہٹ رہا ہے ابھی کچھ دن ہوئے اس نے ترپولی بھی خالی کر دیا۔ انگریزوں کی آٹھویں فوج بھی اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ ٹیونسیا میں البتہ جرمن فوجیں زور دکھا رہی ہیں وہاں امریکن فوجوں نے انھیں پریشان کر رکھا ہے۔ افریقہ کی فرانسیسی فوجیں بھی اتحادی فوجوں سے مل گئی ہیں۔ جنرل گیرو اس فرانسیسی علاقے کے حاکم ہیں۔ اس فرانسیسی امداد سے اتحادیوں کو بہت تقویت پہنچی ہے۔

روس میں سردیوں کے آتے ہی کچھ پانسا سا پلٹ گیا ہے۔ اور روسی فوجوں کی بن آئی ہے۔ اب سے بہت دن پہلے جب نپولین نے روس پر حملہ کیا تو سردیوں ہی میں اس کی فوج تباہ ہوئی تھی۔ جرمنی کے سامنے یہ بات تھی اور اس نے سردیوں کے موسم کے لئے تیاری بھی کی ہوگی مگر قدرت کے سامنے کسی کا بس نہیں چلتا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ روس پورے طور پر لڑائی کے لئے تیار تھا اس کا اعتراف تو جرمنی کے سب سے بڑے ہوائی افسر جنرل گوئرنگ نے بھی کیا ہے۔ بات یہ ہوئی جس زمانے میں جرمنی اور روس میں صلح تھی۔ جرمنی نے اپنے کچھ فوجی ماہر روس کے ہتھیار بنانے والے کارخانے دیکھنے بھیجے ان ماہروں نے جرمنی واپس آکر کہا کہ خدا کے لئے روس کو نہ چھیڑا جائے اس کی تیاریاں بہت زبردست ہیں۔ مگر نہ جانے کس وجہ سے ہٹلر نے ان کی بات نہ مانی اور روس پر چڑھ دوڑا۔ شاید اس کے ذہن میں یہ بات ہوگی کہ اتنے میں دوسرے ملکوں سے نبٹیں گے روس اور بھی مضبوط ہو جائے گا اور کیا عجب ہے خود روس حملہ کر دے اور جرمنی پر فتح پائے۔ بہرحال اب تو صورت یہ ہے کہ روسی فوجیں آگے ہی بڑھتی چلی جا رہی ہیں اور جرمن فوجوں سے علاقے کے علاقے خالی کرا رہی ہیں۔ جرمن فوجوں کو سانس لینے کا موقع نہیں مل رہا ہے۔ اخباروں نے یہ خبر بھی اڑا دی ہے کہ ان حالات سے مجبور ہو کر ہٹلر اتحادیوں سے صلح کرنے کی فکر میں ہے اور غیر جانبدار ملکوں کو بیچ میں ڈالنا چاہتا ہے مگر جرمنی نے اس خبر

کو بے بنیاد دیا یا ہے۔ معلوم نہیں کون سی بات سچ ہے۔ جنرل گوئرنگ نے ابھی ۳۰ جنوری کو ایک تقریر کی تھی۔ اس موقع پر اتحادی ہوائی جہازوں نے برلن پر بمباری کی اور گوئرنگ کو ایک گھنٹے اپنی تقریر ملتوی کرنی پڑی۔

بحرالکاہل میں امریکن فوجیں جاپانیوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ مقابلہ سخت ہے مگر جاپانی ہر جگہ پیچھے ہٹ رہے ہیں اور اب ان کا وہ پہلے کا سا زور نہیں ہے۔ ہاں آسٹریلیا کو آج کل جاپانی حملے کا خطرہ زیادہ ہوگیا ہے۔ آسٹریلیا کے وزیر اعظم مسٹر کرٹن نے اتحادیوں سے مدد کی درخواست بھی کی ہے ویسے آسٹریلیا کی فوجیں بہت بہادری سے جاپانیوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔

جنوری کی آخری تاریخوں میں مسٹر چرچل وزیر اعظم برطانیہ، روزویلٹ صدر جمہوریہ امریکہ، جنرل ڈی گول اور جنرل گیرو، افریقہ میں ایک جگہ ہے کاسا بلینکا وہاں جمع ہوئے تھے۔ جنرل چیانگ کائی شیک صدر جمہوریہ چین اور ایم اسٹالن وزیر اعظم روس کو بھی دعوت دی گئی تھی مگر یہ اپنی فوجی ضرورتوں کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے یہاں ان بڑے بڑے لوگوں میں جو اہم باتیں طے ہوئی ہیں۔ وہ تو معلوم نہ ہو سکیں ہاں اخباروں نے یہ اندازہ ضرور لگایا ہے کہ اس سال اتحادی فوجیں یورپ میں جرمنی پر حملہ کریں گی۔

ہندوستان کے حالات میں کوئی خاص تبدیلی تو نہیں ہوئی ہاں جاپانی ہوائی جہازوں نے چاٹگام کے علاوہ کلکتے پر بھی کوئی سات ہوائی حملے کئے۔ اس سے وہاں کچھ افراتفری ضرور پھیلی مگر جب سے انگریزی اور امریکی ہوائی جہازوں نے چار پانچ ہوائی جہاز تباہ کر دئے ہیں اس وقت سے جاپانی ہوائی حملوں کی خبر نہیں آئی ہے۔ امریکی اور انگریزی ہوائی جہاز بھی اکیاب اور برما کی دوسری اہم جگہوں پر برابر ہوائی حملے کر رہے ہیں۔ اور جاپانیوں کو کافی نقصان پہنچا رہے ہیں۔

لڑائی کی وجہ سے چیزوں کی مہنگائی اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے لوگ کہتے ہیں کہ پچھلی بڑی لڑائی میں بھی یہ بات نہیں ہوئی تھی۔ اناج، ایندھن، کپڑا اور ہاں کاغذ غرض ضرورت کی ہر چیز کے دام کئی کئی گنا بڑھ گئے ہیں۔ حکومت نے بہت سی چیزوں کے بھاؤ مقرر کر دئے ہیں پھر بھی حالت سدھرنے میں نہیں آتی۔ آخر مجبور ہو کر حکومت نے گیہوں پر سے کنٹرول ہٹا لیا ہے اس کی وجہ سے گیہوں تو اب کہیں کہیں بازاروں میں نظر آنے لگا ہے۔ اصل میں یہ سب لوٹ کھسوٹ کرنے والے تاجروں کے ہتھکنڈے ہیں۔

ہندوستان میں پچھلی اگست کو جو گڑبڑ شروع ہوئی تھی وہ قریب قریب ختم ہی ہوگئی ہے مگر اس کا اثر کچھ نہ کچھ ضرور باقی ہے۔ خصوصاً بمبئی اور بہار کے علاقے میں۔ ۲۶ جنوری کو آزادی کا دن منایا گیا تھا اس دن کئی جگہ گڑبڑ ہوئی۔ بم بھی پھٹے۔ ویسے ہندوستان کی آزادی کا معاملہ ویسے ہی کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ مسٹر راج گوپال اچاریہ کی کوششیں بھی سست پڑ گئی ہیں۔ مسلم لیگ والے پاکستان پر اڑے ہوئے ہیں اور ہندو مہاسبھا والے اس کی انتہائی مخالفت کر رہے ہیں۔

پچھلے مہینے (جنوری) سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب کا دل کی حرکت بند ہو جانے سے اچانک انتقال ہوگیا۔ یہ اس مہینے کا ایک غیر معمولی حادثہ ہے۔ مرحوم پنجاب بلکہ ہندوستان کے بہت بڑے آدمی تھے لوگوں کو ان کی بہت سی باتوں سے اختلاف ہوگا مگر اس میں

شک نہیں کہ اُن کی ذات سے اُن کے صوبے کو بہت فائدہ پہنچا۔ اُنھوں نے اپنے صوبے والوں کی بھلائی کے لئے بہت سی اچھی اچھی تجویزیں منظور کرائیں۔ لڑائی کے سلسلے میں بھی انگریزوں کی بہت مدد کی۔ اُن کے اثر سے پنجاب کے بے شمار نوجوان فوج میں بھرتی ہوگئے۔ انکا خاندان کئی پیڑیوں سے انگریزوں کی اسی طرح مدد کرتا رہا ہے۔ خدا مرحوم کو جنت میں جگہ دے (آمین)

انگریزوں کی دعوت پر ترکی اخبار نویسوں کا ایک مشن ہندوستان آیا تھا۔ اس نے دہلی، پشاور، لاہور، کلکتہ وغیرہ کا دورہ کیا۔ اس مشن کا مقصد غالباً ہندوستان کا صحیح حال معلوم کرنا تھا مگر ملک کے خاص قومی خیال کے لوگوں سے ملنے کا اُسے موقع نہیں ملا اس لئے اُس کی معلومات ادھوری رہیں گی۔

(محمد حسین حسان)

معما نمبر ۳۳

اول انعام .... روپے

دوسرا انعام .... للعہ

ہر صحیح حل والے کو۔ ایک خاص انعام

۶	۵ غ	■	۴ ہ	ل	۳ ا	۲ س	۱ ر
ن	ا	ب	۸ ز	■	خ	و	۷ ش
	۱۰ ل	■	ا	■	ل	ا	۹ ک
■	ف	۱۲ ا	ر		۱۱ ا	■	■
۱۵	■	ہ	■	■	ص	۱۴ ر	۱۳ ب
	■		■	۱۶	■	و	۱۷ ن
	■	ا	۲۰ ن	ا	۱۹ ت	س	۱۸ د
■		ر	ا	ہ	۲۱ ا	■	ے

دائیں سے بائیں

۱۔ کس قدر خوشی کی بات ہے کہ آپ کا ...... اپنی عمر کے اٹھارویں سال میں داخل ہو رہا ہے۔

۵۔ اس میں دماغی کام کرنا مشکل ہے۔

۷۔ بچے بڑوں کے مقابلے میں ایسے ...... کے کپڑے پسند کرتے ہیں۔

۸۔ کہے انسان ایک جب سُن لے دو
کہ حق نے زبان ایک دی کان دو

۹۔ کترول ہونے کی وجہ سے ہر جگہ گیہوں کا یہ ہے۔

۱۰۔ آگ میں سخت سے سخت چیز ...... جاتی ہے۔ (الٹا)

۱۱۔ یہ اچھے اچھے مال داروں کو تباہ کر دیتا ہے۔

۱۳۔ اس سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

۱۷۔ سب سے بڑا شبہ ہے۔

۱۸۔ جاڑوں میں یہ ہم لوگوں کو سردی سے بچاتا ہے۔

۲۱۔ دلی کی یہ مشہور ہے۔

اوپر سے نیچے

۱۔ بُرے آدمی کی ایک خصلت۔

۲۔ سیر کو ...... سیر موجود ہے یعنی ایک سے ایک طاقتور موجود ہے۔

۳۔ حتی الامکان ہر شخص سے یہ برتنا چاہیے۔

۴۔ ۱۰ × ۱۰ × ۱۰

۵۔ غافل کے بے ترتیب حروف۔

۶۔ ایسا آدمی ہمیشہ دوسروں کا محتاج رہتا ہے۔

۱۲۔ جُرم کرکے ...... کرنا بڑی ہمت کا کام ہے۔

۱۳۔ یہ جس جگہ بھی رکھا جائے اسی جگہ کو اپنا گھر سمجھنے لگتا ہے۔

۱۴۔ حقیقت ہے کہ اس مُلک کے بہادروں نے دنیا پر اپنی طاقت کا سکہ بٹھا دیا ہے۔

۱۵۔ یہاں ایک ایسا لفظ لکھو جس کا اُلٹا اور سیدھا ایک ہی ہو۔

۱۶۔ اس سے خود نکلنا بڑا مشکل ہے۔

۱۹۔ اگر یہ درست ہے تو آدمی بھی تندرست ہے۔

۲۰۔ اُردو کے مصدر کی شناخت۔

معمہ نمبر ۳۲ کا صحیح حل

۶ ش	۵ ر	۴ ط	■	ر	۳ ب	۲ م	۱ ن
ج	ا	ن	۸ ا	■	د	ا	۷ ے
ا	ب	۱۱ و	■	۱۰ ہ	■	ر	۹ ص
ح	■	■	۱۳ خ	ر	۱۲ س	■	■
ت	۱۶ ل	ح	۱۷ ا	■	■	۱۵ خ	۱۴ ح
■	ٹ	■	ل	۲۰ و	۱۹ ص	۱۸ ا	■
۲۳ ک	۲۲ ا	■	ی	ل	و	۲۱ ک	■
ف	و	۲۴ ر	■	ی	م	و	۲۵ ق

قواعد

۱۔ حل کے ساتھ ایک آنے کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

۲۔ ایک سے زیادہ حل بھی بھیجے جا سکتے ہیں۔ چار حلوں کی رعایتی فیس ۳ر۔ آٹھ حلوں کی ۶ر ہے۔

۳۔ دونوں انعام تقسیم کر دیے جائیں گے قرعہ اندازی نہ ہوگی۔

۴۔ تمام حل ۱۵ مئی تک دفتر پیام تعلیم دہلی پہنچ جانے چاہئیں۔

۵۔ ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

۶۔ پیام تعلیم میں چھپے ہوئے کوپن کے علاوہ اور کوئی کوپن نہیں لیا جائے گا۔

۷۔ کسی کوپن میں کوئی حرف کٹا یا مٹا ہوا ہوگا، یا پنسل سے بھرا ہوا ہوگا تو مقابلے میں شامل نہ کیا جائے گا۔

۸۔ ایک لفافے میں ایک نام سے حل آنے چاہئیں۔

۹۔ چھوٹی ہ اور بڑی ھ کا فرق لازمی ہے۔

۱۰۔ پتہ: سب ایڈیٹر پیام تعلیم مکتبہ جامعہ دہلی، قرول باغ۔

صحیح حل فی کس ۱۲ر

(۱) ظہور الحق ۔ پیلی بھیت

(۲) ظہیر الحسن صدیقی ۔ لکھنؤ

(۳) سید اقبال رضا ۔ دہلی

(۴) سید نسیم رضا نقوی ۔ دہلی

(۵) مہاجر حسن ۔ دہلی

(۶) سید مصور حسن ۔ دہلی

ایک غلطی فی کس ۵ر

(۱) سید محمد رضوی ۔ ناندیر

(۲) محمد حسن خاں ۔ قائم گنج

(۳) وحید احمد ۔ ہری رام پور

معمّا نمبر ۳۳ کوپن نمبر

نام ....

پتہ ....

....

ٹکٹ ....

معمّا نمبر ۳۳ کوپن نمبر

نام ....

پتہ ....

....

ٹکٹ ....

معمّا نمبر ۳۳ کوپن نمبر

نام ....

پتہ ....

....

ٹکٹ ....

معمّا نمبر ۳۳ کوپن نمبر

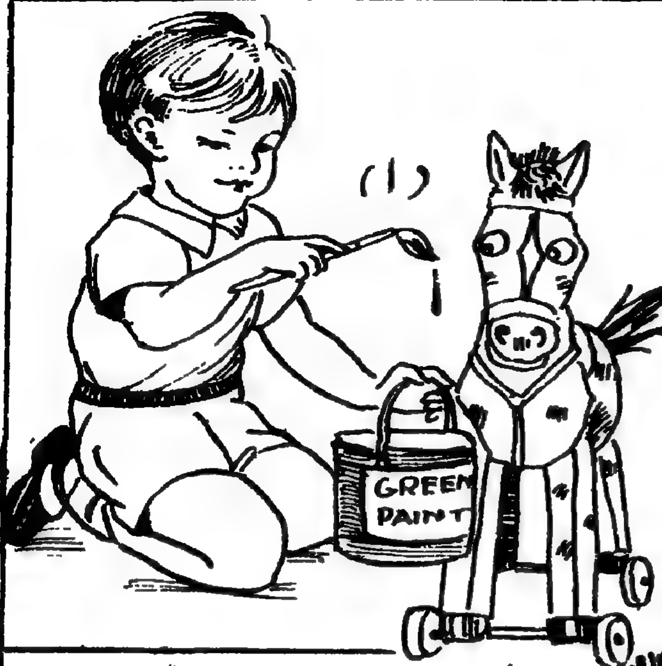
نام ....

پتہ ....

....

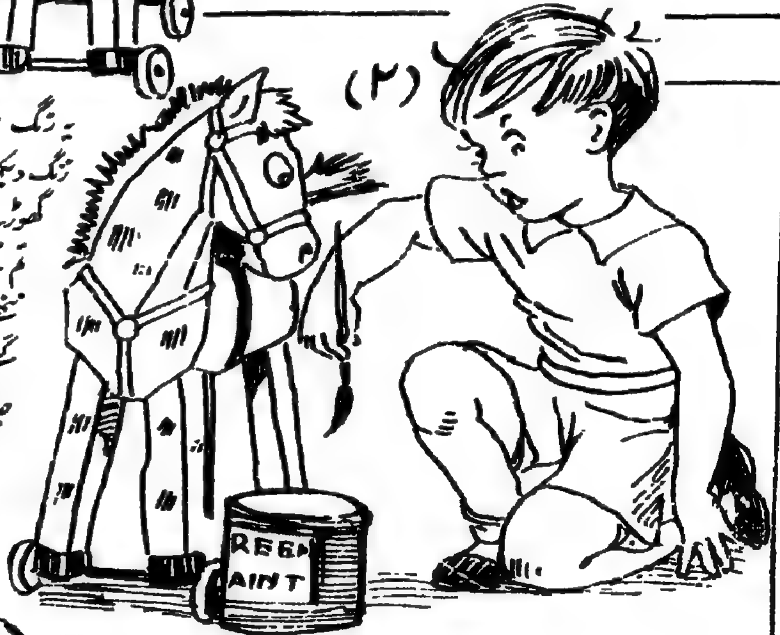
ٹکٹ ....

ننھے میاں کا گھوڑا



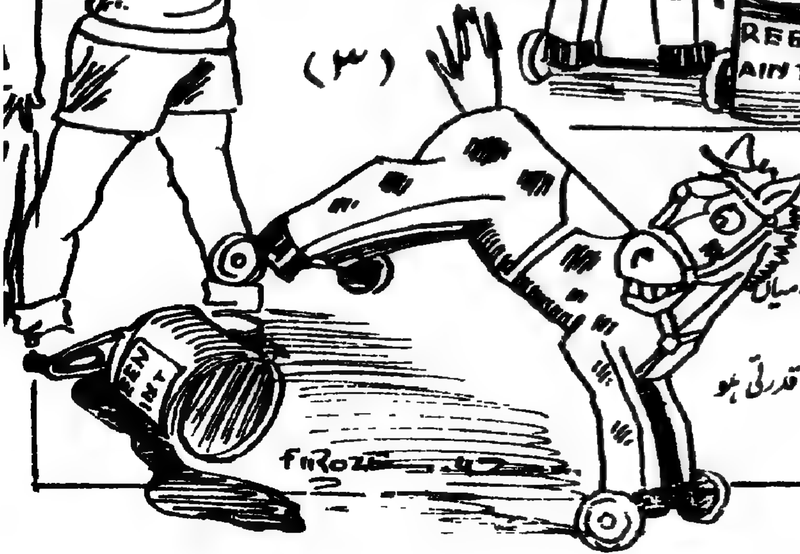
ننھے میاں اپنے ابا کے ساتھ ایک دن بازار گئے اور وہاں سے اپنے لئے لکڑی کا گھوڑا لائے۔ انھیں گھوڑے کا رنگ اچھا نہیں لگتا تھا۔ ایک دن رنگ کا ڈبہ اُن کے ہاتھ لگ گیا۔ اس میں ہرا رنگ بھرا تھا۔ اُنھوں نے سوچا لاؤ اس سے اپنے گھوڑے کو رنگ دیں بہت اچھا لگے گا۔ بس بیٹھ گئے رنگنے۔

(تصویر نمبر ۱)



یہ رنگ بہت گہرا تھا جیسے ہری مرچ۔ گھوڑے نے جو یہ رنگ دیکھا تو اُن کی طرف مُنہ کر کے بولا۔ ہن ہن ہن ننھے میاں گھوڑے اس رنگ کے نہیں ہوتے۔ کیا تم مجھے برادری سے نکلوا دوگے ننھے میاں یہ بات سُن کر ذرا گھبرا گئے۔ پھر دل میں سوچا کہ لاؤ جیسے جلدی رنگ دوں۔

(تصویر نمبر ۲)



گھوڑے نے جو یہ دیکھا کہ ننھے میاں مانتے ہی نہیں تو اُسے غصہ آگیا۔ اُس نے زور سے ایک دولتی چلائی ڈبے کا رنگ زمین پر بہہ گیا۔ اب تو ننھے میاں بہت ڈرے اور رنگائی کا خیال بالکل چھوڑ دیا۔

تم چاہو تو اس گھوڑے کو رنگ دو مگر رنگ قدرتی ہو

(تصویر نمبر ۳)




آپا جان مرحومہ



آپاجان ایک الوداعی دعوت میں
(نظر بندی سے پہلے)



آپاجان مرحومہ



مرحومہ آپاجان چلد ہواسوں کے ساتھ



جلد ۲۶ — مارچ سنہ ۴۳ء — نمبر ۳

فہرست مضامین

نمبر	عنوان	مصنف	صفحہ
۱	بچوں سے باتیں	ایڈیٹر	۶۶
۲	پاپ کی ناؤ	محمد شفیع الدین نیّر	۶۷
۳	پہیلی (نظم)	" " "	۷۰
۴	دریائے سندھ کی کہانی	پروفیسر محمد عبدالغفور	۷۱
۵	لوئی پاسچر	سید ابن حسن بی اے (آنرس) علی گڑھ	۷۴
۶	موجدوں کی کہانی	نورالحسن ہاشمی	۷۸
۷	پودے	مشتاق احمد بی اے	۸۱
۸	چندا ماموں		۸۵
۹	میکائیل فیراڈے	مرزا محمد حسن ام، اس، سی	۸۸
۱۰	سال گرہ (نظم)	مسز ہاشمی	۹۰
۱۱	ہم کیوں سوتے ہیں ؟	مشتاق احمد بی اے	۹۱
۱۲	ہم کیوں روتے ہیں ؟	محمد اکبر مسعود صدیقی	۹۴
۱۳	پیام یر ادری	ایڈیٹر	۹۵

پرنٹر پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی، محبوب المطابع پریس، دہلی



بچّوں سے باتیں

سالنامہ یا جنوری اور فروری کا پیامِ تعلیم ابھی تھوڑے دنوں پہلے تمھیں مل چکا ہوگا۔ اب یہ مارچ کا پرچہ تمھارے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے۔ اپریل کا پرچہ تقریباً تیار ہے وہ بھی بہت جلد تمھیں مل جائے گا۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ رسالہ جلد سے جلد وقت پر آجائے۔ مئی کے پرچے کے لئے شاید دو چار دن تمھیں انتظار کرنا پڑے پھر یہ صورت انشاء اللہ پیش نہ آئے گی۔

دو تین مہینے کی اس مدت میں پیامیوں کو انتظار کی جو تکلیف اُٹھانا پڑی اس کا اندازہ ان کے ہزاروں خطوں سے ہوتا ہے۔ ہمیں اُن کی اس تکلیف کا پورا احساس تھا مگر کیا کرتے بے بس اور مجبور تھے۔

لڑائی کی وجہ سے کاغذ کی کمی دن پر دن بڑھتی ہی جاتی ہے۔ بہت سے دس دس بارہ بارہ صفحوں کے اخبار مجبوراً کل چار صفحوں پر نکل رہے ہیں۔ بہت سے اچھے اچھے رسالے اس کاغذ کے قحط کی بدولت بند بھی ہوگئے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ بہت کوشش اور دوڑ دھوپ کے بعد پیامِ تعلیم کے لئے کاغذ کا انتظام ہوگیا ہے۔ یہ انتظام مستقل ہے، اور انشاء اللہ اب پرچہ مہینے کے مہینے پیامیوں کے پاس پہنچا کرے گا۔

اس پرچے میں زیادہ تر مضمون سالنامے ہی کے ہیں۔ سائنس دانوں کی کہانی اور موجدوں کی کہانی کا سلسلہ ابھی اور چلے گا۔

نئے مضمونوں میں دریائے سندھ کی کہانی تمھیں یقیناً پسند آئے گا، یہ اپریل کے پرچے میں پورا ہو جائے گا محترمی عبدالغفور صاحب لکچرر ٹریننگ کالج کے چند اور مضمون آئے رکھے ہیں یہ اگلے پرچوں میں چھپیں گے۔ اسی طرح اور دوسرے مضمون بھی۔



پاپ کی ناؤ

محمد شفیع الدین نیّر

نوجوانوں کا جوش ذرا ٹھنڈا ہوا تو ایک بوڑھا خرگوش اپنی جگہ پر کھڑا ہوا۔ اس نے کہا: "بھائیو! ہمارے نوجوانوں نے جس جوش کا اظہار کیا ہے۔ یہ بات بہت اچھی اور قوم کی بھلائی کے لئے مفید ہے۔ مگر ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ بندوقوں کی گولیوں سے مر جانا۔ اس سے کچھ نہ بنے گا۔ بدلا لینا ہے تو کوئی ایسی بات سوچنی پڑے گی جس سے ہم بدلا لینے میں کامیاب ہو سکیں۔"

بوڑھے کی تقریر کو سب نے پسند کیا۔ اس وقت پدم کو اپنے دوست یاد آگئے۔ اس نے کہا: "میرے تین دوست ہیں۔ فرفرام، غرغرام اور سرسرام۔ یقین ہے کہ وہ ہماری مدد کریں گے۔" بڈھے نے کہا: "اپنا مطلب ذرا کھول کر بیان کرو۔" پدم بولا: "میری ایک دوست فرفرام ہے اُسے بادِ پا بھی کہتے ہیں وہ چلتی ہے تو دن کو رات بنا دیتی ہے۔ بڑے بڑے درختوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔ سمندروں میں طوفان برپا کر دیتی ہے بڑی بڑی عمارتوں کو گرا کر برباد کر دیتی ہے۔ بہت دنوں کی بات ہے ہزاروں برس پہلے کی۔ یہ بابل کی دو قوموں عاد اور ثمود کو تباہ بھی کر چکی ہے۔ میرا دوسرا دوست غرغرام ہے اسے جل دیوی کہتے ہیں وہ کہیں دریا کی شکل اختیار کرتا ہے، کہیں سمندر کی، کہیں جھیل بن جاتا ہے، کہیں جھرنا۔ اس کا جی چاہے تو کشتیوں اور جہازوں کو نگل لے۔ اس کے سامنے راجا اور اس کے لشکر کی کیا حقیقت ہے۔ ایک دفعہ مصر کے فرعون کو نگل گیا جو اس راجہ سے بھی بڑا تھا اتنا بڑا کہ اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگا تھا۔

میری تیسری دوست سرسرام ہے جو اگنی دیوی کہلاتی ہے، اور اتنی زبردست ہے کہ اچھے اچھے اس کے آگے پانی بھرتے ہیں یہ اپنی آئی پر آئے تو بڑی سے بڑی عمارت کو ذرا سی دیر میں راکھ کا ڈھیر بنا دے۔ اس پر نہ تلوار کا اثر ہوتا ہے نہ بندوق کا۔ ایک دفعہ بھڑ جائے تو اس کا قابو میں آنا بڑا مشکل ہے۔"

بوڑھے نے کہا: "یہ ہے تو ان کی مدد ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے۔" آخر یہی طے پایا کہ راجا کا مقابلہ

کرنے کے لئے پدم کے دوستوں سے مدد لی جائے۔ پدم اسی وقت روانہ ہوگیا اور اپنے تینوں دوستوں سے راجہ کے ظلم وستم کا سارا حال بیان کیا وہ تو خدا سے چاہتے تھے کہ ایسا کوئی موقع آئے۔ فوراً ان کی مدد کرنے پر تیار ہوگئے۔

راجہ بھی شکار کے بعد ہیرا کو اپنے ساتھ لے کر جیت گڑھ واپس چلا گیا۔ اس نے حکم دیا کہ ہیرا کو کڑی نگرانی میں رکھا جائے۔ اور پھر پہلے کی طرح اپنی رعایا پر ظلم کرنے لگا۔

فرفرام، غزغزام اور سرسرام تینوں کے تینوں پدم کی مدد کے لئے تیار تو ہوگئے مگر یہ پدم کے ساتھ جائیں تو کس طرح۔ آخر یہ طے پایا کہ فرفرام ربڑ کے ایک چھوٹے سے پھکنے میں بیٹھ جائے، غزغزام ایک شیشی میں اور سرسرام ایک لوہے کی ڈبیا میں۔ اور پدم ان تینوں کو اپنے کان میں رکھ لے۔ وہ دو چار دوسرے خرگوشوں کو بھی اپنے ساتھ لے کر جائے اور ہیرا کو راجا کی قید سے چھڑا لائے اور راجا کو اس کے ظلم کی سزا دے۔

یہ سب کچھ ہوگیا تو پدم اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلا۔ چلتے چلتے رات ہوگئی۔ پدم ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گیا اس کے ساتھی ہیرا کی تلاش میں چلے۔ پھرتے پھراتے یہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں راجہ کے جانور رہتے تھے۔ ہیرا بھی ایک طرف لوہے کے ایک پنجرے میں اداس بیٹھا تھا۔ ایک خرگوش نے اس سے چپکے سے کہا:۔ "ہم تم کو لینے کے لئے آگئے ہیں"

ہیرا نے کہا! "کہیں ایسا نہ کرنا یہ راجا بڑا ظالم ہے اس نے اپنی رعایا تک کو تنگ کر رکھا ہے۔ بھلا ہم کس گنتی میں ہیں۔ ہماری سب کی جان مفت میں جائے گی"

خرگوش نے کہا "یہ باتیں ہم نے سوچ لی ہیں کل رات کو ہم تمھیں لینے آئیں گے تم یہ کرنا کہ جو نوکر تمھیں کھلانے پلانے آتا ہے اسے پرچا لینا تاکہ وہ پنجرے کو کھلا چھوڑ جائے اور تمھیں اس میں سے نکلنے میں کچھ دقت نہ ہو"

ہیرا نے کہا:۔ "اچھی بات ہے" دوسرے دن نوکر آیا تو ہیرا خوب اچھلا، خوب کودا اور نوکر سے کھیلنے لگا۔ نوکر بہت خوش ہوا۔ اس نے ہیرا کو پیار کیا وہ یہ سمجھا کہ اب یہ ہل گیا ہے۔ اس لئے پنجرے کا دروازہ بند کئے بغیر چلا گیا۔

دوسرے دن رات کے وقت پدم اپنے ساتھیوں کے ساتھ آیا اور ہیرا کو اپنے ساتھ لے کر چلا۔ ہیرا نے راجا کے ظلم کا حال جو اس نے سنا تھا پدم کو سنا دیا۔ یہ اس وقت آئے تو اس لئے تھے کہ ہیرا کو لے جائیں مگر اب انھوں نے کہا کہ راجا کو بھی اس کے کرتوت کا کچھ مزا چکھانا چاہئے یہ سوچ کر پدم نے پھکنے کا منہ کھول دیا۔ پھکنے کا منہ کھلتے ہی فرفرام نے ہلکی سی ایک پھونک مار دی۔ پھونک کا مارنا تھا کہ بڑے زور کی آندھی آگئی۔ کواڑ کھڑکھڑا اٹھے۔ جانوروں کے رہنے کی جگہ کے دروازے ٹوٹ گئے سب جانور نکل نکل کر ادھر ادھر بھاگے، ہاتھی، شیر، چیتے، ہرن

چیتل سب آزاد ہو گئے عجب ہلڑ مچا۔ ہر طرف سے چیخ پکار کا شور بلند ہوا۔ گویا قیامت آگئی۔ نوکر نے آکر دیکھا، تو خرگوش کا بچہ بھی غائب تھا۔ اب تو وہ بہت گھبرایا۔ اُسی وقت راجا کو خبر دی۔ راجا کو ہیرا کے نکل بھاگنے پر بڑا طیش آیا۔ وہ ہیرا کے قید سے چھوٹ جانے کو اپنی بے عزتی سمجھا۔ اُسی وقت فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ فوج کے ساتھ ساتھ راجا خود بھی ایک گھوڑے پر سوار ہو کے چلا اتنے میں صبح ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ بہت دور کئی خرگوش بھاگے جا رہے ہیں۔ اس نے کہا ہو نہ ہو وہ بچہ بھی انھی کے ساتھ ہے۔ اُس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر آگے بڑھایا۔ اس کا لشکر بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

ہوتے ہوتے بادشاہ خرگوشوں سے کچھ ہی دور رہ گیا۔ اب تو پدم اور اس کے ساتھی ڈرے۔ فرفرام نے کہا۔ "ڈرنے کی کیا بات ہے میں ابھی جاتی ہوں اور انھیں مزا چکھاتی ہوں" دم پھٹکنے سے بھرتی اڑی اڑاتی ہوئی نکلی اس کا نکلنا تھا کہ ایک طوفان آگیا۔ ہر طرف گرد و غبار چھا گیا۔ درخت جڑ سے اُکھڑ اُکھڑ کر گرنے لگے۔ اتنی گرد اڑی کہ دن رات بن گیا۔ راجا اور فوج کو راستہ چلنا دوبھر ہو گیا۔ سیکڑوں سپاہی پتھروں کے نیچے دب دب کر مر گئے راجا کو بھی ایک جگہ کھڑا ہونا اور بہت دیر تک وہیں کھڑا رہنا پڑا۔ آندھی کا زور ذرا کم ہوا تو راجہ آگے بڑھا، فوج بھی آگے بڑھی۔ اتنی دیر میں پدم بہت دور نکل گیا تھا مگر راجہ اور اس کے ساتھیوں کے گھوڑے بہت تیز تھے۔ اُنھوں نے اسے جلد ہی جا لیا پدم کے اوسان پھر خطا ہوئے۔ غزغرام نے کہا "اب مجھے چھوڑ دو" پدم نے شیشی کا مُنہ کھول دیا۔ مُنہ کا کھلنا تھا کہ شیشی میں سے پانی کا ایک چشمہ بہہ نکلا۔ دیکھتے دیکھتے وہ ایک بہت چوڑا دریا بن گیا۔ یہ اتنا چوڑا اتنا گہرا اور اس قدر چڑھاؤ پر تھا کہ راجہ کو اسے پار کرنے کی ہمت نہ ہوئی اس نے حکم دیا کہ کشتیاں لائی جائیں تھوڑی ہی دیر میں ہزاروں کشتیاں آگئیں اس عرصے میں پدم اور اس کے ساتھی پھر بڑی دور نکل آئے۔ راجہ اور اس کا لشکر کشتیوں پر سوار ہوا۔ گھبراہٹ میں بہت سی کشتیاں الٹ گئیں۔ ہزاروں سپاہی دریا میں ڈوب گئے۔ باقی سب سپاہیوں نے خدا خدا کر کے دریا پار کیا اور راجا کے ساتھ پدم کے پیچھے روانہ ہوئے۔ چلتے چلتے یہ ایسے جنگل میں پہنچے۔ جہاں چاروں طرف ہزاروں لاکھوں جھاڑیاں تھیں اور جھاڑیاں بھی سب خشک۔ پدم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو راجا کو اپنے قریب پایا۔ اب تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ قدم اُٹھانا دوبھر ہو گیا قریب تھا کہ راجہ ہیرا کو پکڑ لے اور پھر اُس کے ساتھی پدم اور دوسرے خرگوشوں کو بھی کہ سرسرام بولی: "آخر میں کس وقت کے لئے ہوں۔ مجھے چھوڑ دو" پدم کو گویا بھولی ہوئی بات یاد آگئی۔ اس نے جلد وہ ڈبیا کھول دی سرسرام کا نکلنا تھا کہ بس قیامت آگئی۔ پل بھر میں جھاڑیوں میں آگ لگ گئی، آن کی آن میں ساری جھاڑیاں دھڑ دھڑ جلنے لگیں اس غضب کی آگ لگی کہ اس کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے پدم اور اس کے ساتھی بھاگ گئے راجہ اور اس کی

ساری فوج آگ کے شعلوں میں گھر گئی۔

اب تو راجہ بہت گھبرایا۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ پاپ کی ناؤ بھر گئی تھی اس کو آخر ڈوبنا تھا۔ یہ ناؤ ڈوبی۔ پانی میں نہیں آگ میں۔

راجا نے اپنی آنکھوں سے اپنے ظالم سپاہیوں کو جلتے اور چیختے چلاتے دیکھا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح جان بچا کر بھاگے مگر کسی طرح نہ بھاگ سکا یہاں تک کہ اس کے کپڑوں میں بھی آگ لگ گئی۔ اتنے میں راجا کو ایک آواز سنائی دی: "راجا تو نے دیکھا!! غریب کی آہ خالی نہیں جاتی۔ یہ آہ اس طرح آگ بن کر پاپی کو بھسم کرتی ہے"۔ راجا نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ جواب بھی کیا دیتا! اسے اپنے کئے کی سزا مل گئی۔

پدم، ہیرا اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ پہاڑ پر پہنچا۔ اسے دیکھ کر سب خرگوش بہت خوش ہوئے۔ اور راجا کی تباہی کا حال سن کر اپنے جنگل میں آگئے اور مزے سے رہنے لگے

ریاست کے لوگ بھی راجا کے اس طرح سزا پانے سے بہت خوش ہوئے۔ اب انھوں نے ایسے شخص کو اپنا راجا بنایا جو بہت نیک اپنی رعایا کی بھلائی چاہنے والا اور اُن کے دُکھ سُکھ میں شریک ہونے والا تھا۔ پھر تو یہ سب خوشی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

پہیلی

محمد شفیع الدین نیّر




میں کیا ہوں یہ بتلاؤ تم
چمڑے کی بنی ہے کھال مری
کچھ کھاتی اور نہ پیتی ہوں
جس وقت اکڑتی تنتی ہوں
سب مجھ پر آفت ڈھاتے ہیں
میں کیا ہوں یہ بتلاؤ تم

پھر گھی اور شکر کھاؤ تم
ہے تیز بہت ہی چال مری
بس کھا کے ہوائیں جیتی ہوں
میں پھول کے کُپّا بنتی ہوں
سب ٹھوکر سے ٹھکراتے ہیں
پھر گھی اور شکر کھاؤ تم



دریائے سندھ کی کہانی

پروفیسر محمد عبدالغفور صاحب ایم اے۔

دارا پور کے مدرسے میں ساتویں درجے کے بچوں نے ایک انجمن بنائی اور اُن کا مقابلہ آٹھویں درجے کی سبھا سے ہوا بڑا کرا مقابلہ رہا۔ دونوں طرف کے بچے خوب خوب تیار ہو کے آئے مقابلے کا ڈھنگ بھی کچھ نرالا سا تھا۔ مخالف پارٹی کو حق تھا کہ دوسروں سے ایک نصابی مضمون میں جو چاہے سوال کرے۔ اور ان کا فرض تھا۔ کہ محض جواب ہی نہ دیں بلکہ اس موضوع پر ایک اچھا خاصا لکچر دے ڈالیں۔ گویا بمباری کا جواب بمباری نہیں تھا۔ بلکہ اس میدان میں اپنی چھاتا فوج اتار کر اس پر اپنا جھنڈا بھی لہرانا تھا۔ ہمارے ننھے جنگ جو آج کچھ اسی قسم کا ارادہ لے کر آئے تھے۔ آج کا موضوع جغرافیے کا مضمون تھا۔

احمد ساتویں درجے کا مانیٹر جس کا نام لڑکوں نے قباچہ رکھا تھا۔ کچھ بے کل سا نظر آرہا تھا۔ اس کی تیاری بڑی خطرناک معلوم ہوتی تھی۔ گویا سوالات کا کوئی ٹائم بم ہے۔ اب پھٹا کہ اب پھٹا۔ بار بار اُٹھنا چاہتا تھا۔ مگر رک جاتا تھا۔ ابھی تو دونوں طرف سے چھوٹے چھوٹے مرغوں کی جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ آخر کار احمد اُٹھا۔ اس وقت پورے درجے کی آنکھیں اپنے ہیرو پر لگی ہوئی تھیں۔

ایک ایسے لہجے میں جس میں ظاہرا تو کسر نفسی لیکن اس کی تہہ میں علم کا غرور تھا۔ اس نے کہا "حضرات ہم تو ایک چھوٹے درجے کے طالب علم ہیں۔ اور ایک چھوٹی سی بات آپ سے پوچھتے ہیں۔ بتا دیجئے۔ ہمارے ملک کو 'انڈیا' کیوں کہتے ہیں"

اس سوال پر کچھ سنسنی سی پھیل گئی پچھلی صف میں ایک انجان لڑکے نے فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اور بولا "آپ خود ہی بتائیے کہ بعض لوگوں کو قباچہ کیوں کہتے ہیں" اس پر احمد میاں کچھ بگڑ سے گئے۔ اور ڈپٹ کر بولے "اجی بس یوں ہی دانت نکال دئے۔ آتا ہو تو بتائیے۔ ورنہ ہار مان لیجئے" اس پر آٹھویں درجے کے کم زور لڑکوں کو تاؤ تو بہت آیا مگر صبر کر کے بیٹھ گئے۔ اس دن آٹھویں درجے کی لاج مدن نے رکھ لی تھی۔ ورنہ اسکول کی سب سے اونچی جماعت سارے قصبے میں عمر بھر کے لئے بدنام ہو جاتی۔

مدن بولا "اجی یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی۔ اپنے دیس کا نام اور یہ بھی نہ جانے کہ کہاں سے نکلا جب یونانی حملہ

آ در ہندوستان میں پہنچے تو دریائے سندھ کے کنارے ٹھٹک گئے۔ اتنا عظیم الشان دریا دیکھتے تھے۔ اور حیران تھے۔ اس سے پہلے انھوں نے مصر فتح کیا تھا اسے دریائے نیل کا ملک کہتے تھے۔ اس نئے دیس کا نام انھوں نے سندھو رکھا تھا جو بگڑ کر انڈوئی (INDOI) یا انڈیا ہوگیا۔

اتنے میں ایک صاحب بولے "ارے بھئی ہمیں تو اس کا پتہ بھی نہ تھا کہ سندھ اتنا اہم دریا ہوگا۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ دریا لداخ اور کشمیر کی چٹانوں میں چھپتا چھپاتا چترال کی تنگ وادیوں میں سمٹا سمٹاتا پنجاب کی مغربی سرحد سے ہوتا ہوا سندھ کے صحراؤں سے دبے پاؤں سرکتا سرکاتا آخر کار سمندر میں جاکر اپنا منہ چھپا لیتا ہے۔ انسانوں کی بستی سے کتنا دور۔ ان کے تمدن سے کتنا بیگانہ۔

اس پر مدن مسکرایا اور کہنے لگا "واہ صاحب۔ دریائے سندھ اور انسانی تمدن سے دور۔ یہ بھی ایک ہی رہی۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ دریائے سندھ کا تمدن دیس کا سب سے پرانا تمدن ہے۔

ساتویں درجے کا روشن بولا "غلط اور بالکل غلط۔ سب سے پرانا تمدن آریا لوگوں کا ہے۔"

مدن بولا "اجی پرانی کتابوں کے چکر میں نہ رہیے۔ اب تو تاریخ بہت کچھ بدل چکی ہے۔ جتنے سال آج سے آریا لوگوں کو ہندوستان میں ہوچکے ہیں اتنے سال آریا لوگوں سے بھی پہلے دریائے سندھ کی وادی میں پھولتا پھلتا شاداب تمدن تھا۔ بڑے بڑے آباد شہر۔ خوب صورت گھر شاندار پبلک غسل خانے جن میں گیلریاں اور ہال بھی بنے ہوئے تھے اور تھے کہاں یوں کہئے کہ بنے ہوئے ہیں۔ اگر اعتبار نہ آئے تو دریائے سندھ کی وادی میں موہنجو درو 'MOHENJODARU' کی کھدائی جاکر اپنی آنکھ سے دیکھ لو۔ اور سچ پوچھو تو اس نئی معلومات نے ہندوستان کو تاریخ کی دنیا میں بڑا اونچا درجہ دے دیا ہے اور اسے بابل اور مصر کے پرانے تمدن کی صف میں لاکر برابر کھڑا کر دیا ہے اور بات تو یہ ہے کہ حملہ آور قوموں کا پہلا پڑاؤ تو یہی دریا تھا۔"

"تو کیا آریا لوگوں کا کاروان بھی پہلے پہل اسی کے کنارے پر اترا ہوگا؟"

"جی ہاں۔ کیوں نہیں۔ رگوید میں ہی سندھ کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کا بہاؤ سب دریاؤں سے بڑھ کر ہے۔ اے سندھ دریا تیری تمام ندیاں تیرے پیچھے دوڑی آتی ہیں تو ایک جنگ جو راجا کی طرح اپنی فوج کے درمیان ہے۔ اپنے لشکر کے دونوں بازوؤں کو پیچھے لیے ہوئے تو اپنے بہاؤ کے زور میں اوروں سے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔"

"ارے صاحب معلوم ہوتا ہے کہ اس دریا کا بہاؤ تو غضب کا ہوگا۔"

"اجی آریا لوگوں نے ہی اس کا لوہا نہیں مانا۔ بلکہ اس کے سامنے تو بڑے بڑے حملہ آور چیں بول گئے۔ دریا کیا ہے یوں سمجھو کہ ہندوستان کے قلعے کے لیے یہ ایک

مغربی خندق ہے لبالب پانی سے بھری ہوئی اور پانی بھی
وہ ڈنڈ مچاتا ہوا کہ بڑوں بڑوں کا پتّہ پانی ہو جائے۔ میں
تو سمجھتا ہوں کہ اس دریا کے ہمارے دیس پر بڑے احسان
ہیں۔ اس نے ہمیں سب سے پرانا تمدّن دیا اور دنیا کے
سب سے خوں خوار حملہ آور کو روکا۔"

"وہ کون؟"

"چنگیز خاں جس کی دہشت سے ایک دنیا کانپ
اٹھی تھی۔ اس کا دل اس دریا کی موجوں کو دیکھ کر کانپ
اٹھا تھا۔"

"وہ کیسے؟"

"چنگیز خاں اور اس کے منگول سردار خوارزم کے
بہادر اور من چلے بادشاہ جلال الدین خوارزم شاہ کا
پیچھا کرتے ہوئے پہنچے تو اسے سندھ کے کنارے پر آلیا
خوارزم شاہ ایک جاں نثار گھوڑے پر سوار تھا آگے
دریا اور پیچھے منگول سپاہ کا طوفان۔ جلال الدین نے
خدا کا نام لے کر اپنا گھوڑا دریا کی موجوں میں ڈال دیا۔
پیچھا کرنے والے منگول جب کنارے پر پہنچے تو ٹھٹک کر
رہ گئے۔ کسی کی ہمت نہ پڑی کہ جاں باز جلال الدین کے
پیچھے دریا میں گھوڑا ڈال دے۔ جلال الدین شیر کی طرح تیرتا،
موجوں کو چیرتا دریا پار کر گیا۔ کہتے ہیں چنگیز خاں آنکھوں
پر ہاتھ رکھے حیرانی کے عالم میں اس منظر کو تکتا رہا اور جب
جلال الدین دوسرے کنارے پر پہنچ گیا تو اس ہمت کو دیکھ
کر اس پر ایک عجیب جذبہ طاری ہوا۔ اس نے اسے پکار کر
کہا "ارے جواں مرد۔ دریا کے کنارے کے ذرا قریب آؤ
میرا جی چاہتا ہے کہ میں ایسے ہمت والے نوجوان کو ایک مرتبہ
اچھی طرح دیکھ لوں۔ جس نے اس طوفانی دریا کو ایسی ہمت
اور بے جگری سے پار کیا ہے۔ اس پر جلال الدین دریا کے
کنارے پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے بازو پھیلائے اور
اپنا سر جو اب تک کسی کے سامنے نہ جھکا تھا بلند کیا۔ چنگیز خاں
وہیں سے اپنے ملک کو لوٹ گیا۔ اور چنگیز خاں پر ہی کیا
منحصر ہے۔ اس نے ایک دفعہ سکندر اعظم جیسے فاتح اعظم کا
دل دہلا دیا۔ یہ تو معلوم ہی ہے نا کہ سکندر کشتیوں میں پنجاب
سے واپس گیا تھا۔"

"اجی حضرت بھلا کشتیوں میں آنے جانے کی
کیا ضرورت تھی؟"

بات یہ ہے کہ اس زمانے میں پنجاب کیا تھا یوں سمجھ
لو ایک اچھا خاصا ترائی کا جنگل تھا۔ اسی دریائے سندھ کے
کنارے پر بابر نے گینڈے کا شکار کیا تھا۔ اور اس دریا کے
کنارے اس کے ایک ساتھی مسعود کو گینڈے نے گھوڑے
سمیت ایک بھالے کی اونچائی کے برابر اچھال مارا تھا جس پر
اس کا نام مسعود گینڈا مار رکھ دیا گیا تھا۔ پنجاب کا ملک اور اس
میں گینڈا۔ تمھیں بھلا ایسا خیال بھی آ سکتا ہے۔ لیکن پہلے زمانے
میں جنگلات کی ایسی ہی کثرت تھی۔ اس لئے سکندر نے کشتیو
کے ذریعے سفر کرنا بہتر سمجھا۔ دریائے سندھ میں جوار بھاٹا بڑی
تیزی سے آتا ہے۔ اکثر نو فٹ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ یہ جوار بھاٹا
اس کی بعض کشتیوں کو بھنور میں لپٹا کر لے گیا اور چٹانوں پر دے مارا

(باقی)

لوئی پاسچر اور اس کے کارنامے

لوئی پاسچر فرانس کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا اِس کا باپ جوزف چمڑے کی رنگائی کا کام کرتا تھا۔ لوئی کی ماں اسی کارخانے کے قریب دریا اُس پار ایک باغ میں کام کیا کرتی تھی۔ ان دونوں میں محبت ہوگئی۔ اس محبت کا انجام دونوں کی شادی پر ختم ہوا۔ شادی کے بعد بھی ان کی محبت ایک ایسا نمونہ بن گئی کہ اِن کے بچے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ لوئی اسی گھرانے میں ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوا۔

لوئی کی تعلیم اربوئی قصبے کے ایک اسکول ایکول پرائمر میں ہوئی۔ پھر اُس نے وہیں کے کالج میں سلسلۂ تعلیم جاری رکھا۔ شروع کے سالوں میں اس نے بہت سے انعام حاصل کئے۔ لیکن اس کی قابلیت وہاں پھر بھی اوسط درجے کی تھی اور بالعموم وہ ایک سست رفتار لڑکا تھا اس زمانے میں وہاں کے ہیڈ ماسٹر ایم رومانٹ نے اس بچے سے دلچسپی لینی شروع کی۔ اُس نے یہ اندازہ کیا کہ اُس کی سستی کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس میں تحقیق و تلاش اور کھوج لگانے کا مادہ ہے۔ یہی وہ ہیڈ ماسٹر تھا جس نے اُسے ایکول نارمیل میں پروفیسر ہونے کی رغبت دلائی۔

اس درمیان میں پڑوس کے ایک تجربہ کار خوشی ڈاکٹر نے لوئی کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا، اس کی خواہش قابل تقلید زندگی نے لوئی کو محنتی اور مستقل مزاج بنا دیا۔ مُلک اور قوم کی خدمت کا جذبہ لوئی میں بدرجہ اتم پیدا ہوگیا۔ اب کتابیں اور مختلف قسم کے خیال لوئی کے لئے محض تفریح ہی تفریح نہ تھے بلکہ ملک کے بہی خواہوں کے کارنامے اور اُن کی تصویریں لوئی کے لئے ایک طرح سے اُستاد بن گئیں۔ اس شغل نے لوئی کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔

لیکن اس کا باپ دُوسری فکر میں تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ لوئی پیرس میں ایکول نارمیل کالج میں تعلیم پائے اور اس کو پروفیسری کا موقع ملے۔ لیکن پیرس جیسے دلکش اور خوبصورت شہر میں لوئی کو اطمینان و سکون نصیب نہ ہوسکا اس کا دل وطن کی یاد میں مُرجھایا رہتا۔ لوئی کی نگاہوں میں وطن کا ایک ایک ذرّہ چمک رہا تھا اور وہاں کے در و دیوار لوئی کو آواز دے رہے تھے۔ وہ اپنے چمڑے کے بدبودار مکان کو پیرس کے محلوں اور عطر میں بسی ہوئی گلیوں سے بہتر سمجھتا تھا۔ آخر وہ پیرس چھوڑ کر بھاگ آیا۔

اب سوائے اربوئی کالج کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن ایکول نارمیل کے خیالات اب بھی اس کو پریشان کئے ہوئے تھے۔ اس نے یہاں سخت محنت شروع کر دی اور اپنے ہمجولی

سے ۵۰ میل کے فاصلے پر بسینکن (BESANCON) کالج میں چلا گیا۔ یہاں اُسے ۲۰۰ فرینک سالانہ ملنے لگے۔ یہ ایکول نارمیل کی تیاری کی جگہ تھی۔ اُس نے یہاں جفاکشی اور محنت سے کام کیا۔ وہ اپنے ایک خط میں اپنی بہن کو لکھتا ہے " پیاری بہن سخت محنت کرو اور ایک دوسرے سے محبت کرو۔ جب آدمی کو محنت کی عادت ہو جاتی ہے تو ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ دنیا میں کامیابی کا دار مدار محنت پر ہے "

۱۸۴۳ء میں وہ پھر پیرس گیا تاکہ ایکول نارمیل کالج میں تعلیم حاصل کرنے کی کوئی صورت نکالے۔ اُس نے ایک فلسفے کے طالب علم چارل چیپس سے دوستی پیدا کر لی جو بعد میں بہت مفید ثابت ہوئی۔ اس سال لوئی ایک سائنس کے امتحان میں شریک ہوا لیکن کوئی ممتاز درجہ حاصل نہ کر سکا اس ناکامیابی سے وہ بددل نہ ہوا بلکہ اس کے اندر معلومات حاصل کرنے کی پہلے سے زیادہ خواہش پیدا ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے سال ۱۸۴۴ء میں اس امتحان کے لئے بیٹھا تو پوری جماعت میں چوتھا درجہ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد لوئی اور اس کا دوست چارلس برابر سائنس کی تجربہ گاہ میں مختلف تجربوں کی تحقیق کرتے رہے ۱۸۴۶ء سے ۱۸۴۸ء تک وہ برابر کیمیا کا مطالعہ کرتے رہے۔ ۱۸۴۸ء میں فرانس میں انقلاب ہو گیا۔ لوئی نے ملک کی خدمت کو علم پر ترجیح دی اور میدان جنگ میں کود پڑا۔ اس سال اس کی ماں کا انتقال ہو گیا اور وہ بہت رنجیدہ رہنے لگا۔ لیکن تحقیقات کا کام جاری رکھا۔

۱۸۴۸ء کے بعد سے لوئی پاسچر کی علمی تحقیقات کا ایک پورا باب کھلتا ہے جس نے فرانس کے بڑے بڑے سائنس دانوں کو ہکا بکا کر دیا۔

تارکول کا تیزاب ایک ایسی چیز ہے جو عام طور پر کاروبار میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اُس وقت تک تارکول کا تیزاب اور (RACEMIC ACID) بالکل نایاب چیزیں تھیں۔ ۱۸۵۲ء میں لوئی نے اس کی تلاش میں مختلف فیکٹریوں کا معائنہ کیا۔ وہ یورپ کی ان تمام جگہوں میں گیا جہاں تارکول صاف کرنے کی فیکٹریاں تھیں۔ ہر جگہ سے ناکامیابی ہوئی۔ لیکن ہمت اور استقلال کے ساتھ کوشاں رہا۔ بالآخر اُسے یقین ہو گیا کہ کسی کیمیادان نے اس وقت تک خالص تارکول کے تیزاب سے (RACEMIC ACID) نہیں پیدا کیا ہے نہ پیدا کر سکتے تھے۔ کئی ناکام کوششوں اور تجربوں کے بعد ۱۸۵۳ء میں اس نے اعلان کر دیا کہ وہ تارکول کے تیزاب سے (RACEMIC ACID) بنا سکتا ہے۔

TARTARIC ACID اصل میں ایک خمیری پیداوار ہے اور اس کی تلاش نے اسے بہت سے خمیروں کے متعلق دریافت کرنے کا موقع دیا۔ اس چیز کی تحقیق نے BOIT کے ذہن کو معطل کر رکھا تھا۔ اس نے متواتر ۳۰ برس تک کوشش کی لیکن ناکامیاب رہا۔ اب اس کی عمر ۷۰ برس کی ہو چکی تھی۔ لوئی پاسچر کو ہونہار پاکر اور کامیابی کی اُمید دیکھ کر ایک مرتبہ اُس نے لوئی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"میرے پیارے بچے میں نے ساری زندگی سائنس کی محبت اور تحقیق میں گذار دی۔ اب مجھے بے حد خوشی ہے

کہ تم میری کوششوں کو جاری رکھوگے اور اس کی کامیابی کا سہرا تمھارے سر رہے گا۔" اس سے پاسچر کے دل میں ایک تازہ جوش پیدا ہوگیا۔

۱۸۵۶ء میں اُس نے الکوہل کو اچھے سے بنانے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں ۱۸۵۷ء میں اُس نے لائل کے (SCIENTI FIC) انجمن کے سامنے (LACTIC ACID) کے خمیر پر ایک مضمون پڑھا اس مضمون میں لوئی نے کوئی نئی بات نہیں بتائی بلکہ بتایا کہ جیسے ہوئے دودھ میں ایک چیز زردی مائل پائی جاتی ہے اسے اگر اچھے دودھ پر جما دیا جائے تو وہ بھی کھٹا ہوجائے گا۔ یہ زردی مائل چیز بذات خود ایک زندہ چیز ہے جس کے علیحدہ رکھنے سے دودھ ہمیشہ میٹھا رہتا ہے۔ خمیر یعنی چیزوں کو گلانا اور سڑانا زندگی کی نشانیاں ہیں۔ یہ تلی چیز جو حقیقت میں مُردہ ہے اگر بے جان ہوا کے اندر کھلی رکھی جائے تو وہ بجنسہٖ اسی حالت میں بغیر کسی تغیر کے پڑی رہے گی۔ جراثیم بھی زندگی کے اس عام قانون سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ وہ بغیر دوسرے جراثیم کے پرورش نہیں پاسکتے۔

لوئی کے اس خمیری جراثیم کے انکشاف نے اس کے لئے ایک اور راہ کھول دی۔ اب وہ مختلف بیماریوں کے جراثیم کی تحقیقات کرنے لگا۔ ۱۸۶۵ء میں کالرا کی وبا مارسیلز سے پیرس آئی جس کے متعلق لوئی نے کافی معلومات بہم پہنچائی۔ پاسچر اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے اس سلسلے میں بہت سے عملی تجربے کئے۔

اسی سال لوئی نے ریشم کے کیڑوں کی بیماری کے متعلق تحقیقات شروع کی گو اس سال اس کے باپ کا انتقال ہوگیا اور تھوڑے ہی عرصے میں لگاتار کئی موتوں نے اُس کے گھر کا صفایا کر دیا۔ لیکن وہ اپنی علمی تحقیق اور عملی تجربوں میں برابر لگا رہا۔ اس نے دو زبردست بیماریاں ریشم کے کیڑوں کے متعلق معلوم کیں۔ یہ بیماریاں وبائی اور خاندانی ثابت ہوئیں۔ پاسچر نے ان کے علاج کا طریقہ بھی ڈھونڈھ نکالا۔ اِس طرح اس نے ریشمی تجارت کی مرجھائی کھیتی کو پھر ہرا بھرا کر دیا۔

۱۸۷۰ء میں فرانس اور پرشیا کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور وہ اپنے ملک کو دشمنوں کے ماتحت دیکھ کر غم و غصے کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ۵ برس کی متواتر جنگ کے زخمی اپنے بدبودار اور سڑے ہوئے زخموں کا شکار ہو رہے تھے۔ پاسچر کو اس پر غور کرنے کا موقع ملا اور ۱۸۷۱ء میں اُس نے اس زبردست تحقیقات کی ابتدا کی جس نے اُس کے نام کو ہمیشہ کے لئے روشن کر دیا۔ اسے یہ کامل یقین تھا کہ ہر ایک بیماری خاص جراثیم کی وجہ سے وجود میں آتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے لسٹر (گلاسکو یونیورسٹی کے مشہور جراح) نے ANTICEPTIC METHOD جراحی میں استعمال کرنا چاہا۔ لیکن ناکامیاب رہا۔ اسی سال فرانس میں بھیڑوں میں ایک خاص قسم کا تلیوں کا بخار پھیلا جس نے ملک کی بہت سی بھیڑیں تباہ کر دیں۔ مختلف لوگوں نے جراثیم کی تحقیقات کی تھی لیکن ناکامیاب رہے پاسچر نے بھی اس پر غور کرنا شروع کیا۔ اس نے جراثیم کی پرورش جانوروں کے جسم سے باہر کی اور پھر انھیں بیماری سے دوسرے جانوروں کے جسم میں پہنچایا۔ لیکن یہ مسئلہ

کہ پھر بیماری سے کیونکر بچایا جائے اب بھی حل نہ ہوا۔ لیکن محنت اور استقلال انسان کو کامیابی بخشتی ہے۔ آخر مرغیوں کے بچوں کی بیماری کی تحقیقات کے سلسلے میں اُسے ایک بڑی معلومات کا انکشاف ہوا۔ اُس نے معلوم کیا کہ اگر انھیں روٹی دی جائے تو یہ بچے اچھے ہو سکتے ہیں۔ اس سے پہلے سنہ ۱۷۹۶ء میں انگلینڈ میں جینر نے چیچک کا ٹیکا معلوم کیا تھا۔ گو پاسچر اس کا بے حد مداح تھا مگر اس کی تحقیق صرف ایک شعبے تک محدود تھی۔ عام بیماریوں کے متعلق تحقیق پاسچر کے ذہن کو پریشان کئے ہوئے تھی وہ اس تحقیق میں استقلال کے ساتھ لگا رہا اور کامیابی بھی ہوئی، جو نسخہ اُس نے اپنے تجربے میں شریک کیا وہ یہ تھا کہ بھیڑوں کے بھی ٹیکا لگایا جائے۔ اِس ٹیکے سے وہ بچائی جا سکتی ہیں۔ لوگوں نے اس کی بے حد مخالفت کی لیکن پاسچر کی ہمت اور استقلال میں فرق نہ آیا۔ ۱۸۸۱ء میں اس نے ٹیکے کے ذریعے تجربہ کرکے دکھلا دیا کہ بھیڑیں باوجود جراثیم کی کثرت کے بچائی جا سکتی ہیں۔ پاسچر کی اس نئی تحقیق کے سبب سارا ملک اس کا کلمہ پڑھنے لگا۔ اور اس کی شہرت ملک کے کونے کونے میں ہو گئی۔ یہ واقعہ ماہ مئی سنہ ۱۸۸۱ء کا ہے اور جب جون کے مہینے میں وہ ایک چراگاہ میں گیا تو اس کی ٹیکا لگائی ہوئی بھیڑیں آزادی کے ساتھ چر رہی تھیں اور جن کے ٹیکہ نہیں لگا تھا ان میں بیماری اور مرض کا اثر تھا۔ چراگاہ کے مالک نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اب پاسچر کی شہرت عام ہو چکی تھی۔

پاسچر اپنی تحقیقات کو وسیع کرتا گیا سنہ ۱۸۸۰ء میں دیوانے کتے کے کاٹنے کے علاج کی تحقیق شروع ہوئی پاسچر نے بھی اس پر غور کرنا شروع کیا۔ وہ اس تحقیق میں اس قدر دیوانہ تھا کہ اس نے خود ایک پاگل کتے کی رال ایک ٹیوب میں جمع کی۔ اس وقت تک یہ خیال تھا کہ رال ہی زیادہ مرض کا سبب ہے لیکن لوئی نے ثابت کیا کہ مرض کی جگہ دماغ اور ریڑھ کی ہڈیوں میں ہے اور اگر (VIRUS) کو جانوروں کے دماغ میں پہنچا دیا جائے تو یہ مرض روکا جا سکتا ہے اُس نے اس کا تجربہ دو کتوں پر کیا اور اس میں کامیابی ہوئی۔ دو کتوں کو پاگل کتے سے کٹوایا گیا۔ ایک کے سوئی لگائی گئی وہ اچھا رہا دوسرا مر گیا۔ لیکن ابھی تک انسان پر تجربہ نہ ہوا تھا اور پاسچر موقع کی تلاش میں تھا ۱۸۸۵ء میں ایک ۹ برس کے بچے کو ایک پاگل کتے نے چودہ جگہ کاٹ کھایا۔ اس کا تمام جسم خون سے بھرا ہوا دیکھ کر پاسچر کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اس لڑکے کے منہ سے بُری طرح رال ٹپک رہی تھی۔ پاسچر نے اس کے کئی ٹیکے لگائے اور وہ اچھا ہو گیا۔ اس طرح اُس نے ۶ ماہ میں ۳۵۰ مریضوں کو شفا بخشی ۱۸۸۶ء میں ۱۹ روسیوں کو پاگل بھیڑئے نے کاٹ کھایا تھا۔ وہ بھی پاسچر کے پاس لائے گئے اور تندرست ہو کر واپس گئے اس طرح تقریباً ایک سال میں ایک ہزار آدمی بچائے گئے۔

پاسچر کے اس تجربے نے ڈاکٹروں اور سائنس دانوں کے دل میں ایک جوش پیدا کر دیا۔ یہ طے کیا گیا کہ پاسچر کے نام پر ایک اسپتال پیرس میں قائم کیا جائے جس میں دیوانے کتے کے کاٹے ہوئے مریضوں کا علاج ہو۔ ۱۸۸۸ء میں یہ اسپتال قائم کر دیا گیا اور آج تک خدمتِ خلق میں مشغول ہے۔ بعد میں اس کے علاج کا یہ طریقہ تمام دنیا میں پھیل گیا خود ہندوستان میں شملہ کے پاس کسولی میں اسی طرح کا ایک اسپتال ہے۔

موجدوں کی کہانی



سید نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے۔ علیگ

(پچھلے پرچے سے ملا کر پڑھو)

سامان گھسیٹنے والے انجن کی ایجاد کے بعد ۱۸۲۲ء میں یعنی اب سے کوئی ایک سو اٹھارہ سال پہلے انگلستان کے بڑے بڑے تاجروں اور کارخانے کے مالکوں نے سب سے زیادہ سامان لے جانے والے اور سب سے تیز چلنے والا انجن بنانے والے کے لئے انعام مقرر کیا۔ بہت سے لوگوں نے انجن بنائے لیکن اسٹیفن کا انجن "راکٹ" سب سے زیادہ کامیاب رہا۔ چنانچہ ۱۸۲۵ء ہی سے اسٹاکٹن (انگلستان) اور ڈارلنگٹن کے درمیان اور ۱۸۳۰ء میں لورپول سے مانچسٹر تک ریل گاڑیاں چلنے لگیں۔ پھر تو ریل کے سفر کو ایسی مقبولیت ہوئی کہ تھوڑے ہی دنوں میں انگلستان کے دوسرے علاقوں میں بھی اسٹیفن کی نگرانی میں ریلیں چلنے لگیں اور آہستہ آہستہ تمام انگلستان میں ریلوے لائن کا جال بچھ گیا۔ اسٹیفن کا پہلا ریلوے انجن راکٹ آج بھی ڈارلنگٹن اسٹیشن پر نمائش کے طور پر رکھا ہوا ہے۔ اسٹیفن کی باقی عمر انھی ریلوں اور انجنوں کے بنانے میں صرف ہوئی۔ اسٹیفن نے کانوں کے لئے ایک لیمپ بھی ایجاد کیا تھا۔ کیونکہ کوئلے کی کانوں میں مٹی کے تیل کی لالٹین تو جل نہیں سکتیں۔ ان سے کانوں میں آگ لگ جاتی ہے۔ لیکن آج کل کانوں میں سرہمفری ڈیوی کا بنایا ہوا لیمپ استعمال ہوتا ہے۔ اس کا ذکر تم آگے پڑھوگے۔

تم نے دیکھا کہ مشین چلانے والے انجنوں کی ایجاد میں کتنے لوگوں کا ہاتھ تھا۔ آج کل بھی ان انجنوں میں نت نئی اصلاحیں ہو رہی ہیں۔ علاوہ اس کے طرح طرح کے مشین چلانے والے انجن ایجاد ہو رہے ہیں مگر سب کے باوا آدم ہمیشہ وہی پہلے لوگ سمجھے جائیں گے یعنی نیوکامن۔ جیمس واٹ مرڈوک اور اسٹیفن۔

اسی طرح کپڑا بننے والی مشین کی کہانی بھی سن لو۔ انگلستان میں ایک غریب جولاہا تھا جیمس ہارگریوز

تھا۔ ایک دن اتفاق سے اُس کی بیوی کے ہاتھ سے چرخا زمین پر گر پڑا۔ ہارگریوز نے دیکھا کہ زمین پر گرنے پر بھی چرخے کا پہیا برابر گھوم رہا ہے۔ اس معمولی سی بات پر لیکا یک اُس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ اگر ایک ہی پہیے کے گھومنے سی بہت سی چرخیاں گھومنے لگیں تو کام میں کتنی آسانی ہو جائے۔ اس سے نئی سال کے سوچ بچار اور تجربوں کے بعد آخر ایک چرخا ایجاد کر ہی لیا۔ اس چرخے سے دس چرخیاں ایک ساتھ چل سکتی تھیں۔ اس مشین یا چرخے کا نام اس نے اپنی بیوی کے نام پر "بننے والی جینی" رکھا۔

لیکن بے چارا ہارگریوز اس سے زیادہ فائدہ نہ اُٹھا سکا۔ اُس کے پیشے کے اور ساتھی اس سے خفا ہو گئے۔ انھیں ڈر تھا کہ اس ایجاد سے اُن کی روزیاں ختم ہو جائیں گی۔ اِن لوگوں کی خفگی اور ناراضگی اتنی بڑھی کہ ایک دن وہ زبردستی اس کے گھر میں گھس گئے اور اس کا چرخا توڑ پھوڑ ڈالا اور بے چارا ہارگریوز مفلس کا مفلس ہی رہا اور مفلسی کی حالت ہی میں جان دی۔ مگر دوسرے لوگوں نے اس کی مشین کی نقل کر کے اُس سے بہت فائدہ اُٹھایا۔

جب یہ مشین رواج پا گئی تو اس میں اصلاحیں بھی ہونے لگیں۔ ایک شخص رچرڈ آرک رائٹ نے ایک ایسی مشین بنائی کہ بس اسے ایک طرف چلاؤ اور دوسری طرف تاگا نکل آتا تھا۔ سب کام مشین ہی سے ہوتا تھا۔ آرک رائٹ ویسے تو نائی تھا۔ مگر اُسے بننے والی مشین سے بہت دلچسپی تھی، اپنی اس مشین کے ذریعے اس نے خوب ہی دولت کمائی۔ اور امیروں کی سی زندگی بسر کی۔

مگر اس بننے والی مشین میں ایک بڑی کمی تھی اس سے تاگا باریک اور عمدہ نہ نکلتا تھا۔ خاص کر جیسا آج کل استعمال ہوتا ہے۔ مہین اور مضبوط تاگا بنانے کا بھید ایک اور شخص سیموئل کرامپٹن نے معلوم کیا۔ یہ ایک جولاہے کا لڑکا تھا اسے وائلن (ایک انگریزی باجا) بجانے کا بہت شوق تھا۔ ذرا بھی فرصت ملتی تو وہ وائلن لے کر بیٹھ جاتا۔

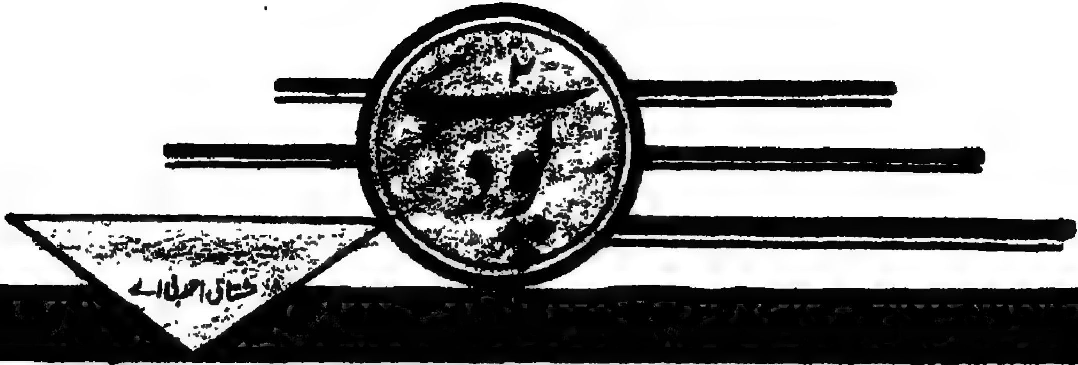
ایک دن کپڑا بنتے بنتے اُسے یہ خیال آیا کہ اس کا تاگا بہت موٹا اور بھدا ہوتا ہے اور اس سے بڑی دیر میں کپڑا بُنا جاتا ہے۔ اتنی دیر میں کہ وائلن بجانے کے لئے بھی وقت نہیں نکل سکتا تھا تاگا مہین اور مضبوط ہو تو کپڑا جلد بُن جائے اور پھر وائلن بجانے کے لئے فرصت ہی فرصت! تو جناب یہ بات اس کے جی میں جم گئی اور اس نے کئی سال تک سوچنے اور محنت و کوشش کرنے کے بعد ایک ایسی مشین بنا ہی لی۔ اس کا تاگا اتنا مضبوط اور مہین بن گیا جیسا آج کل استعمال ہوتا ہے۔

کرامپٹن نے اپنا یہ بھید کسی کو نہ بتایا اور چپ چاپ اپنا کام کرتا رہا مگر دوسرے جلاہوں نے بہت جلد بھانپ لیا کہ کرامپٹن کا بنایا ہوا کپڑا بہت عمدہ اور مضبوط ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ایک دفعہ کوئی شخص چپکے سے اس کے گھر میں گھس گیا اور پتہ لگایا کہ کرامپٹن نے کون سی مشین ایجاد کی ہے۔ آخر کرامپٹن اپنی ایجاد پیٹنٹ[1] بھی نہ کرا سکا۔ اور مشین بنانے والوں کے ہاتھ اپنا یہ بھید بہت سستے داموں بیچنے پر مجبور ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے یعنی مشین بنانے والے تو اس کی ایجاد کی بدولت خوب امیر ہو گئے مگر یہ غریب کا غریب ہی رہا۔ کچھ عرصے کے بعد انگلستان کی حکومت نے انعام کے طور پر اسے کوئی پانچ ہزار پونڈ دئے مگر اس رقم سے اس کا قرضہ بھی نہ چک سکا اور بے چارے نے ہارگریوز کی طرح غربت ہی کی حالت میں دم توڑا۔

یہ ہے بننے والی مشین کی مختصر کہانی مگر دیکھو کتنی دلچسپ ہے۔ آج اگر تم کپڑے کی مل میں جاؤ گے تو تمھیں ہزاروں چرخیاں لگی ہوئی ملیں گی۔ اتنے دن گزر چکے ہیں پھر بھی اس مشین کا نام اسی پہلے جُلاہے کی بیوی کے نام پر ہے "بننے والی جینی"

(باقی آیندہ)

[1] پیٹنٹ کرانے کا مطلب یہ ہے کہ موجد اپنی ایجاد گورمنٹ جسٹری کے دفتر میں درج کرا دے اس طرح کسی اور کو اس کی اس ایجاد کی نقل کرنے کا حق قانوناً باقی نہیں رہتا اور وہ ایجاد اسی ایجاد کرنے والے یا موجد کی ملک سمجھی جاتی ہے۔



پھر بھی سائنس نے اس کے بڑھنے اور پھیلنے پھولنے کے بھید کو تھوڑا بہت تو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

لطیف صاحب بولے "اچھا جناب اب تو خالص علمی باتیں چھڑ گئی ہیں بندہ رخصت ہوتا ہے۔" میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "جناب یہ بحث آپ ہی کی بدولت چھڑی ہے اسے پورا کر لیجیے، پھر کہیں تشریف لے جائیے گا۔" یوسف صاحب لطیف صاحب کی طرف منہ کر کے بولے "جناب والا مجھے باغبانی کا خالی خولی شوق نہیں ہے میں نے اس پر بہت سی کتابیں پڑھ ڈالی ہیں۔ کبھی توفیق ہو تو میری الماری دیکھ لیجیے۔" میں نے کہا :- "یوسف صاحب! دیکھئے آپ پھر فضول بحث میں پڑ رہے ہیں۔" یوسف صاحب بولے "نہیں بھئی میں تو ان حضرت کو ایک بات بتانا چاہتا تھا۔ خیر تو آپ پہلے یہ سمجھ لیجیے پودا ہو یا جانور اس کے جسم میں چھوٹے چھوٹے خلئے ہوتے ہیں جسم انہی خانوں کا بنا ہوتا ہے۔ ان خانوں کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے، ہوتا یہ ہے کہ ہر خلئے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور کچھ زمانے کے بعد ہر ٹکڑا ایک مکمل خانے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ عمل برابر جاری رہتا ہے اور اس طرح پودے یا جسم کی آہستہ آہستہ نشو و نما ہوتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ پورا پودا یا بڑا جسم بن جاتا ہے۔" لطیف صاحب نے کہا "واقعی یہ بات تو آپ نے بہت دلچسپ سنائی۔ مگر معاف کیجیے گا میں کہیں بیچ میں تو نہیں بول پڑا ہوں۔" یوسف صاحب بولے "جی ہاں کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ ہاں تو مشتاق صاحب آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ پودے کو بڑھنے اور پھل پھول لانے کے لئے پانچ چیزیں ضروری ہیں۔ ورنہ وہ بے چارا دنیا میں آنکھیں کھولنے سے پہلے ہی اللہ میاں کے ہاں سدھار جائے گا۔ ان میں سے پہلی چیز تو رطوبت یا پانی ہے۔ دوسری مناسب درجے کی حرارت یا گرمی، تیسری ہوا۔ اس لئے کہ پودے کو بھی سانس لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چوتھی چیز روشنی ہے جس طرح ہماری آپ کی روشنی بغیر گذر نہیں ہو سکتی۔ پودے کا بھی یہی

حال ہے۔ آخری چیز ایسے خوراک پہنچنے کا مستقل انتظام ہے ان میں سے ایک چیز سے بھی پودا محروم رہا تو اس کی نشوو نما اچھی نہیں ہو سکتی۔

پہلے ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ پودا اپنے بڑھنے کے لئے پانی کیونکر حاصل کرتا ہے، لطیف صاحب بولے "اس میں غور کرنے کی کیا بات ہے ظاہر ہے کہ زمین سے پانی حاصل کرتا ہے، یوسف صاحب بولے "جی ہاں آپ نے بالکل صحیح فرمایا پودا زمین ہی سے پانی چوستا ہے" دیکھئے ایک عالم نے یہ کتنی اچھی بات کہی ہے۔ "زمین ہی سے ساری چیزیں نکلتی ہیں اور آخرکار زمین ہی میں جا ملتی ہیں۔ باوجود اس کے وہ ہمیشہ تر و تازہ صاف اور ہر نئی پود کو اپنی گود میں کھلانے کے لئے آمادہ و تیار رہتی ہے زمین کے یہی ملائم اور باریک ذرے ان گنت انسانو جانوروں اور پودوں کی زندگی کا سہارا ہیں۔ نہ جانے کب سے یہ اُن کی مدد کرتے چلے آئے ہیں اور نہ جانے کب تک اُن کی مدد کرتے رہیں گے"

پودے کی زندگی اور نشوونما کے لئے مٹی میں نمی کا ہونا ضروری ہے۔ یہ نمی یا تو بارش کے پانی۔ دریا یا پرنالوں سے حاصل ہوتی ہے یا خشک جگہوں میں آبپاشی کے ذریعے اس کے ساتھ ہی خود پودا بڑی حد تک آپ اپنی مدد کرتا ہے۔ اس کی جڑیں پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھیلتی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ زمین کے بہت اندر تک گھستی چلی جاتی ہیں۔ بعض پودے مثلاً ناگ پھنی۔ اپنے پتوں میں پانی کا ذخیرہ جمع رکھتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس کے پتے کتنے موٹے ہوتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ان میں پانی برابر جمع رہتا ہے۔

ہر زندہ پودے میں آدھے سے زیادہ حصہ پانی کا ہوتا ہے۔ پودا جب تک زندہ رہتا ہے پانی کی کافی مقدار ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگاتی رہتی ہے یہ اس لئے کہ جڑیں زمین سے جو خوراک حاصل کرتی ہیں وہ پودے کے ہر حصے میں پہنچ جائے۔

پانی جڑوں کے ذریعے پودے کے جسم میں پہنچتا ہے اور پھر نئی کونپلیں نکالتا ہوا پتوں کے ذریعے ہوا میں خارج ہو جاتا ہے۔ اچھا آپ کو ایک دلچسپ اور حیرت میں ڈالنے والی بات بتاؤں! ایک ٹن یعنی ۲۸ من غلہ پیدا کرنے کے لئے پودے تین سو سے کر پانچ سو ٹن تک پانی زمین سے چوستے ہیں۔ گویا ایک سیر غلے کے لئے ۴۰۰ سے ۷۰۰ سیر تک پانی کی ضرورت ہوتی ہے" یہ بات سُن کر مجھے بھی تعجب ہوا۔ اور لطیف صاحب کا منہ بھی کھلا کا کھلا رہ گیا۔

یوسف صاحب نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا کہنے لگے "پانی کی طرح گرمی بھی پودے کی نشوونما کے لئے بہت ضروری ہے۔ مگر یہ گرمی ایک خاص حد تک ہونی چاہیے۔ ورنہ پودا کمزور پڑ جائے گا۔ زمین میں اگر گرمی بہت ہی کم ہو تو پودے کا بڑھنا قریب قریب رُک سا جاتا ہے لیکن یہی گرمی اگر ایک خاص حد سے بڑھی تو اس کی زندگی پھر

تلخ ہو جائے گی۔ مثلاً مکئی ۴۰ درجۂ حرارت یا اس سے کچھ زیادہ گرمی میں اُگ آئے گی۔ مگر گرمی کا درجۂ حرارت ۹۳ درجے سے بڑھا تو اس کا نشوونما بالکل ختم سمجھیے۔ اگر مناسب گرمی ملتی رہے تو پودا خوب پھولتا پھلتا ہے۔

میں نے پوچھا "بھئی یہ گرمی والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر یہ گرمی پودے کو کس طرح پہنچتی ہے؟" یوسف صاحب نے کہا "ابھی بتاتا ہوں۔ گرمی زمین ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اوّل تو خود زمین کے اندر گرمی ہوتی ہے دُوسرے سڑے ہوئے مختلف مادّے (کھاد کی صورت میں) زمین کو گرمی پہنچاتے ہیں اور گرمی کا سب سے بڑا سرچشمہ تو سورج ہے۔ اس کی شعاعیں گرمی کو زمین کے اندر تک پہنچا دیتی ہیں۔"

لطیف صاحب بولے: "ارے بس اب ختم بھی کیجیے گا! طبیعت اُکتا گئی۔" میں نے کہا "آپ پھر بولے۔" "ہاں یوسف صاحب آپ اپنا سلسلہ جاری رکھیے۔" یوسف صاحب نے کہا "میرے اُوپر اب اُن کی باتوں کا اثر نہیں ہوتا۔ ہاں پودے کی نشوونما بلکہ زندگی کے لئے ہوا کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اس کا تجربہ تو آپ خود بھی کر سکتے ہیں۔ چوڑے مُنہ کی دو بڑی بوتلیں لے لیجیے دونوں کی تہہ میں تھوڑا سا بھیگا ہوا جاذب یا بلاٹنگ پیپر رکھ دیجیے۔ پھر دونوں میں اتنا پانی بھر دیجیے کہ بلاٹنگ پیپر ڈوب جائیں۔

اب ان بوتلوں میں مٹر کے دانے یا سیم کے بیج بھر دیجیے یہ دانے یا بیج ۲۴ گھنٹے پہلے پانی میں بھیگ چکے ہوں۔ ان میں سے ایک بوتل کا مُنہ کارک سے خوب اچھی طرح بند کر دیجیے۔ دُوسری کا کُھلا رہنے دیجیے۔ جیسے جیسے پانی کم ہوتا جائے آپ تھوڑا تھوڑا ٹپکاتے رہیئے کہ کمی پوری ہوتی رہے۔ ہاں ان بوتلوں کو کسی گرم جگہ پر رکھ دیجیے چند ہی دنوں کے بعد کُھلے مُنہ کی بوتل میں اکھوے نکلنا شروع ہو جائیں گے۔ اور بند مُنہ کی بوتل کے دانے یا بیج ویسے کے ویسے ہی پڑے رہیں گے۔ ہوا میں ایک چیز آکسیجن ہوتی ہے۔ یہی آکسیجن پودوں کو نشوونما کی طاقت بلکہ زندگی بخشتی ہے۔

چوتھی چیز روشنی ہے یہ بھی پودے کے لئے کچھ کم اہم نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض قسم کے پودوں کو روشنی کی ضرورت نہ ہو۔ مگر ایک ہرا بھرا پودا روشنی بغیر مرجھا کے رہ جاتا ہے۔

سب سے آخری اور ضروری چیز غذا ہے۔ دیکھیے اگر آپ کو دو تین دن تک کھانا نہ ملے تو آپ کا کیا حال ہو۔ بس اسی پر پودوں کو قیاس کر لیجیے۔

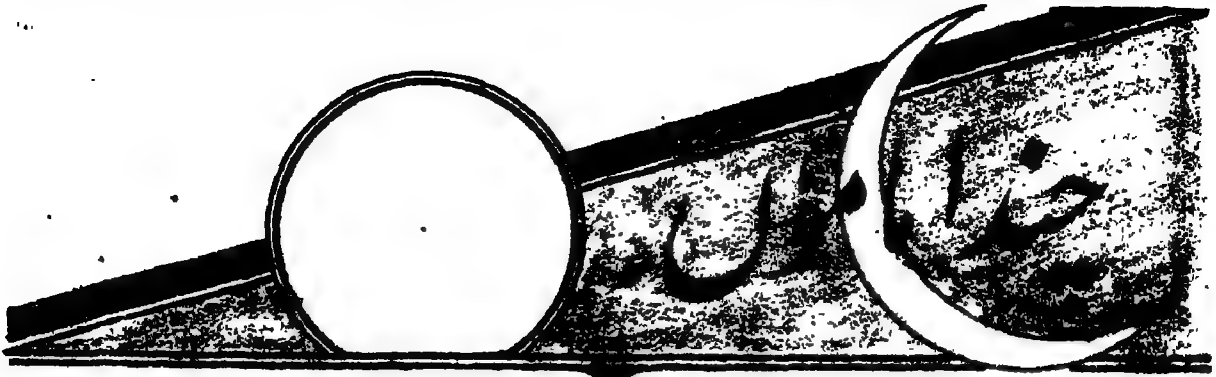
پودے کو یہ چیزیں مناسب مقدار میں حاصل ہوں تو اس میں بڑھنے کی حیرت انگیز طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ کوئی طاقت اسے بڑھنے اور پھیلنے سے نہیں روک سکتی۔ اس کی جڑیں زمین میں پھیلتی اور اندر گہرائیوں میں گھستی چلی جاتی ہیں۔ اور تنا یعنی اُوپر والا حصّہ خوب ہرا بھرا اور موٹا تازہ ہو جاتا ہے۔ کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کے پھیلنے اور بڑھنے میں حارج ہونا چاہتی ہے تو

وہ اُسے خاطر میں نہیں لاتا۔ بڑھنے اور پھیلنے کی خواہش پودے میں اتنی زبردست ہوتی ہے کہ کبھی کبھی تو جناب ایک ذرا سا پودا معجزہ دکھاتا ہے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ گکرمتا جیسے حقیر پودے نے ایک وزنی پتھر کو اپنے راستے سے ہٹا دیا ہے اور سنئے اتفاق سے ایک بیج کسی قبر میں آگرا اور اُگ آیا اس نے بڑھتے بڑھتے اتنا زور باندھا کہ پکی قبر کو توڑ کر باہر نکل آیا۔ ایک بڑے درخت کا ننھا سا پودا ایک بہت بڑے پتھر کی دراز میں اُگ آیا تھا اُس نے پتھر کو اپنی جگہ سے اُبھار دیا۔ اس پتھر کا وزن بیالیس من تھا۔ میں جس نرسری میں آج گیا تھا اس کے قریب ہی ایک باغ ہے۔ وہاں ایک بہت بڑی دیوار کی بنیاد کو آہستہ آہستہ اتنا کم زور کر دیا کہ ایک دن پوری کی پوری دیوار زمین پر آرہی۔

لطیف صاحب بولے "ارے بھائی آپنے نباتات کے علم کا بہت مطالعہ کیا ہے میرے خیال میں جامعہ میں نباتات کا ایک شعبہ کھول دیا جائے اور آپ ...."

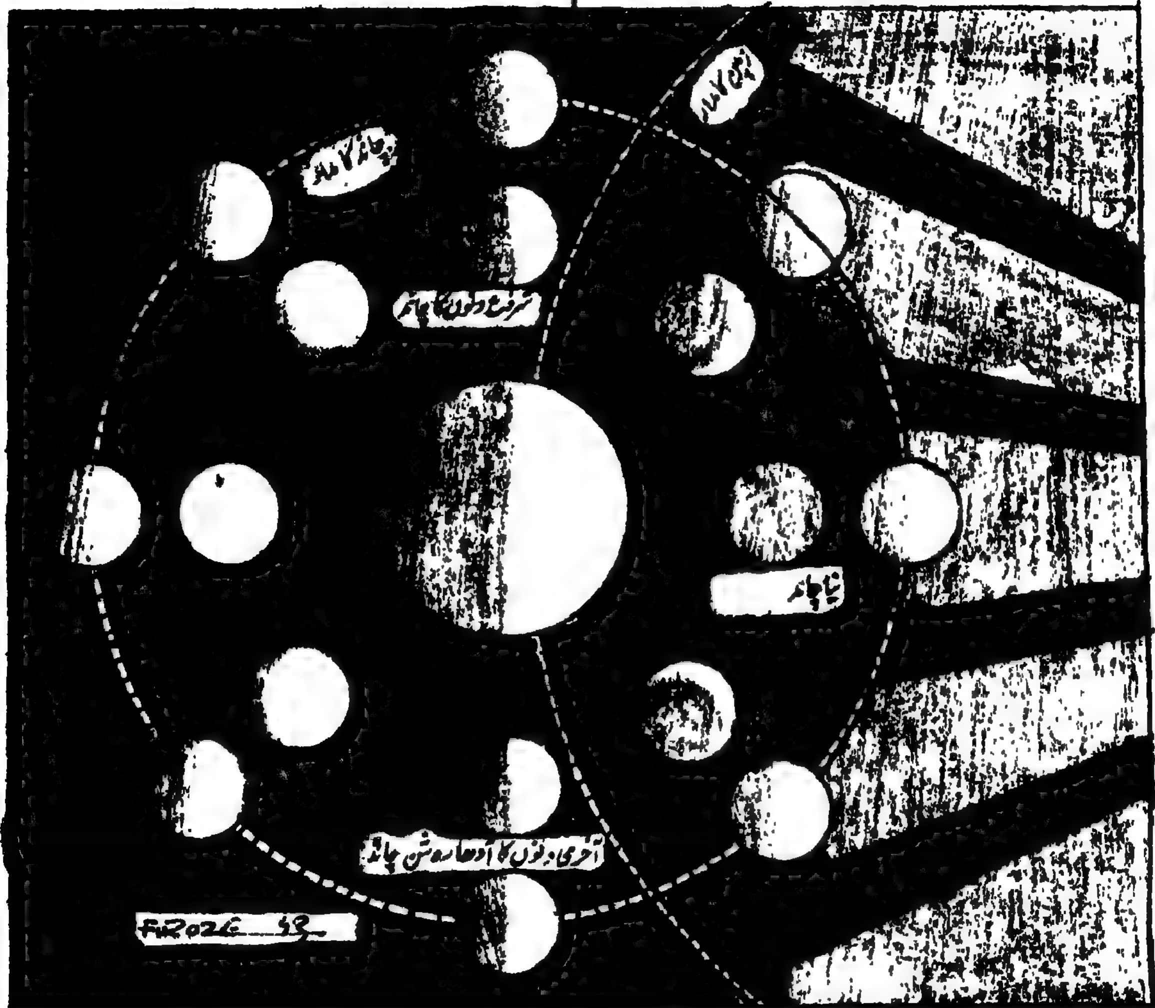
یوسف صاحب بات کاٹ کر بولے " اور آپ بھی اپنے لئے اس شعبے میں جگہ تجویز کر لیجئے۔"



اچھا ایک بات اور سن لو آسمان پر جتنے بھی ستارے ہیں۔ چاند ان سب کے مقابلے میں زمین سے زیادہ قریب ہے۔ بعض لوگوں کا تو خیال ہے کہ یہ زمین ہی کا ایک ٹکڑا ہے اس سے ٹوٹ کر الگ ہو گیا ہے۔ ویسے یہ ہماری زمین سے بہت چھوٹا ہے۔ اسے اگر بیچ سے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ناپا جائے تو اس کا فاصلہ کل ۲۱۶۳ میل ہوگا۔ زمین چاند سے کوئی ۴۹ گنا بڑی ہے۔ ۴۹ چاند ہماری زمین میں سما جائیں گے اور اگر دونوں کو تولا جائے تو ہماری زمین کا وزن ۸۱ گنا زیادہ نکلے گا یعنی اگر ایک پلڑے میں زمین رکھی جائے گی تو دوسرے پلڑے میں ۸۱ چاند رکھنا پڑیں گے تب کہیں دونوں پلڑے برابر ہوں گے۔ ماموں زاہد حسین صاحب خاموش بیٹھے میری باتیں سن رہے تھے۔ کہنے لگے "بھئی یہ تو تم نے بہت اچھی باتیں بتائیں اچھا ایک بات اور بتاؤ۔ یہ چاند مہینے کے مہینے اس طرح گھٹتا بڑھتا کیوں ہے۔ میں نے کہا چاند، سورج یا دوسرے ستاروں

کی طرح آگ کا گولا نہیں ہے بلکہ ایک مردہ جسم ہے۔ اس کی روشنی بھی اپنی روشنی نہیں ہے بلکہ اس کی چپٹی سطح پر جب سورج کی شعاعیں پڑتی ہیں تو آئینے کی طرح ان شعاعوں کا عکس زمین پر پڑتا ہے اور اسی کو ہم چاندنی کہتے ہیں۔ اصل میں چاندنی یا چاند نہیں گھٹتا بڑھتا۔ بات یہ ہے کہ چاند ایک تو خود لٹو کی طرح گھومتا رہتا ہے دوسرے یہ سورج اور زمین کے گرد چکر بھی لگاتا ہے۔ چکر لگاتے وقت اگر چاند کا وہ حصہ زمین کے سامنے ہو جس پر سورج کی شعاعیں نہیں پڑ رہی ہیں تو ظاہر ہے چاند ہم تک روشنی نہیں پہنچا سکتا۔ پہلی تاریخ کو جو باریک سا ہلال نظر آتا ہے تو اس کا یہی بھید ہے۔ پھر جوں جوں چاند کا وہ حصہ جس پر سورج کی شعاعیں پڑ رہی ہیں زمین کے سامنے آتا جاتا ہے۔ چاند کی روشنی بھی بڑھتی جاتی ہے اور چودھویں رات کو ہمیں پورا چاند نظر آ جاتا ہے اس کے بعد وہ حصہ آہستہ آہستہ زمین کے سامنے سے ہٹتا جاتا ہے اور روشنی بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آخری

راتوں میں روشنی بالکل غائب ہو جاتی ہے۔ چاند چونکہ گول گول گیند جیسا ہے اس لئے سورج کی شعاعیں اس



کے صرف آدھے حصے پر پڑ سکتی ہیں۔ اس کا تجربہ تو ابھی ابھی ہو سکتا ہے۔ عائشہ بہن ذرا میری بیٹری تو اٹھا لانا۔ اچھا لالٹین ہی سہی۔ فہیدہ تم حبیب کا

لکڑی والا گیند بھی لے آؤ۔ اب ایک کام اور کرو۔ ایک کیل لے آؤ اور گیند کے بیچوں بیچ سوراخ کر کے اُسے

کیل پر رکھ دو۔ اب اُسے کیل پر گھماؤ اور اپنے ہاتھ کو بھی چکر دو۔ دیکھئے ماموں صاحب گیند کے صرف اس آدھے حصے پر روشنی پڑ رہی ہے جو لالٹین کے سامنے آ جاتا

ہے۔ بس یہی حال چاند کا ہے۔ اس لئے کہ صرف آدھے حصے پر سورج کی شعاعیں پڑتی ہیں اگر ہلال یا پہلی تاریخ کا چاند غور سے دیکھیں تو ہمیں چاند کا وہ حصہ بھی نظر آجاتا ہے جس پر سورج کی شعاعیں نہیں پڑ رہی ہیں اکثر تو دن میں بھی چاند کا یہ تاریک حصہ نظر آجاتا ہے۔ اس لئے کہ زمین کی روشنی اپنا عکس چاند پر ڈالتی ہے۔

اگر ہم چاند پر پہنچ کر زمین کو دیکھیں تو ہمیں زمین میں بھی وہی باتیں نظر آئیں گی جو چاند میں نظر آتی ہیں کبھی تو یہ بدر ہوگی اور کبھی ہلال اور کبھی نظروں سے بالکل غائب"

ماموں صاحب نے کہا "اور یہ گرہن کیوں پڑتا ہے"

میں نے جواب دیا کہ جس طرح چاند زمین اور سورج کے گرد چکر لگاتا ہے اسی طرح زمین بھی ایک وقت ایسا آتا ہے کہ زمین سورج اور چاند کے درمیان آجاتی ہے اور زمین کا سایہ سورج پر پڑنے لگتا ہے۔ بس یہی گہن ہے اگر چاند، سورج اور زمین کے بیچ میں آجائے اور چاند کا سایہ سورج پر پڑنے لگے تو یہ سورج گہن ہے یہ ہمیشہ مقررہ تاریخوں میں ہوتا ہے بہت سے لوگ اس نئی روشنی کے زمانے میں بھی گہن سے ڈرتے ہیں۔ ہندو دان پن اور مسلمان خیرات کرتے ہیں۔ دان پن اور خیرات تو اچھی بات ہے مگر ڈرنا اور خوف کھانا سراسر حماقت ہے۔

ماموں صاحب کہنے لگے "اور کیوں بھئی بعد کے آنے والے لوگ کہیں ان سب باتوں کو بھی دھوکا نہ بتائیں اور کہیں کہ ہم نے جو کچھ بھی تحقیق کی ہے وہی صحیح ہے۔ میں نے کہا "جی ہاں اس کا تو ہر وقت امکان ہے جب سے دنیا قائم ہے برابر یہی ہوتا آیا ہے۔ پچھلے لوگ اگلوں کی تحقیق اور تجربے کو بنیاد بناتے اور آگے بڑھتے ہیں۔ پرانی تحقیقاتوں اور تجربوں میں جو غلطیاں ہوتی ہیں انھیں ٹھیک کرتے ہیں۔ ایسا نہ کریں تو علم ترقی کیسے کرے۔ دور کیوں جائیے خود مسلمانوں کو لیجئے انھوں نے دوسرے علموں کے ساتھ ساتھ چاند اور ستاروں کے علم میں بھی بہت ترقی کی تھی۔ مگر ایک زمانہ ایسا آیا کہ وہ اپنی تحقیق کو قرآن و حدیث سمجھنے لگے اور سمجھنے لگے کہ ہماری تحقیق آخری تحقیق ہے اس کے آگے ترقی ناممکن ہے۔ بس جبھی سے ان پر علم کا دروازہ بند ہوگیا اور ان کا کام دوسری قوموں یعنی یورپ کے لوگوں نے سنبھال لیا۔ اور اسے خوب ترقی دی۔

چاند اندھیری راتوں میں ہمیں بس روشنی ہی نہیں پہنچاتا اس سے ہمیں اور بھی فائدے ہیں سمندر میں اتار چڑھاؤ یا جوار بھاٹا اسی سے آتا ہے اور اس سے تجارتی جہازوں کے آنے جانے میں بہت مدد ملتی ہے۔ علاوہ اس کے جب سمندر کا پانی مدوجزر یا جوار بھاٹے کے وقت کنارے یا ساحل سے ٹکراتا ہے تو وہاں کی ساری گندگی اپنے ساتھ بہا لاتا ہے اور ساحلی علاقے کی آب و ہوا کو خوشگوار بنا دیتا ہے۔

فہمیدہ میری باتوں سے شاید اکتا گئی تھیں کہنے لگیں اوئی اللہ تم نے تو پوری کتاب پڑھ ڈالی۔ مُوا چاند نہ ہوا مصیبت ہوگیا بس ختم کرو اس داستان کو دماغ چاٹ لیا" میں نے ہنس کر کہا "بھینس کے آگے بین بجائی بھینس کھڑی ---------"

مائیکل فیراڈے

مرزا احمد حسن ایم اے سی

۲

دراصل فیراڈے نے ایک ایسا طریقہ نکالا جس سے ہم نہ ختم ہونے والا بجلی کا خزانہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس تحقیق سے پہلے بجلی سے مقناطیس بنایا جاتا تھا۔ لیکن فیراڈے نے مقناطیس سے بجلی پیدا کرنا چاہی اور کر کے دکھا بھی دی اسی ایجاد کی وجہ سے ٹیلیفون، تار برقی، گھروں میں بڑے پیمانے پر بجلی کی روشنی اور دوسری ہزاروں بجلی سے کام دینے والی چیزیں وجود میں آئیں۔ جو ہماری ضروریات زندگی میں روزانہ کام آتی ہیں۔

بجلی کے اس اعلیٰ پیمانے پر استعمال کا سہرا فیراڈے ہی کے سر ہے۔ ۱۸۵۸ء میں پروفیسر ایف' ایچ' ہولس (FH HOLOES) نے ایک ترقی شدہ بجلی کی مشین بنائی۔ یہ بھی فیراڈے کی مشین کے اصول پر تھی۔ فیراڈے نے یہ رائے دی کہ لائٹ ہوس (LIGHT HOUSE) کی بتیوں کے روشن کرنے کے لئے یہ مشین استعمال کی جائے۔ اسی کی رائے سے ایک بڑے پیمانے پر روشنی کا انتظام ساؤتھ فور لینڈ لائٹ ہاؤس (SOUTH FORE LAND LIGHT HOUSE) میں کیا گیا اور یہ دنیا کا سب سے پہلا لائٹ ہاؤس ہے جو بجلی سے روشن ہوا۔

۱۸۳۳ء میں اس نے یہ ثابت کیا کہ جتنے قسم کی بجلی دریافت کی گئی ہے وہ سب ایک ہی ہے۔ اس کے بعد اس کا دماغ بجلی سے کیمیاوی مرکبات پر اثر ڈالنے کی طرف مبذول ہو گیا جس کا نام اس نے الیکٹرولیسس (ELECTROLYSIS) رکھا اسی اصول کے ماتحت مختلف کیمیاوی مرکبات میں بجلی کی لہر دوڑانے سے دوسرے کیمیاوی مرکبات یا مفردات حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ فیراڈے کی اسی ایجاد کی وجہ سے آج ہم دھاتوں کو صاف کرتے۔ کچی دھات سے اصل دھات نکالتے۔ کاسٹک سوڈا، کلورین اور مختلف گیسیں حاصل کرتے ہیں۔

سر رابرٹ پیل کا ارادہ تھا کہ فیراڈے کو ایک معقول پنشن دی جائے۔ لیکن وزارت کے بدل جانے کی وجہ سے یہ کام لارڈ میلبورن (LORD MALBOURNE)

کے ہاتھ پڑ گیا جس نے اُسے بہت کنجوسی سے انجام دیا فیراڈے نے حقارت سے اس عطیے کو رد کر دیا۔ اس پر لارڈ میلبورن نے تحریری معافی مانگی اور تین سو پونڈ سالانہ زندگی بھر کے لئے پنشن کر دی۔

۱۸۴۱ء میں فیراڈے کی تندرستی خراب ہو گئی انتہا سے زیادہ دماغی محنت کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ تین سال تک اُس نے کچھ نہیں کیا اور تبدیل آب و ہوا کی غرض سے اپنی بیوی اور سالے کے ساتھ سوئٹزرلینڈ چلا گیا۔ اس سفر کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اپنے عزیزوں سے بہت محبت تھی۔ انٹرلیکن سے ۲ اگست ۱۸۴۱ء میں لکھتا ہے۔ "کیلیں بنانے کا کام یہاں کافی ہوتا ہے اور یہ کام دیکھنے میں بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ میں لوہاری کی دوکان یا لوہاری کے پیشے سے متعلق ہر چیز کو پسند کرتا ہوں کیونکہ میرا باپ ایک لوہار تھا۔"

جوں ہی تندرستی نے اجازت دی فیراڈے اپنے کام میں پھر مشغول ہو گیا۔ اور ۱۸۴۵ء میں اس نے اپنی ایک اہم ایجاد دُنیا کے سامنے پیش کی اس نے روشنی پر مقناطیس کے اثر کو معلوم کر لیا اور یہ رائے ظاہر کی کہ روشنی میں ایک قسم کی لہریں ہوتی ہیں جن کے ذریعے سے وہ پھیلتی ہے اسی اصول پر میکسویل (MAX WELL) اور ہرٹز نے اپنا ELECTROMAGNETIC RADIATION کا اصول معلوم کیا جس کی وجہ سے بے تار کی تار برقی وجود میں آئی۔

فیراڈے کے تمام تجربوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑا باریک بیں سائنس داں تھا وہ حقیقت کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا اور بعد میں اپنے تجربوں کی مدد سے اپنے دعوے کو صحیح کر دکھاتا تھا۔ وہ جتنا بڑا سائنس داں تھا۔ اتنا عمدہ مقرر بھی تھا۔ اس کی تقریر سننے والوں پر جادو کا اثر رکھتی تھی۔

۴۰ برس تک فیراڈے رائل انسٹی ٹیوشن میں رہا لیکن ۱۸۵۸ء میں پرنس البرٹ کی سفارش پر ملکہ معظمہ نے ایک مکان ہیمپٹن کورٹ میں رہنے کے لئے دے دیا۔ یہاں اُس نے آخرکار ۱۸۶۵ء میں اپنا کام بڑھاپے کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ اور آخر ۲۵ اگست ۱۸۶۷ء کو اس دار فانی سے سفر اختیار کیا۔

اس کا قد چھوٹا اور بال گھنگھرالے تھے۔ بدن سے چستی اور چہرے سے خوش مزاجی ٹپکتی تھی۔ وہ بڑا فراخ دل اور فیاض تھا۔ بہت مذہبی آدمی تھا۔ اس کو اپنی بیوی اور ماں باپ سے بہت گہری محبت تھی۔ جو لوگ اس کو جانتے تھے وہ اس کی دماغی قوت، سچائی اور صاف گوئی کی اتنی تعریفیں نہیں کرتے تھے جس قدر اس کے چال چلن، خوش خلقی اور برتاؤ کے مداح تھے۔

فیراڈے نے اپنی ایجادوں سے روپیہ حاصل کرنے کی کبھی ہوس نہ کی۔ بلکہ صرف اس بات کی کوشش کی کہ جہاں تک ہو سکے وہ زیادہ سے زیادہ

قوانینِ فطرت کی تہہ تک پہنچ سکے۔ تقریباً ۴۰ برس تک وہ روزانہ لیبوریٹری میں اپنے دماغ میں ایک سوال لے کر جایا کرتا تھا اور جب تک اس کا معقول یا غیر معقول نتیجہ نہ نکل آئے کام میں مشغول رہتا تھا اور یہی چیز اس کی ترقی کا باعث ہوئی۔

اس مستقل مزاج اور بے نظیر سائنس داں کی تحقیقات، کا نوعِ انسانی کے کارناموں میں شمار ہوتا رہے گا۔ جتنا زمانہ گزرتا جائے گا فیراڈے کی تحقیقاتیں اور ایجادیں دھندلی ہونے کے بجائے روز بروز روشن ہوتی جائیں گی جتنی دنیا آگے بڑھتی جائے گی اور تحقیق کی روشنی پھیلتی جائے گی اس بڑے موجد اور بزرگ سائنس داں کے کارنامے ہر انسان کے دل میں اس کی قدر اور عظمت قائم رکھیں گے۔



یہ نظم بیگم نور الحسن ہاشمی نے اپنے دونوں جڑواں بچوں عزیزہ نجمہ اور عزیزی نجمی کی سال گرہ کے موقع پر پڑھی تھی۔
(ایڈیٹر)

اک سال کے ہوئے ہیں بچے یہ دونوں پیارے
اس واسطے جمع ہیں سب اقربا ہمارے

دونوں یہ چھوٹے چھوٹے دونوں یہ ننھے منے
ابّو کے ہیں سہارے ممّی کے دل کے پیارے

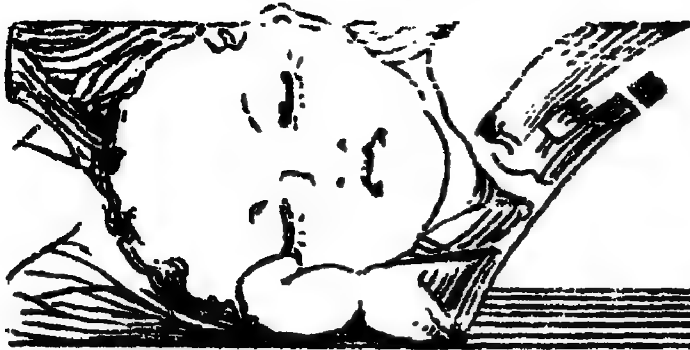
ددھیال کے اُجالے ننھیال کے دُلارے
بچے ہیں چھوٹے چھوٹے یہ دونوں پیارے پیارے

امّی کے جی کی رونق بابا کے دل کی ٹھنڈک
جگ میں رہیں ہمیشہ یہ دونوں جگ سنوارے

دادی کے جی کی منت دادا کے گھر کی زینت
نانا کے نام لیوا نانی کے دل کے پیارے

خالاؤں کے ہیں ہیرے پھپھیوں کے ہیں کھلونے
ماموں، چچا ہیں جتنے دل سے فدا ہیں سارے

آنکھوں کا نور نجمی دل کا سرور نجمہ
قائم رہیں ہمیشہ یہ دونوں چاند تارے



ہم کیوں سوتے ہیں

(مشتاق احمد بی اے علیگ)

جب سے پیام تعلیم نے اپنے پیامیوں کو مشغلوں کا شوق دلایا ہے ہر پیامی میں کچھ نہ کچھ کرنے کا چسکا پیدا ہوگیا ہے۔ ویسے بھی اکثر لوگوں کا اچھا یا برا کوئی نہ کوئی شغل ضرور ہوتا ہے۔ یہی شغل آہستہ آہستہ عادت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ہمارے ایک دوست ہیں بدرالدین صاحب ہمارے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ ان کا مشغلہ بہت دلچسپ ہے۔ یعنی سونا یا بستر پر کروٹیں بدلنا اور لیٹے لیٹے ہوائی قلعے بنانا۔ شام کو دفتر سے آئے جلدی جلدی کھانا کھایا دو چار منٹ باتیں کیں۔ دو چار قدم ادھر ادھر ٹہلے عشار کی نماز پڑھی اور غڑاپ سے بستر میں۔ پھر کیا مجال جو انھیں کوئی بستر سے اٹھا دے۔ بس صبح پانچ بجے اٹھیں گے۔ فجر کی نماز پڑھیں گے اور پھر دن کے نو بجے تک پھر بستر پر۔ بستر چھوڑتے وقت جو انھیں رنج ہوتا ہے اور رات کو بستر پر لیٹتے وقت جو خوشی ہوتی ہے اس کا اندازہ تو تم ہم بھی نہیں لگا سکتے۔

جب سے میں نے نیا مکان لیا ہے لطیف صاحب اکثر رات کو کھانا کھانے کے بعد گپ کرنے آجاتے ہیں۔ بہتیرے جتن کرتے ہیں کہ بدر صاحب بستر سے اٹھ جائیں اور پاس آکر کچھ دیر گپ کریں۔ مگر بدر صاحب ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ مجبور ہوکر لطیف صاحب نے ان کا نام شیر بستر رکھ دیا ہے تم نے وہ مصرعہ تو اکثر سنا ہوگا۔ شیر قالیں اور ہے شیر نیستاں (جنگل کا شیر) اور ہے۔ بس اسی مناسبت سے۔

مگر ایک دن لطیف صاحب نے کچھ اس طرح فقرے چست کئے کہ بدرالدین صاحب کو کچھ غصہ اور کچھ جوش سا آگیا۔ ایکاایکی بستر پر سے کود پڑے اور لطیف صاحب کی طرف رخ کیا۔ ظاہرا نیت کچھ فوجداری کی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے بھی کچھ خطرہ پیدا ہوا مگر بدرالدین صاحب لڑنے والے آدمی ہیں نہیں۔ خاموشی سے لطیف صاحب کے پاس بیٹھ گئے اور کہنے لگے۔ بھائی لطیف صاحب آپ روزانہ میری نیند پر فقرے کستے رہتے ہیں۔ مگر آپ اس پر بھی تو غور کیجئے کہ دس بجے سے پانچ بجے تک دفتر میں کام کرنا پڑتا ہے۔ تھک کر چور ہو جاتا ہوں۔ پھر کھانا کھاتے کھاتے پلکیں بھاری ہونے لگتی ہیں۔ اگر آپ کو اتنا کام

کرنا پڑے تو یقین جانئے تو آپ کا بھی یہی حال ہو۔ لطیف صاحب بولے "ممکن ہے صحیح فرماتے ہوں۔ مگر آپ کو شاید یہ بات معلوم نہیں کہ کھانا کھا کر فوراً سو جانا تندرستی کیلئے بہت مُضر ہے۔ کم سے کم دو یا پھر تین گھنٹے بعد سونا چاہئے کہ تاکہ اس عرصے میں کھانا تحلیل یا ہضم ہو جائے میں نے کہا "جی اور کیا اور سوتے تو ہم لوگ بھی ہیں۔ رت جگا نہیں کرتے یہ بھی جانتے ہیں نیند انسان کے لئے بالکل قدرتی بلکہ زندگی کے لئے ضروری چیز ہے اگر شور و غل یا کسی ایسی ہی وجہ سے مسلسل جاگنے پر مجبور ہوں تو ہمارا زندہ رہنا ناممکن ہے۔ لطیف صاحب بولے" ایک ہم ہی کیا نیند تو بعض جانوروں کے لئے بھی ضروری ہے بڑے تو بڑے چھوٹے جانور بھی انسان جتنا سو لیتے ہیں مچھلیوں کو جب نیند آتی ہے تو دریا جھیل یا تالاب کی تہہ میں چلی جاتی ہیں۔ سانپ بھی سوتے ہیں۔ مگر سانپ اور مچھلی کے پلکیں نہیں ہوتیں۔ اس لئے آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔

میں نے کہا" ہاں صاحب سونے کی اہمیت سے کسے انکار ہے۔ اگر کتے کے پلوں کو بالکل سونے نہ دیا جائے تو چار، پانچ روز میں ختم ہو جاتے ہیں کتوں کی حالت متواتر ۴۰ گھنٹے جاگنے کے بعد متوالے شرابیوں کی سی ہو جاتی ہے۔ اگر کسی ایسے کتے کا خون دوسرے کتے کے جسم میں داخل کر دیا جائے تو وہ تھکن سی محسوس کرنے لگتا اور تھوڑی دیر بعد میٹھی نیند سو جاتا ہے۔

لطیف صاحب بولے" پرانے زمانے میں بعض ملکوں میں جگا کر مارنے کی سزا بھی دی جاتی تھی۔ مثلاً اب سے کوئی ڈھائی، تین سو برس پہلے فرانس میں قیدی کے چاروں طرف دن رات ڈھول اور تاشے پیٹے جاتے تھے اس شور اور ہنگامے کی وجہ سے بیچارا قیدی سو نہیں سکتا تھا اور تھوڑے دنوں کے بعد ہمیشہ کی نیند سو جاتا تھا"

بدر صاحب بولے" واہ بھئی آج آپ لوگ کیسی باتیں کر رہے ہیں یہ سب باتیں تو میری تائید میں ہیں۔ اچھا آج سے آپ کی ہماری صلح۔ لطیف صاحب بولے "جی نہیں آپ کے معاملے کی صورت بالکل دوسری ہے آپ نے تو بستر کو اپنا رفیق بنا لیا ہے۔" بدر صاحب بولے" خیر ان باتوں کو جانے دیجئے۔ یہ بتلائیے کہ نیند کی اصلیت کیا ہے۔" لطیف صاحب بولے۔" بھئی نیند کی اصلیت تو مجھے معلوم نہیں۔ میں نے اس پر کچھ پڑھا ہے نہ کبھی غور کیا ہے۔ میں نے کہا" نیند کی اصلیت تو سائنس داں بھی ٹھیک سے نہیں بتا سکتے۔ ہاں یہ سب کہتے ہیں کہ نیند کی بدولت کچھ دیر کے لئے انسان پر بے حسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور تمام عضو تازہ دم ہو کر دوسرے دن کام کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

(باقی آئندہ)



ہم کیوں روتے ہیں؟

محمد اکبر مسعود صدیقی

تم ہنستے ہو اور روتے ہو۔ ان اضطراری حرکتوں کا سبب تمھارے جسم اور دماغ کی بناوٹ ہے۔ اگر تمھارے گدگدی کی جائے تو تم اس سے خوش نہیں ہوتے۔ مگر کھل کھلا کر ہنسنے لگتے ہو۔ یہ سمجھنا کہ یہ کیوں ہوتا ہے بہت آسان ہے۔ اگر تیز روشنی تمھاری آنکھوں کے سامنے اچانک آجائے تو تم فوراً اپنی آنکھیں بند کرلیتے ہو۔ تمھارے دماغ کی بناوٹ ایسی ہے کہ ایسے وقت تم سے یہی بات سرزد ہوگی۔ ہنسی جو آتی ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ ایک حرکت کرنے کے بجائے تم ایک ہی وقت میں کئی حرکتیں کرنے لگتے ہو۔ تم اپنی آنکھ کے پپوٹوں کو حرکت دینے کے بجائے اپنے چہرے کے بہت سے اعصاب کو حرکت دیتے ہو ان اعصاب کو جن سے تم سانس لیتے ہو اور ان اعصاب کو جن سے تم آواز نکالتے ہو ایک غیر معمولی طریقے پر حرکت دیتے ہو۔ ان سب اعصاب کی ایک مخصوص حرکت کا نام ہنسی ہے۔ جب کوئی شخص تمھارے پیر کا تلوا گدگدائے تو تم فوراً پیر ہٹا لیتے ہو یہ عمل جواباً بطور ایک ردِ عمل کے ہوتا ہے۔

جو وجہ ہنسنے کے متعلق بیان کی گئی ہے رونے سے متعلق بھی سمجھ لو۔ اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کی جا سکتی دماغ کی بناوٹ اس طرح کیوں رکھی گئی ہے۔ جس وقت ہم روتے نہیں ہیں ہماری آنکھوں کا پانی بہت ہی کارآمد چیز ہے اور جب ہم کو تکلیف پہنچائی جاتی ہے تو ہمارا آنسو بہانا ایک فضول اور بیکار سی بات ہے۔ انسان بڑا ہو جانے کے بعد اس بات کو محسوس کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جوان اور بوڑھے کی آنکھوں سے تکلیف پہنچنے پر بھی آنسو نہیں نکلتے۔

دماغ کا اوپر کا حصہ دماغ کے نچلے حصے کا حاکم ہوتا ہے اور وہ بعض چیزیں کرنے کا حکم دیتا ہے اور بعض چیزیں کرنے سے روکتا ہے۔ دماغ کا نچلا حصہ ہی تکلیف پہنچانے کی صورت میں رو کر جواب دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا بچہ بھی روتا ہے لیکن جب ہم بڑے ہو جاتے ہیں تو دماغ کے اس نچلے حصے سے یہ کہتے ہیں کہ اس کو وہ نہیں کرنا چاہیے جو وہ کرنا چاہتا ہے اور اس طریقے پر ہم اس کو رونے سے روک دیتے ہیں۔ کوئی معقول وجہ۔۔۔ اب تک یہ نہ معلوم ہو سکی کہ روتے میں آنسو کیوں نکلتے ہیں۔ مگر ایک نہایت اچھی اور سمجھ میں آجانے والی وجہ ان آنسوؤں کے لئے موجود ہے۔ تم جانتے ہو کہ ہر چند سیکنڈ کے بعد تم اپنی پلکیں جھپکاتے

اگر تم ایسا نہ کرو تو تمھاری آنکھ اپنا کام کرنا بند کردے گی۔

اب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ آخر پلک مارنے سے آنکھ کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔ جب آنکھ کھلی رہتی ہے تو اس کا سامنے والا حصّہ گرد و غبار سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ اور وہی حصّہ جو تر رہتا ہے خشک ہوجانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اگر وہ حصّہ خشک ہوجائے تو ہم اندھے ہوجائیں دیکھو ہم اپنی آنکھ کے سامنے والے حصّے کو دھوتے نہیں ہیں مگر وہ ہمیشہ صاف رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنی مرتبہ ہم پلک مارتے ہیں اتنی ہی مرتبہ ہم اس کو دھوتے رہتے ہیں۔ ہر آنکھ کے اوپر ایک چھوٹی سی تھیلی ہوتی ہے۔ اُسے آنسو بہانے والی تھیلی کہتے ہیں۔ جتنی دیر تک ہم جاگتے رہتے ہیں یہ تھیلی آنسو بہانے کا کام کرتی رہتی ہے۔ جب آنکھ کا سامنے والا حصّہ خشکی یا گرد محسوس کرتا ہے تو فوراً اس کی اطلاع دماغ کو دیتا ہے اور اس اطلاع پر فوراً پلک جھپکتی ہے اور اس کے ساتھ ہی پانی کا ایک قطرہ آجاتا ہے جو آنکھ کے کھلے ہوئے حصّے کو دھو کر صاف کر دیتا ہے اگر تم اپنی آنکھ کے نچلے پپوٹے کے اندرونی کونے کو دیکھوگے تو تمھیں وہاں ایک بہت باریک سوراخ نظر آئے گا آنکھ کا زائد پانی اس راہ سے بہہ کر نکل جاتا ہے۔ کیا تم کو یہ معلوم ہے کہ وہ کہاں جاتا ہے؟ جب تم بہت روتے ہو تو کیا تم کو اپنی ناک نہیں صاف کرنی پڑتی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنسو ناک میں اُتر جاتے ہیں۔ جب تک ہم جاگتے رہتے ہیں یہی عمل ہوتا رہتا ہے جو ہماری آنکھوں کو تر اور صاف کرتا رہتا ہے۔ جب ہم روتے ہیں تو ہمارے آنسو ضرورت سے زیادہ بن جاتے ہیں اور نچلے پپوٹے کے کنارے سے چھلک کر گالوں پر بہنے لگتے ہیں۔ تمھاری جب ہم روتے نہیں ہیں تو آنسو کار آمد ہیں کہ بغیر ان کے چارہ نہیں۔ لیکن ان کو زیادہ تعداد میں بہانا بیکار ہے۔

پیام برادری

عزیز بچو اور بچیو! خوش رہو اور تندرست۔ تمھیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ تمھاری آپا جان اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ (۱۶ را پریل جمعہ) اس اچانک خبر سے تمھیں بہت رنج ہوگا۔ آپا جان کوئی دو برس سے بیمار تھیں۔ مگر حکیموں اور ڈاکٹروں نے مرض پہچانا نہیں۔ آخر میں اب سے کوئی دو مہینے پہلے ایکس رے کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ بیماری اتنی ترقی کر گئی ہے کہ دوا و علاج بے کار ہے۔ آپا جان مرحومہ اب سے آٹھ نو برس پہلے جرمنی سے آئی تھیں۔ محض خدمت کا جذبہ انھیں اتنی دور کھینچ کر لایا تھا۔ یہاں تھوڑے دنوں میں وہ جامعہ کے رنگ میں رنگ گئیں اور کچھ اس محبت اور خلوص سے انھوں نے جامعہ والوں کے ساتھ مل کر کام کیا کہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا جامعہ کی ہر چیز سے انھیں محبت تھی۔ پیام تعلیم سے انھیں جو تعلق تھا اور اس کے لئے انھوں نے جو کام کیا ہے وہ تمھیں معلوم ہی ہے اسی لئے جامعہ میں اُن کی موت کو کچھ اس طرح محسوس کیا جا رہا ہے جیسے کوئی بہت ہی قریبی عزیز اُن کے درمیان سے اُٹھ گیا ہو۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

پچھلے چند مہینوں میں لڑائی کا رنگ بہت بے رنگ رہا۔ روس کے محاذ میں جب تک خوب سردیاں رہیں اس وقت تک تو روسی برابر آگے بڑھتے رہے مگر جوں جوں سردی کم ہونی شروع ہوئی روسی حملوں میں وہ شدت اور تیزی کم ہونے لگی اس کے مقابلے میں جرمنی کے حملوں کی شدت بڑھنے لگی۔ جرمنوں نے خارکوف پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ روسیوں نے اِنھی سردیوں میں اسے جرمنوں سے چھین لیا تھا۔ پھر بھی روسی فوجیں اس جرمن مصیبت کا پوری بہادری اور دلیری سے مقابلہ کر رہی ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ اپنے بس بھر ان کی مدد کر رہے ہیں مگر یہ امداد روسیوں کی توقع سے کم ہے۔ علاوہ اس کے روسی بہت دنوں سے اس بات کی خواہش کر رہے ہیں کہ یورپ میں جرمنی کے خلاف لڑائی کا ایک اور میدان قائم کیا جائے تاکہ روس پر جرمن فوجوں کا جو دباؤ ہے وہ ہلکا پڑے لیکن امریکہ اور برطانیہ اب تک اس کا بندوبست نہ کر سکے۔ پچھلے دنوں انھوں نے چند چھوٹے چھوٹے تجربے کئے مگر اس میں انھیں کامیابی نہ ہوئی۔ افریقہ میں میدانِ جنگ اب تک انگریزوں کے ہاتھ میں ہے۔ آٹھویں فوج دھاوے پہ دھاوے مارتی ہوئی تیونیشیا پہنچ گئی ہے اور جنرل رومیل کی جرمن اور اٹالین فوجوں کو برابر پیچھے دھکیل رہی ہے تازہ خبریں یہ ہیں کہ اتحادیوں یعنی امریکہ اور جرمنی کی فوجوں نے سفاکس اور قیروان پر قبضہ کر لیا ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر کو لڑائی کے اس میدان کی کچھ زیادہ فکر نہیں ہے اور وہ چاہتا ہے کہ انگریزی فوجیں اس لڑائی میں مصروف اور الجھی رہیں اور انھیں یورپ میں لڑائی کا میدان بنانے کا موقع نہ ملے۔

بحرالکاہل میں جاپان اور اتحادیوں کی لڑائی برابر جاری ہے کہیں کہیں امریکی فوجوں کو کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ مگر موجودہ لڑائی میں یہ کامیابیاں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں نہ اُن سے جاپان کی طاقت پر کوئی خاص اثر پڑا ہے۔ کچھ دنوں پہلے یہ خبر تھی کہ آسام کی سرحد سے برما پر چڑھائی ہونے

والی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس چڑھائی کے لئے ابھی مناسب وقت نہیں آیا ہے نہ ابھی تیاریاں مکمل ہیں۔ اراکان کی مہم میں بھی انگریزوں کو کچھ ایسی کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن یہ طے ہے کہ برما پر چڑھائی ضرور ہوگی اور اتحادی فوجیں برما پر دوبارہ قبضہ کرکے ہی دم لیں گی۔ جاپان نے بنگال اور آسام کے بعض علاقوں پر ہوائی حملے بھی کئے ہیں مگر ان سب جھگڑوں میں ان کے ہوائی جہازوں کو سخت نقصان پہنچا ہے۔

ادھر چین بھی جیسے تیسے جاپان کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اس پر ایک مصیبت اور آئی ہے۔ چند چینی صوبوں میں بہت سخت قحط پڑ گیا ہے اور پچاس لاکھ آدمی اس قحط کی زد میں ہیں مگر آزاد چین ان سب مصیبتوں کو بڑی مردانگی کے ساتھ جھیل رہا ہے۔ اب سے نہیں، چھ سات سال سے چین ہمارا پڑوسی ہے۔ اس لئے اس کی مصیبتوں سے ہمیں سب سے زیادہ ہمدردی ہے۔ کاش ہم اس کی کچھ مدد کر سکتے۔

ہندوستان میں دو تین مہینے سے سکون کی حالت ہے۔ مہاتما گاندھی کے اکیس دن کے روزے نے ہلچل پیدا کر دی تھی۔ روزے کی حالت میں مہاتما جی کی حالت کئی بار نازک ہو ہو گئی اور سارے ملک میں بڑی بے چینی پھیل گئی مگر حکومت انھیں رہا کرنے پر رضامند نہ ہوئی حکومت کا خیال ہے کہ پچھلی اگست سے ملک میں جو گڑبڑ شروع ہوئی اس میں کانگریس کا ہاتھ ہے مہاتما جی کو اس سے انکار ہے مگر حکومت نے مہاتما جی کے اس انکار کو تسلیم نہیں کیا وہ اپنی بات پر اڑی ہوئی ہے۔ مہاتما جی کے روزے کے زمانے میں حکومت نے ایک رسالہ بھی شائع کیا جس میں یہ بتایا ہے کہ پچھلی گڑبڑ میں ملک کا کتنا نقصان ہوا اور کانگریس اس کے لئے کس حد تک ذمے دار ہے اسی طرح کا ایک رسالہ یا کتابچہ سفید دستاویز کے نام سے انگلستان سے بھی شائع ہوا ہے اس میں بھی کانگریس پر قریب قریب وہی الزام لگائے گئے ہیں۔ کانگریس والے ان رسالوں اور کتابچوں کو یک طرفہ کہتے ہیں۔

مسٹر راج گوپال چاری اور دوسرے ہندوستانی لیڈروں نے موجودہ صورت حال کو ختم کرنے کے لئے یہ تجویز کی تھی کہ چند لیڈروں کا ایک وفد وائسرائے سے ملے اور ہندوستان کے اہم معاملات پر بات چیت کرے مگر وائسرائے نے ایسی شرطیں پیش کیں کہ ان لیڈروں نے وائسرائے سے ملنا اپنی خودداری کے خلاف سمجھا اور گفت و شنید یا بات چیت کا یہ دروازہ جانے کب تک کے لئے بند ہو گیا۔

کچھ عرصے سے سندھ میں پیر پگاڑو کے مریدوں میں بہت ہیجان اور اشتعال پھیلا ہوا تھا۔ اب حکومت نے پیر پگاڑو کو پھانسی دے دی اُن کے سکرٹری اور خاص خاص مرید بھی پھانسی کے تختے پر لٹکا دئے گئے اور اب سندھ میں بڑی حد تک امن ہے۔ پیر پگاڑو، مرحوم کا اصلی نام سید صبغۃ اللہ شاہ ہے۔ ان کے آباؤ اجداد عرب سے آئے تھے اور انھوں نے سندھ میں مسلمانوں کی بہت خدمت کی۔ اس خاندان کی کئی گدیاں ہیں۔ پیر پگاڑو کی گدی سب سے بڑی تھی اور مریدوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی تھی۔ ان مریدوں کی کئی قسمیں ہیں۔ عام مرید، حر اور لر وغیرہ ان میں حر بہت بے ڈھب قسم کے مرید ہیں۔ بہت پرجوش نڈر اور بہادر اور مخلص یہ تمام شور انھی لوگوں نے مچایا تھا اور انھی کو حکومت سزائیں بھی دے رہی ہے۔ آج کل سندھ میں مسلم لیگ کی وزارت ہے۔

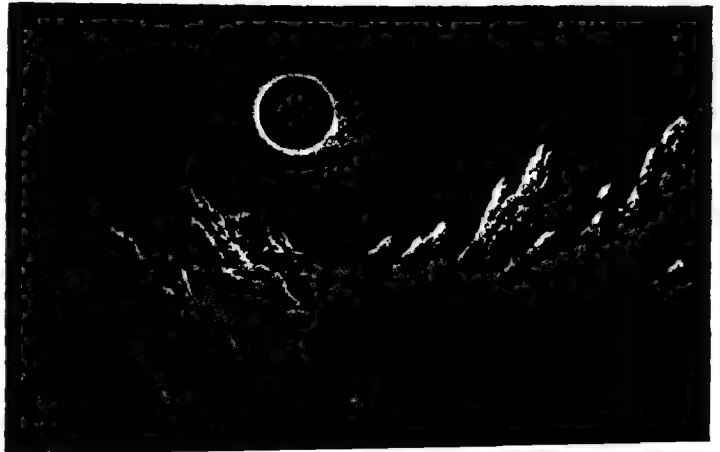
(محمد حسین حسان)



لوئی پاسچر



دو ننھے بھائی نجمہ اور نجمی

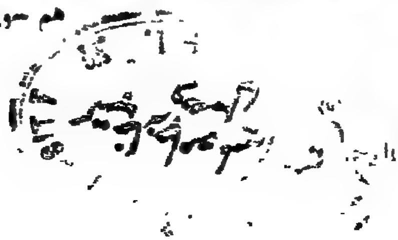


چاند کے ایک پہاڑی حصے کا منظر سامنے جو ستارہ نظر آرہا ہے یہ زمین ہے - یہ اس وقت چاند اور سورج کے بیچ آگئی ہے

Regd. No: L: 1961



ہم سوتے کیوں ھیں (صفحہ ۹۱)



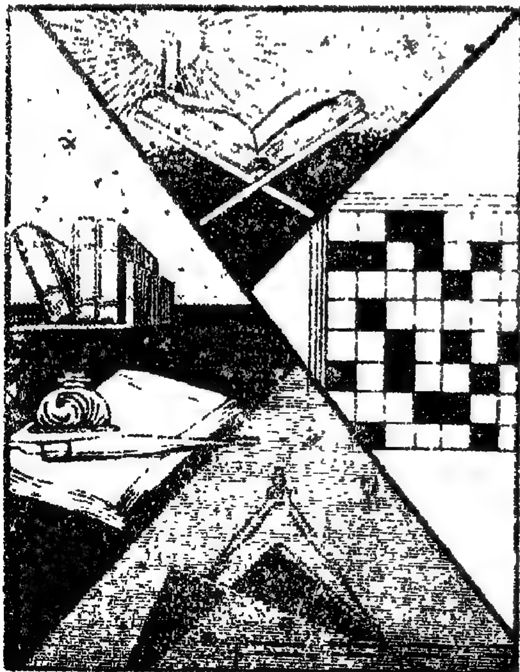


ہم روتے کیوں ھیں (صفحہ ۹۳)

اپریل
۱۹۴۲

تعلیم و تربیت





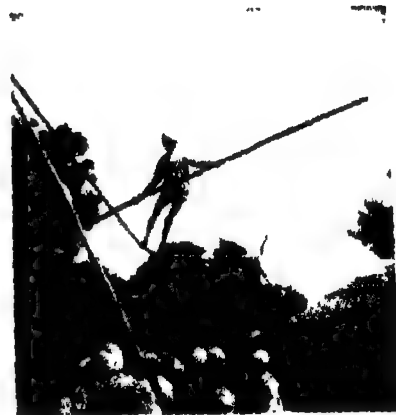
FIROZE 42



دریائے سندھ کا ایک حصہ



ایک برفانی پہاڑ پر چڑھائی کا طریقہ



نٹ



جلد ۲۶ نمبر ۴ ۔ اپریل سنہ ۴۳ء قیمت سالانہ عہ ۸ر فی پرچہ ۳ر

فہرست مضامین

نمبر	مضمون	مصنف	صفحہ
۱	بچوں سے باتیں	ایڈیٹر	۹۸
۲	آپا جان کی وفات	محمد شفیع الدین نیر	۹۹
۳	چوکنا تیتر	محمد سلیم الرحمٰن	۱۰۰
۴	کاچھ	محمد بن مہدی نقوی	۱۰۳
۵	کاغذ کی گرانی	محمد شفیع الدین نیر	۱۰۴
۶	ہماری زمین		۱۰۶
۷	لطیفے	عبداللہ ناصر	۱۱۰
۸	دریائے سندھ کی کہانی	محمد عبدالغفور ایم اے	۱۱۱
۹	سائنس دانوں کی کہانی	سید نورالحسن ہاشمی	۱۱۳
۱۰	دریا سے حیات	فضل الدین اثر	۱۱۷
۱۱	ہم کیوں سوتے ہیں	مشتاق احمد بی اے	۱۲۰
۱۲	آگرے کا خیال	مجیب الرحمٰن عثمانی	۱۲۴
۱۳	مچھلی یا آدمی	فیروز آرٹسٹ	۱۲۶
۱۴	پیام برادری (آپا جان)	ایڈیٹر	۱۲۷

پرنٹر پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی۔ محبوب المطابع پریس، دہلی

بچّوں سے باتیں

ابھی ابھی تھوڑے دن ہوئے مارچ کا پرچہ تمیں ملا ہوگا۔ اب یہ اپریل کا بھیجا جا رہا ہے۔ مئی کا رسالہ بھی قریب قریب تیار ہے اور بہت جلد شائع ہوگا۔

ہمارے بعض بزرگوں نے اپریل کے پرچے کے لئے آپا جان مرحومہ پر مضمون لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر مصروفیت کی وجہ سے مضمون مکمّل نہ کر سکے اور ہمیں رسالہ جلد چھاپنے کی جلدی تھی۔ کوشش کی جائے گی کہ یہ مضمون مئی کے پرچے میں چھپ جائے۔

ایک مضمون محترمہ آپا جان مرحومہ کا ہمیں اپنے مسودوں میں ملا ہے۔ یہ سوئیٹر بننے کے متعلق ہے۔ آپا جان مرحومہ نے لڑکیوں کے لئے لکھا تھا۔ ہم اس کا ترجمہ کرا رہے ہیں۔

دریائے سندھ کی کہانی اس پرچے میں ختم ہوئی اگلے پرچے میں پروفیسر محمد عبدالغفور صاحب کا ایک اور نہایت دلچسپ مضمون "بچّوں کی دکان" شائع ہوگا۔ پروفیسر صاحب کی ایک کتاب بھی مکتبے کی طرف سے چھپنے والی ہے۔ یہ کتاب بچّوں کے لئے بہت ہی دلچسپ ہوگی۔

معمّے کے کوپن پہلے آٹھ چھپتے تھے۔ اب جگہ کی کمی کے سبب کل چار چھپتے ہیں۔ بہت سے پیامیوں کے شکایتی خط ہمارے پاس آتے ہیں اور ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ لڑائی ختم ہونے تک وہ ہاتھ کے لکھے ہوئے کوپن بھی بھیج سکتے ہیں۔

معمّے کا انعام بڑھانے کے لئے ہم بڑی خوشی سے تیار ہیں مگر یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ پیامی ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ حل بھیجیں۔

پیام تعلیم کا اگلا معمّا مئی میں شائع ہوگا۔

آپا جان کی وفات

محمد شفیع الدین نیرؔ

چھوڑ کر بچوں کو آپا جانؔ[1] رخصت ہو گئیں
سن کے کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ[2] رخصت ہو گئیں

جامعہ کے ساتھ جو پیمان باندھا تھا کبھی
کر کے پورا اپنا وہ پیمان رخصت ہو گئیں

آرزو یہ تھی کہ خدمت قوم کی کرتی رہیں
دل کا دل میں رہ گیا ارمان رخصت ہو گئیں

رنگ لائی جو محبت دل میں تھی اسلام کی
یعنی بن کر صاحبِ[4] ایمان رخصت ہو گئیں

ان کے دم سے جامعہ کے باغ میں تھی اک بہار
باغ کو اب کر کے وہ ویران رخصت ہو گئیں

رات دن بچوں کی خدمت بس یہی تھا ان کا شغل
کر کے سب بچوں پہ وہ احسان رخصت ہو گئیں

سختیوں میں اور ان کا مسکرانا بڑھ گیا
سچے مسلم کی دکھا کر شان رخصت ہو گئیں

اپنے اخلاق اپنے ایثار اپنی خدمت کے طفیل
بن کے سچ مچ جامعہ کی جان رخصت ہو گئیں

جان لیوا تھا مرض آخر وہ جاں لے کر ٹلا
کر سکیں اس کا نہ کچھ درمان رخصت ہو گئیں

جامعہ کی مشکلوں میں وہ رہیں دل سے شریک
مشکلیں جب ہو چلیں آسان رخصت ہو گئیں

ان کو نیرؔ ہو جوارِ رحمتِ یزداں نصیب
بن کے جو دو روز کو مہمان رخصت ہو گئیں

۱؎ مرحومہ مس گرڈا فلس بورن ۲؎ دنیا کی ہر چیز کے لئے فنا ہے ۳؎ مرحومہ نے اپنی زندگی جامعہ کی خدمت کے لئے وقف کر رکھی تھی ۴؎ انتقال سے پہلے مرحومہ نے دینِ اسلام کی سعادت حاصل کر لی تھی۔

چوکنا تیتر

محمد سلیم الرحمن علی گڑھ

کسی گھنے جنگل میں ایک بوڑھا تیتر رہتا تھا، اس کا نام سبز تیتر تھا، جب شکاری پرندوں کو دانہ ڈالنے آتے تو وہ دور بھاگ جاتا اور جب شکاری چلے جاتے تو وہ آتا اور بچے کچھے دانے کھالیتا سب پرندے اسے احمق سمجھتے تھے، ایک دن ایک تیتر نے جس کا نام چڑ بڑ تھا اس سے پوچھا "جب آدمی دانہ بکھیرتے ہیں تو تم چپ کیوں جاتے ہو؟"

سبز تیتر نے جواب دیا "میں کبھی آدمیوں پر بھروسا نہیں کرتا!"

چڑ بڑ نے ہنستے ہوئے کہا، "تم ان پر بھروسا کیوں نہیں کرتے یہ تو بہت اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

سبز تیتر۔ بیٹا تم ابھی بچے ہو، میں نے ایسے تماشے بہت دیکھے ہیں، سنو ایک دن یہ آدمی کتے لے کر آئیں گے اور جب پرندے اڑیں گے تو یہ اپنی گرج دار لکڑیوں سے انھیں مار دیں گے۔

چڑ بڑ۔ گرج دار لکڑی کیسی ہوتی ہے۔

سبز تیتر۔ آدمی ان لکڑیوں کو اپنی بغل میں دبائے رہتے ہیں اور جب اوپر اٹھاتے ہیں تو ان میں سے گرج کی آواز نکلتی ہے، آدمی اس لکڑی کو بندوق کہتے ہیں۔

چڑ بڑ۔ چچا تم کو عجیب عجیب باتیں معلوم ہیں مگر مجھے ہرگز اس بات کا یقین نہیں آتا بھلا جو ہمیں دانہ ڈالتے ہیں وہ ایسا کریں گے اور بلا وجہ ہمارے دشمن بن جائیں گے۔

سبز تیتر۔ اگر تمھاری عمر بھی میری برابر ہوتی تو تم کو سب کچھ معلوم ہو جاتا کہ آدمی کی دوستی اور دشمنی کا کیا مطلب ہے، تم اگر میرا کہنا مانو تو تم بھی بڑی عمر پا سکتے ہو۔

چڑ بڑ یہ باتیں سن کر بہت ڈرا۔ اسے سبز تیتر کی عقل مندی اور تجربہ پر بھروسا تھا۔ اس لئے اپنے دل میں ارادہ کر لیا کہ سبز تیتر کے کہنے پر چلا کرے گا، اس دن سے چڑ بڑ، سبز تیتر کے ساتھ رہنے لگا۔

دوسرے پرندوں نے اس کا خوب مذاق اڑایا، ایک دن چڑ بڑ کے ایک پرانے دوست نے کہا کہ اب کے تم بڑے گھاٹے میں ہو آدمیوں نے کھیت کاٹ کر کھلیان کر لئے ہیں اور ہم سب خوب مزے سے دانہ چگتے ہیں تم جانے کہاں دبکے ہوئے پڑے رہتے ہو۔ یہ باتیں سن کر میاں چڑ بڑ کا بھی جی للچایا اور ایک روز صبح سویرے جب سبز تیتر سو رہا تھا وہ بھی اور پرندوں کی طرح کھیتوں کی طرف چلنے کو تیار ہو گیا، ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک گرج کی آواز سنائی دی۔

یہ آواز سن کر سبز تیتر جاگ اٹھا اور چڑ بڑ کو زور زور سے آوازیں دینے لگا، چڑ بڑ بھاگا ہوا واپس آیا اور کہا، چچا گرج کی کیسی آواز آ رہی ہے؟

سبز تیتر۔ یہ بندوق کی گرج ہے، آسمان تو دیکھو بالکل صاف ہے بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہیں۔

یہ سن کر چڑ بڑ گھبرایا ہوا کھیتوں کی طرف دیکھنے لگا اور

ایک دم بولا "ارے، آدمی کتے لے کر آ رہے ہیں"۔

سبز تیتر۔ کتے کتنی دور ہیں؟

چڑ پڑ۔ (ایک سوکھے درخت کی شاخ پر چڑھ کر) چچا ابھی بہت دور ہیں۔

سبز تیتر۔ جلدی نیچے آؤ اور میرے پیچھے دوڑتے ہوئے چلو۔

چڑ پڑ۔ (گھبرا کر پیچھے بھاگتے ہوئے) چچا تم کہاں جا رہے ہو؟

سبز تیتر۔ میں ایک گاؤں کی طرف جا رہا ہوں، وہاں ایک عمارت ہے، اس میں ایک بوڑھی عورت رہتی ہے، عمارت کے ارد گرد ایک باغ ہے، اس میں ایک گھنی باڑھ ہے، ہم اس میں چھپ جائیں گے۔

دونوں تیتر خوب تیز بھاگ رہے تھے اور گرج کی آواز نزدیک ہوتی جاتی تھی۔

چڑ پڑ۔ چچا اب ہم کو ضرور اڑنا چاہیئے۔

سبز تیتر۔ نہیں نہیں، ہرگز نہیں! اگر ہم اڑیں گے تو دیکھ لئے جائیں گے اور اگر ہم دیکھ لئے جائیں گے تو ہمیں گولی ماردی جائیگی اور ہم مرجائیں گے۔

چڑ پڑ۔ گولی کیا چیز ہوتی ہے؟

سبز تیتر۔ باتیں مت کرو! تیز بھاگو!!

آخر بھاگتے بھاگتے دونوں جنگل کے کنارے پر پہنچ گئے۔ گرج کی آواز اب بھی انھیں پاس ہی معلوم ہوتی تھی۔

سبز تیتر نے ذرا پیچھے مڑ کر دیکھا اور چڑ پڑ سے کہا اب ہم جنگل کی حد سے باہر نکل آئے ہیں ہمیں خوب تیز دوڑنا چاہیئے۔

چڑ پڑ۔ چچا اب ہمیں ضرور اڑنا چاہیئے اگر ہم کھیتوں میں دوڑیں گے تو دیکھ لئے جائیں گے۔

سبز تیتر۔ میرے پیچھے چلے آؤ یہاں ایک گہری خندق ہے (خندق میں اترتے ہوئے) اس میں اتر آؤ اور بھاگ چلو۔ اب ہمیں کوئی نہ دیکھ سکے گا۔

چڑ پڑ کا دل نہ چاہتا تھا مگر خندق میں اتر کر اس کے پیچھے دوڑنے لگا، اتنے میں انھوں نے اپنے سروں پر پروں کی آواز سنی، دونوں نے دیکھا کہ دو تیتر جنھیں وہ خوب جانتے تھے۔ بڑی تیزی سے اڑے جا رہے ہیں۔

چڑ پڑ کا دل بے اختیار چاہا کہ وہ بھی اُن کے ساتھ اُڑ چلے کہ اک دم گرج کی آواز آئی اور اڑتے ہوئے تیتروں میں سے ایک قلابازیاں کھاتا ہوا زمین پر گر گیا، سبز تیتر نے چلّا کر کہا، سر نیچے کر کے تیز دوڑو، وہ بے چارہ گرج دار لکڑی سے مر گیا ہے، یہ سُن کر چڑ پڑ کے کان کھڑے ہوگئے اور سر جھکا کر بہت تیز دوڑنے لگا۔

آخر کار دہ گھنی باڑھ تک پہنچ گئے، سبز تیتر اُچک کر ایک جھاڑی میں گھس گیا اور اس کے پیچھے چڑ پڑ بھی۔ دونوں کا سانس پھولا ہوا تھا۔

سبز تیتر اپنے پر جھاڑ کر زمین پر بیٹھ گیا مگر چڑ پڑ ڈری ہوئی نظروں سے جھاڑیوں میں جھانکنے لگا اور چلّایا۔ چچا بھاگو وہ ادھر آ رہے ہیں۔

سبز تیتر کی آنکھ لگ گئی تھی اُس نے آنکھ کھول کر کہا، چپ رہو، یہاں کوئی نہیں آتا، سبز تیتر پھر بے خبر سو گیا۔ مگر چڑ پڑ کو نیند نہ آئی اور ڈر لگتا رہا۔

بہت دیر بعد سبز تیتر کی آنکھ کھلی اور اپنے پر جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا چڑ پڑ جاگ رہا تھا۔

سبز تیتر۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔

چڑپڑ۔ مجھے بھی۔

سبز تیتر جھاڑی سے نکلا اور مکان کی طرف جہاں پھولوں کی ایک کیاری کے پاس ایک بوڑھی عورت کرسی پر بیٹھی تھی چلا، چڑپڑ عورت کو دیکھ کر سہم گیا اور آگے نہ بڑھا۔

بوڑھی عورت نے بیٹھے ہی سبز تیتر کو دیکھا فوراً آواز دی "گلزار! گلزار!! ہمارا پرانا تیتر پھر آگیا، اس کے لئے دانہ لاؤ"

گلزار، اچھا اماں کہہ کر دانہ لے آئی، سبز تیتر نے پیٹ بھر کر کھایا اور چڑپڑ کو آواز دی "آجاؤ یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

چڑپڑ دوڑتا ہوا آیا، بوڑھی عورت اسے دیکھ کر اور زیادہ خوش ہوئی اور گلزار سے کہا۔ ان کے لئے اور دانہ لاؤ۔

سبز تیتر اور چڑپڑ نے خوب اطمینان سے دانہ کھایا اور باغ میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔

سبز تیتر نے کہا، اب شکار کے موسم تک ہم یہیں رہیں گے

چڑپڑ کا خوف دور ہو گیا تھا اس نے کہا "اچھا، مگر چچا یہ کیا بات ہے کہ بعض آدمی تو ہم پر مہربان ہوتے ہیں جیسے یہ بوڑھی عورت، اور بعض ظالم جیسے شکاری"

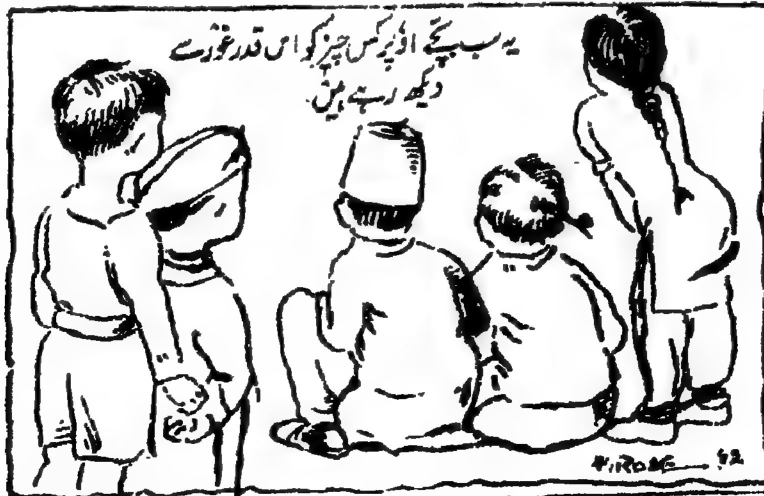
سبز تیتر۔ یہ ایک ایسا بھید ہے جسے میں نہیں جانتا۔

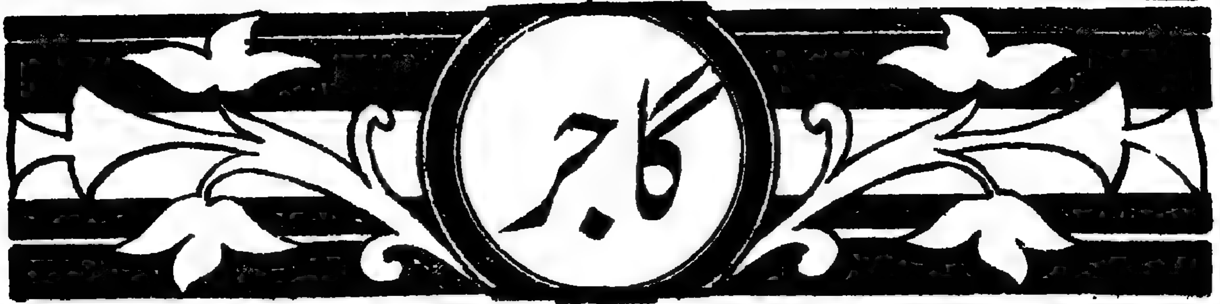
چڑپڑ۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہر ایک بات جانتے ہو۔

سبز تیتر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "بیٹا میرے لئے اتنی بات کافی ہے کہ میں دوست اور دشمن کو پہچاننے میں کافی تجھ دار ہوں اور یاد رکھو جیسے دوست، دشمن کی پہچان ہو وہ بغیر تکلیف اٹھائے خوشی کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔"

چڑپڑ نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا، یہ بات سچ ہے اور میں بہت خوش ہوں کہ تم جیسا دوست مجھ ملا جس نے مصیبت کے وقت جان بھی بچائی اور سمجھ کی باتیں بھی سکھائیں۔

غرض شکار کا موسم گزرنے تک وہ دونوں اطمینان اور خوشی سے وہاں رہتے رہے اور پھر جنگل کی طرف اُڑ گئے۔





(محمد بن مہدی نقوی امروہا)

ترکاریوں میں گاجر بڑی اچھی ترکاری ہے۔ نہیں نہیں بڑا اچھا پھل ہے۔ جاڑوں کا بڑا اچھا میوہ ہے۔ جاڑوں میں پیدا ہوتی ہے۔ چار۔ چھ پیسے سیر چاہے جتنی خرید لو۔ اتنی سستی ہے اور افراط سے پیدا ہوتی ہے اسی لئے اس کی قدر نہیں۔ سیب، سنترہ اور انگور کے سامنے تو اسے کوئی ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔ مگر ہم سے جو پوچھو تو اس میں بڑے گُن بھرے ہیں۔ ذرا اسے نہلا دھلا کر دیکھو کیا خوش رنگ ہے۔ صورت بھی اچھی سیرت بھی اچھی۔

اور ہاں بھئی اس میں حیاتین بھی تو موجود ہیں تینوں حیاتین۔ حیاتین نہیں جانتے ہو جنھیں وٹامین کہتے ہیں ابھی تھوڑے ہی دن تو ہوئے پھلوں وغیرہ میں ان کا پتہ لگا ہے اور ابھی کل تین ہی دریافت ہوئی ہیں A . B . C یا الف۔ ب۔ ج۔ یہ تینوں حیاتیں ہماری زندگی قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ حیاتیں الف تو آنکھوں کی روشنی اور جسمانی نشوونما کے لئے ہے۔ ب بدہضمی دور کرنے رگ پٹھوں کو مضبوط بنانے اور بھوک بڑھانے کے لئے اور ج مسوڑھوں کے پیلے پن اور پائیریا جیسے موذی مرض کو دور کرنے کے لئے۔ تو جناب یہ تینوں حیاتین گاجر میں موجود ہیں۔ لیکن اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ اسے استعمال کرتے وقت اس کی یہ مفید چیزیں ضائع نہ ہونے پائیں ورنہ مٹی اور گاجر دونوں برابر۔ لوگ اس کا حلوا بنا کر کھاتے ہیں ترکاری کی جگہ استعمال کرتے ہیں اس طرح پکانے سے مزا تو آجاتا ہے لیکن فائدہ کافور ہوجاتا ہے۔ کچی اور پکی گاجر میں ایسا ہی فرق ہے جیسا اصلی اور مکھن نکلے ہوئے دودھ میں۔

شام کو دو چار گاجریں تراشیں اور کھالیں۔ کبھی کبھی شکر کے ساتھ۔ وہ بھی کچھ یوں ہی مزہ منہ کا بدلنے کے لئے۔ صبح ناشتہ کے لئے گاجریں کس کر یا باریک باریک تراش کر ہلکی آنچ پر پکالیں ذرا سی شکر ملائی اور بس مزے سے لے کر کھا گئے۔ پھر دیکھیئے۔ نہ باریک لکھے ہوئے کی شکایت نہ سبق یاد نہ ہونے پر استاد کا ڈر اور نہ کھیل کود میں تھکن اور گھبراہٹ۔ خوب کھانا ہضم ہوگا اور خوب بھوک لگے گی۔ چند ہی دن کے استعمال کے بعد آنکھوں میں روشنی، چہرے پر سرخی اور جسم میں چستی معلوم ہونے لگے گی۔

کاغذ کی گرانی

محمد شفیع الدین نیّر

کاغذ کی گرانی سے عجب حال ہوا ہے
اک شور سا اس ملک میں ہر سمت بپا ہے

کاغذ نہیں ملتا۔ کہیں کاغذ نہیں ملتا
کاغذ کے طلب گاروں کے لب پر یہ صدا ہے

ظاہر میں تو ہر جنگ کی انسان ہیں خوراک
پر جنگ کے اس دیو کی کاغذ بھی غذا ہے

گھی، گیہوں، شکر، تیل کا رونا تھا ہمیشہ
اس جنگ میں کاغذ کے لئے آہ و بکا ہے

ہر کاغذی کاغذ کو ہے اس طرح چھپاتا
جس طرح گناہوں کے چھپانے کی ادا ہے

کمیابی پہ پابندیاں بالکل وہ مثل ہے
کڑوا جو کریلا تھا وہ اب نیم چڑھا ہے

کاغذ کا جو رِم ملتا تھا دو تین روپے میں
اب چوگنی اور پچ گنی قیمت سے سوا ہے

نایابی کاغذ کا نمایاں یہ اثر ہے
اخبار یہ آج اور وہ کل بند ہوا ہے

اخبار نکلتے ہیں جو، یہ شان ہے اُن کی
چوتھائی ضخامت بھی اگر ہے تو بجا ہے

ہر ماہ نکلنے کا ہے جن پرچوں کا دستور
دو تین مہینے میں بھی نکلیں تو روا ہے

بچّوں کے رسالوں کا بھی عالم ہے نرالا
اب لوح کا اُن کی نہ نشاں ہے نہ پتا ہے

تصویریں ہیں، نقشے ہیں، نہ شکلیں ہیں نہ خاکے
مضمون ہیں پر حسنِ ادا ہے نہ مزا ہے

ہوتی تھی جلی جن کی کتابت وہ رسالے
چھپتے ہیں خفی خط میں یہ انداز نیا ہے

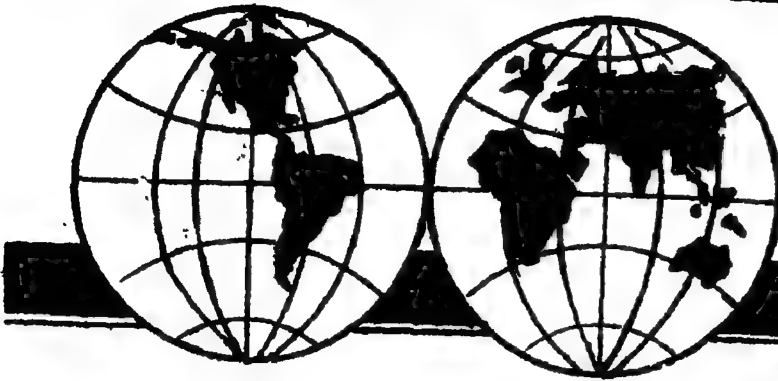
کچھ بند ہوئے چند جو جاری ہیں ابھی تک
اس دور میں اُن کا بھی نگہبان خدا ہے

اُس ماہ جو نکلا بھی تو اِس ماہ ندارد
ہے یہ وہ مرض جس کی نہیں کوئی دوا ہے

کاپی ہو، کتابیں ہوں رسالے ہوں کہ اخبار
شاید کہ ابھی سب کے نصیبے میں فنا ہے

اللہ کرے جلد ہو اب ختم لڑائی
ہر اک کی زباں پر یہی اب صبح و مسا ہے

پھر از سرِ نو ہند میں ہو علم کا چرچا
نیّرؔ کی بھی دن رات خدا سے یہ دُعا ہے۔



ہماری زمین

میں صبح تڑکے روز ٹہلنے جاتا ہوں۔ ہمارے حبیب میاں تھوڑی دیر بعد سو کر اٹھتے ہیں اور اٹھتے ہی پوچھتے ہیں "بھائی جی کہاں گئے؟" اگر کسی نے کہہ دیا ٹہلنے گئے ہیں تو بس آفت آ گئی۔ بہت جھنجلاتے ہیں چیختے ہیں، شور مچاتے ہیں۔ ایک دن میں ٹہل کر واپس آیا تو حبیب میاں بہت خفا تھے۔ منہ پھولا ہوا۔ کسی سے بات ہی نہیں کرتے ہیں۔ میں نے انھیں گود میں اٹھایا اور پوچھا کیوں صاحب آج کس پر خفگی ہے۔ کیا پھوپی نے کچھ کہا ہے؟" منہ پھیر کر کہنے لگے "ہم آپ سے نہیں بولتے۔ آپ روز ٹہلنے جاتے ہیں ہمیں نہیں لے جاتے؟" میں نے کہا "اچھا بھئی تم روز تڑکے سے اٹھ بیٹھا کرو پھر ہم تم ساتھ چلا کریں گے۔" حبیب میاں نے خوش ہو کر کہا "بھائی جی اب ہم روز تڑکے خوب تڑکے اٹھا کریں گے!"

دوسرے روز میں سو کر اٹھا تو حبیب میاں اپنی خالہ بیگم سے منہ دھلوا رہے تھے بڑی جلدی میں تھے کہہ رہے تھے "بس جلدی ہی کپڑے پہنا دو نہیں تو بھائی جی چلے جائیں گے۔"

جونہی میری طرف دیکھا آنکھیں مٹکائیں زور سے تالی بجائی اور خوب زور سے قہقہہ لگایا۔ مطلب یہ تھا کہ آج تم ہمیں کیسے چھوڑ جاؤ گے۔ فہمیدہ بی مسکرا کر بولیں: "باپ پر پوت پرایت گھوڑا۔ بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ تمھیں یہ بیماری ہے تو اسے بھی ضرور لگے گی۔ آج اسے ضرور لے جانا نہیں تو بہت آفت مچائے گا۔" میں نے کہا اگر صبح کو ٹہلنا کوئی بیماری ہے تو خدا کرے یہ بیماری سب کو لگ جائے۔ "اچھا اسے جلدی سے تیار کر دو نہیں تو دیر ہو جائے گی" حبیب کو دیکھ کر واجد میاں کا بھی جی للچایا۔ کہنے لگے "پیارے بھائی ہم بھی چلیں گے۔" ادھر ماموں صاحب بھی نماز اور وظیفے سے فارغ ہو چکے تھے۔ بچوں کو دیکھ کر ان کے دل میں بھی امنگ پیدا ہوئی۔ کہنے لگے "چلو بھائی آج ہم بھی چلیں!" میں نے دل میں کہا "یہ اچھا ہوا حبیب میاں کہیں تھک گئے تو سواری تیار ملے گی۔" غرض تھوڑی دیر بعد یہ قافلہ سیر کو نکلا

حبیب میاں خوب اُچھل کود رہے تھے، واجد میاں بھی خوب خوش تھے۔ ماموں جی کے چہرے پر بھی کچھ تازگی سی تھی۔ ہر دوئی کوئی ایسا بڑا شہر تو ہے نہیں۔ ایک دو فرلانگ کے بعد ہی آبادی ختم اور میدان شروع ہو گیا۔ اب حبیب میاں کو اور آزادی ملی کبھی ادھر دوڑتے کبھی اُدھر بھاگتے۔ واجد میاں انھیں پکڑنے کی کوشش کرتے۔ دونوں یونہی بھاگ دوڑ کر رہے تھے کہ آگے جاکر ٹھٹک گئے سامنے کوئی چیز تھی اسے کانٹے دار ٹہنیوں سے گھیر دیا گیا تھا۔ اتنے میں میں اور ماموں صاحب بھی قریب آگئے۔ واجد میاں کہنے لگے "ارے پیارے بھائی کنواں!" میں نے بھی جھانک کر دیکھا اچھا خاصا گہرا کنواں تھا۔ واجد میاں نے پوچھا پیارے بھائی اس میں پانی کیوں نہیں ہے۔ اور اس کے چاروں طرف کانٹے کیوں بچھا دئے گئے ہیں۔ میں نے کہا "پہلے اس کنوئیں میں سے کھیتوں کو پانی دیتے ہوں گے۔ پھر نہریں اور جوگڑ کُھد گئے۔" ماموں صاحب نے کہا "وہ دیکھو سامنے نہر نظر آرہی ہے۔ وہ جو پل ہے پل وہ اسی نہر پر تو ہے۔" میں نے کہا "تو ان نہروں اور جوگڑوں کی وجہ سے کنوئیں کی ضرورت تو رہی نہیں۔ لوگوں نے اس سے پانی نکالنا بھی چھوڑ دیا اور یہ کوڑے کرکٹ سے اَٹ گیا۔ کسی اللہ کے بندے نے اس کے چاروں طرف کانٹے دار ٹہنیاں بچھا دی ہیں کہ رات برات میں رستہ چلتے مسافر دھوکا نہ کھائیں۔" واجد میاں بولے "نہریں پانی کہاں سے آتا ہے؟" پیارے بھائی۔" میں نے کہا "نہروں میں دریاؤں سے پانی آتا ہے۔" واجد میاں نے کہا۔ اور کنوئیں میں؟" میں نے کہا "کنوئیں میں زمین سے پانی نکلتا ہے۔" واجد میاں نے پوچھا کتنا کھودو تو پانی نکل آتا ہے؟" میں نے کہا "یہ تو زمین پر ہے۔ کہیں دس گیارہ فٹ کھودنے سے پانی نکل آتا ہے، کہیں اور زیادہ کھودنا پڑتا ہے۔ بعض جگہ مثلاً افریقہ کے تپتے ہوئے صحرا میں دو دو تین تین ہزار فٹ نیچے پانی نکلتا ہے۔" واجد میاں نے پوچھا "تو کیا پیارے بھائی زمین میں بس پانی ہی پانی ہے۔" ماموں صاحب بولے "ہاں میاں بس پانی ہے اور مٹی ہے۔" میں نے کہا "جی ہاں اور خوب گہرائی میں اتنی گرمی ہے، اتنی گرمی ہے کہ آگ کی گرمی سے کئی ہزار گنا زیادہ۔" واجد میاں کو اس بات پر بہت ہنسی آئی۔ اتنا ہنسے اتنا ہنسے کہ گرتے گرتے بچے، کہنے لگے۔ "پیارے بھائی کی باتیں سنو جیسے کوئی وہاں بھی ایسا کی طرح بیٹھا چولھا جلا رہا ہو" ماموں صاحب بھی ہنس کر بولے "بھئی یہ بات تو میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔" میں نے کہا دیکھئے ہماری زمین گیند کی طرح ہے نا بلکہ گیند کی طرح بھی نہیں

سیب کی طرح کہیے تو جیسے سیب میں ایک تو اوپر
والا چھلکا ہے دوسرے اندر والا گودا ہے اور پھر
بیچوں بیچ کا حصّہ ہے۔ اسی طرح زمین میں ایک تو
اوپر کا پرت ہے، پھر اندر کا حصّہ بہت اندر کا۔ یوں
سمجھیے کہ زمین کے بیچوں بیچ تو یہاں کچھ ایسے مادّے
ہیں جو خوب گرم ہیں۔" واجد میاں بولے "آپ نے
تو پھر وہی بات دہرادی۔" میں نے کہا "اچھا میں
شروع سے بتاتا ہوں، غور سے سُننا۔" ماموں
صاحب بولے "بھئی اب سورج نکلنے والا ہے چلو
لوٹ چلیں، راستے میں باتیں کرتے چلیں گے۔"
واجد میاں نے گھر کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا
"ہاں تو آپ کیا کہہ رہے تھے پیارے بھائی؟" میں
نے کہا "دیکھو اب سے جانے کتنے دنوں پہلے۔ ہم تم
تو اندازہ بھی نہیں لگا سکتے، ہاں سائنس والوں نے
کچھ حساب لگایا ہے[1] اور کہتے ہیں اب سے لاکھوں
لاکھ برس پہلے یہ زمین وِمین کچھ نہیں تھی۔" واجد میاں
پر پھر ہنسی کا دورہ ہوا اور کہنے لگے "دیکھئے ابا
آج یہ پیارے بھائی کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں
بھلا یہ بھی کہیں ہو سکتا ہے کہ سرے سے زمین ہی
غائب ہو پھر لوگ رہتے سہتے کس پہ ہوں گے
کھی کھی کھی ...." انھیں دیکھ کر
ماموں صاحب کو بھی ہنسی آگئی اور کہنے لگے "بھئی
بڑا بے وقوف ہے، ارے بات تو پوری ہو لینے
دے۔" میں نے واجد میاں کی بات سُنی اَن سُنی
کردی اور کہا "اصل یہ ہے کہ ہماری زمین بھی سورج
ہی کی اولاد ہے اس کا ایک حصہ تھی یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ
ہر ایک تارے میں کشش یعنی ایک دوسرے کو
کھینچنے کی طاقت ہوتی ہے سورج میں بھی یہ یعنی
کھینچنے کی طاقت بہت ہے تو ہوا یہ کہ کوئی تارہ سورج
سے زیادہ قریب آگیا اب ان دونوں میں کھینچا تانی
ہوئی۔ اس کھینچا تانی میں سورج کا ایک حصّہ ٹوٹ
کے الگ ہوگیا، شروع شروع میں یہ ٹکڑا بھی سورج
ہی کی طرح آگ کا گولا تھا ...." واجد میاں
میری باتیں سُن رہے تھے اور بونقوں کی طرح میری
طرف دیکھ رہے تھے۔ ماموں صاحب بھی کچھ چکرا رہے تھے ایسی
باتیں انھوں نے کبھی پہلے بھلا کاہے کو سُنی تھیں کہنے لگے "مگر میاں
جس وقت سورج سے اس کا اتنا بڑا ٹکڑا الگ ہوا ہوگا
تو بس قیامت ہی تو آگئی ہوگی۔" میں نے کہا "جی اس
میں کیا شک ہے اور یہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی
کہ چاند بھی اسی ٹکڑے میں سے نکلا ہے۔ معلوم نہیں
یہ کب اس سے ٹوٹ کر الگ ہوگیا۔ گویا چاند زمین
کی اولاد ہے۔ اس رشتے سے سورج اس کا دادا
ہوا کہ، کیوں بھائی واجد صاحب کیا سمجھے؟" واجد میاں
اپنے ابا کی طرف دیکھ کر کچھ مسکرائے اور بولے
"کچھ کچھ سمجھ میں تو آرہا ہے پیارے بھائی۔ مگر ایک
بات تو بتائیے آپ کہتے ہیں زمین آگ کا گولا تھی تو

[1] ابھی ابھی تھوڑے دن ہوئے ایک ہندوستانی سائنس داں نے حساب لگایا ہے کہ زمین کی عمر ۲۵ لاکھ برس ہے۔

یہاں خوب گرمی ہوتی ہوگی۔ مگر ہمیں تو گرمی نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ آج کل جاڑوں میں سردی لگتی ہے۔" میں نے کہا مگر واجد میاں میں تو بالکل شروع زمانے کا ذکر کر رہا ہوں۔ سورج سے الگ ہوتے وقت زمین کا یہی حال تھا۔ گرمی کے مارے اس میں سے مختلف گیسیں یا گیس والی چیزیں نکلنے لگیں۔ پھر جوں جوں گرمی کم ہوتی گئی یہ گیس والی پگھلی ہوئی چیزیں خوب گرم گرم لگدی کی سی شکل اختیار کرتی اور ٹھوس بنتی گئیں۔" ماموں صاحب نے پوچھا "تو یہی کتنے دنوں میں یہ سب کچھ ہو گیا۔" میں نے کہا "کچھ ٹھیک سے تو بتایا نہیں جا سکتا۔ بس اندازے سے کہتے ہیں کہ لاکھوں ہی سال لگ گئے ہوں گے۔" واجد میاں بولے "افوہ اتنے دنوں پہلے! ہمیں تو گنتے گنتے بھی کئی دن لگ جائیں گے۔"

میں نے کہا "جس وقت یہ زمین ٹھوس بنتی جا رہی تھی اس وقت بھی اس کے اندر کا پگھلا ہوا مادہ بہت ہی گرم تھا۔ زمین پر اب تک ہوا کا گذر نہ ہوا تھا اور یہ بس پگھلے ہوئے لاوے کا ایک میدان تھی اسے کالے کالے گیسوں کے بادل چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔" واجد میاں بولے "پیارے بھائی ہر وقت بادل ہی بادل رہتے تھے؟ پھر تو لوگوں کی طبیعت اکتا جاتی ہوگی۔" میں نے کہا۔ "ارے جناب! اس وقت تک کوئی جان دار پیدا ہی کب ہوا تھا۔ پیدا بھی ہوتا تو زندہ کیسے رہ سکتا تھا۔ سانس لینے کے لئے ہوا تک تو تھی نہیں پھر گرمی اتنی شدت کی! پودے تک تو موجود نہیں تھے نہ اس وقت دن میں سورج کی روشنی ہوتی تھی نہ رات میں چاند کی۔ نہ ستارے ٹمٹماتے تھے بس ایک سنسان ویران جگہ تھی۔" ماموں صاحب بولے "تو یوں کہو کہ دوزخ کا نمونہ تھی۔" میں نے کہا "بلکہ اس سے بھی بدتر۔" حبیب میاں چلتے چلتے تھک گئے تھے کیا تو آگے آگے بھاگتے تھے یا اب پیچھے رہ جاتے تھے۔ چیکے چیکے کچھ منمناتے بھی جاتے تھے۔ ماموں صاحب کو رحم آگیا۔ انھوں نے انھیں گود میں اٹھا لیا۔ واجد میاں نے اسی سلسلے کو پھر چھیڑا "کیوں پیارے بھائی کیا پانی بھی نہیں برستا تھا" میں نے کہا "بہت دنوں تک یہی حال رہا مگر اب سے جانے کتنے دنوں پہلے خوب دھواں دھار مینھ برسا، شاید قدرت زمین کو گرد و غبار سے پاک کرنا چاہتی تھی۔ ماموں صاحب نے پانوں کی ڈبیا جیب سے نکالتے ہوئے کہا "مگر بھئی یہ پانی کہاں سے آگیا۔" میں نے کہا "یہ تو میں ابھی آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ زمین میں مختلف گیس ہیں ان میں سے ایک گیس کا نام ہائیڈروجن ہے ایک کا آکسیجن یہ دونوں گیس جب آپس میں ملتے ہیں تو پانی بن جاتا ہے۔ تو غالباً یہی ہوا کہ یہ دونوں گیس ایک دوسرے

سے مل گئے اور دنیا میں پانی کی افراط ہو گئی۔" ہم لوگ باتیں کرتے گھر تک آگئے۔ گھر میں پہنچ کر واجد میاں بہت زور سے چیخے "اپیا اپیا آج پیارے بھائی نے ہمیں بڑی اچھی اچھی باتیں بتائیں۔ آپ ہمارے ساتھ چلتیں تو آپ بھی سنتیں۔ فہمیدہ مسکرا کر بولیں: "لے اور کیا اب تمھارے ساتھ ٹہلنے جایا کروں گی۔

ماموں صاحب نے ہنس کر کہا "واہ بیٹے اتنے بڑے ہوگئے مگر ہے اُلّو کے اُلّو"۔ واجد میاں پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا کہنے لگے "ہاں پیارے بھائی اور باتیں بتائیے" میں نے کہا "بھائی اب نہائیں گے اور کپڑے بدلیں گے پھر ناشتہ کریں گے۔ اچھا ناشتہ کرتے وقت بات چیت ہوگی"۔

لطیفے

(عبداللہ ناصر بمبئی)

ماں سبق دے رہی تھی بچوں کو
آج کا کام کل پہ مت ڈالو
سُن کے اک بچہ نے یہ کہا امّاں
وہ جو رکھی ہے آپ نے برفی
لائیے آج ہی اسے کھا لوں
آج کا کام کل پہ کیوں ٹالوں

(۲)

کھیلتے کھیلتے کوئی بچہ
ایک دن اک کنوئیں پہ جا پہنچا
اپنی صورت اسے نظر آئی
جھانک کر اس نے اس میں جب دیکھا
کم سمجھ اور بے وقوف تھا وہ
سمجھا کوئی کنوئیں میں ہے بیٹھا
ڈر کے بھاگا وہ اپنے گھر کی طرف
راہ میں مل گئے اُسے ابّا
بولا کوئی کنوئیں میں بیٹھا ہے
دیکھ کر جس کو ڈر کے میں بھاگا
ابّا آئے کنوئیں پہ غصہ میں
دیکھ کر اس میں اپنا ہی سایہ
بولے جھنجھلا کے کیوں میاں صاحب
داڑھی رکھ کر یہ حرکتِ بے جا
اک تو بچوں کو تم ڈراتے ہو
اس پہ آنکھیں ہمیں دکھاتے ہو



دریائے سندھ کی کہانی

پروفیسر محمد عبدالغفور ایم۔ اے

۲

"اس سے تو یہ پتہ چلا کہ اس دریا میں جہاز رانی بھی ہوتی رہی ہے۔"

"کیوں نہیں۔ ذرا نقشے پر دیکھو۔ دریا کیا ہے۔ اچھی خاصی شاہ راہ ہے۔ جو بلخ بخارا، افغانستان اور چینی ترکستان کو سمندر کے ذریعے پوری دُنیا سے ملاتی ہے۔ ایک زمانے میں یہ دریا تجارت کی بڑی شاہراہ رہا ہے۔ سترھویں صدی میں دو انگریز نزل نے اس راستے سفر کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ دریائے سندھ کے ذریعے لاہور اور اُس کے علاقے کی پوری دولت تجارت کے ذریعے پرتگیزوں کے ہاتھ میں کھنچی چلی جا رہی ہے۔ یہ لوگ اسی دیس کی پیداوار ٹھٹھہ (THATHA) کے ذریعے ہرمز (HARMUZ) اور ایران کی بندرگاہوں میں لے جاتے ہیں۔ ایک مورخ نے یہاں تک لکھا ہے کہ پرتگیزوں کے جہاز پنجاب سے مالابار اور ساحل کورو منڈل تک پہنچتے تھے۔ اور اِدھر سے گرم مصالحہ اور دوسری پیداوار یں شمالی ہندوستان میں پہنچاتے تھے۔"

"تو کیا اب بھی اس دریا میں جہاز رانی ہوتی ہے؟"

"نہیں۔ اب تو جنوبی حصے ہی میں چھوٹی کشتیاں چلتی ہیں۔ دریا میں پانی بہت ہے۔ اس پر بہاؤ بھی بڑا تیز ہے۔ اس لئے اس میں اکثر ریت ایک جگہ سے دوسری جگہ بدلتا رہتا ہے۔ آج جہاں دریا پچاس فٹ گہرا ہے۔ وہاں کل اچھا خاصا جزیرہ بنا ہوا ہوگا۔ اس لئے جہازوں کو چلنے میں خطرہ ہی رہتا ہے۔ ویسے پانی تو اس دریا میں بہت ہے۔"

"کتنا ہوگا؟"

"اس میں مس سس پی کے برابر اور گنگا سے چار گنا پانی ہے اور جب سیلاب آتا ہے تو پھر تو میلوں زمین کو اکثر ریتلا اور بنجر کر جاتا ہے۔"

ہم نے تو سنا تھا کہ مصر کا ملک تو بنا ہی دریائے نیل کے سیلاب سے ہے۔"

"ہاں، ہاں۔ تو مہنجو دڑو کا تمدن بھی تو دریائے سندھ ہی کی پیدا وار ہے۔ اور اب تو اسی دریا کے ذریعے وہاں ایک نئی زندگی کی بنیادیں رکھی جا رہی ہیں۔ آج سے بیس سال پہلے صوبہ سندھ ایک صحرائے بے کنار تھا۔ جس میں کہیں کہیں املی کے درخت یا کانٹے دار جھاڑیاں اُگی تھیں لیکن آج یہ صحرا ایک سرسبز شاداب باغ بن گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ گویا حضرت موسیٰ نے اپنا عصا اسی سرزمین پر کھینچ مارا۔ اور اس میں سے زندگی کو تازگی دینے والے چشمے جاری ہو گئے۔ یہ چشمے کیا ہیں۔ سکھر بیراج کی سات نہریں جن کی لمبائی شاخوں سمیت ۲۰ ہزار میل سے کم نہیں۔ کچھ اندازہ بھی ہے کہ ۲۰ ہزار میل کتنے ہوتے ہیں۔ زمین کے محیط سے ڈیڑھ گنا۔"

"سچ تو یہ ہے کہ انسان نے اس بیراج کے ذریعے قدرت کی ایک بڑی طاقت کو اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ اور وہ دیو جس سے چنگیز خاں جیسے خونی حملہ آور کانپتے تھے ایک وفادار خادم کی طرح انسان کی خدمت کر رہا ہے۔ لیکن یہ بھی اندازہ ہے کہ اس کے لئے انسان نے کیا کچھ خون پسینہ ایک کیا ہوگا محض کھدائی کے کام کا تخمینہ لگایا جائے تو اتنی محنت اٹھانی پڑی کہ اس سے خط استوا جتنی لمبی چودہ فٹ چوڑی اور چار فٹ گہری خندق کھودی جا سکتی تھی۔ پہلے تو آبپاشی دریائے سندھ کی مرضی پر ہوتی تھی یعنی کبھی سیلاب آ گیا۔ تو اس کے پانی کو سیلابی نہروں کے ذریعے زراعت کے لئے استعمال کر لیا۔ کہیں کہیں کسانوں نے رہٹ لگائے تو تھوڑا بہت پانی لے لیا۔ گویا دریا کیا تھا۔ ایک مطلق العنان حاکم تھا جب چاہا کچھ دے دیا، جب چاہا ہاتھ روک لیا۔ لیکن اب تو سندھ ندی کیا ہے، ایک اچھی کفایت شعار بیوی ہے جو آمدنی کے زمانے میں تو جمع کرتی رہتی ہے اور اُسے ضرورت کے وقت استعمال کرتی ہے۔ اور یہ کام سکھر بیراج کے ذریعے انجام دیا جا رہا ہے +



ایک دفعہ روم والوں نے اس کے جزیرے پر بہت بڑے سمندری بیڑے سے حملہ کیا۔ بیڑا تو سمجھتے ہو بہت سے سمندری جہاز ایک ساتھ جمع ہوں تو انہیں بیڑا کہتے ہیں۔ اس زمانے میں بادبانی جہاز ہوتے تھے اور ان میں کپڑے یا کسی اور چیز کے بادبان لگے ہوتے تھے۔ ارشمیدس نے کیا کیا کہ بہت سے بڑے بڑے آئینے منگوائے اور انہیں اس طرح رکھا کہ سورج کی روشنی ان سے منعکس ہوکر ایک جگہ پڑتی تھی تو یہ روشنی اس نے ان بادبانی جہازوں پر ڈالی۔ روشنی اتنی تیز تھی کہ تمام جہاز ایک ایک کرکے جل گئے گویا سائنس کی مدد سے اس نے اپنے جزیرے کو بچا لیا

رومیوں نے دوسری بار پھر اس کے جزیرے پر چڑھائی کی۔ اب کے اس کے جزیرے والے ہار گئے۔ رومیوں کے سپہ سالار مارسیلس نے جب یہ سنا کہ لڑائی کے قیدیوں میں ارشمیدس جیسا مشہور عالم بھی ہے تو اس نے فوراً اس کو آزاد کردیا مگر رومیوں کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اسی سال ایک دن وہ سائنس کے کسی مسئلے پر غور کر رہا تھا کہ رومیوں نے اسے مار ڈالا۔ یہ حضرت عیسیٰؑ کے پیدا ہونے سے کوئی دو سو برس پہلے کی بات ہے۔

(۲۱۲ ق م)

حضرت عیسیٰؑ سے پہلے جتنے مشہور مشہور سائنس جاننے والے گذرے ہیں ان میں بس ایک ہی رہ گیا ہے۔ اس کا نام اسٹرابو تھا یہ بھی یونان ہی کا رہنے والا تھا اور ایک جگہ امیسیا نامی میں ۶۴ ق م میں پیدا ہوا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس کے ماں باپ بہت کافی مالدار تھے۔ اسی لئے اسٹرابو ملکوں ملکوں خوب گھوما پھرا۔ نہیں تو اس زمانے میں یا تو بس فقیر فقرا سفر کرسکتے تھے یا بہت روپئے پیسے والے۔ ہر ایک کی بس کی بات نہیں تھی۔ اسٹرابو کی تو ساری زندگی یوں سمجھو کہ سفر ہی میں گذری۔ اس نے اپنا سفرنامہ کوئی سترہ جلدوں میں لکھا تھا

اس سفرنامے میں اس نے ہر ملک کا حال وہاں کے رہنے سہنے والوں کے رہنے سہنے کے رنگ ڈھنگ بہت غور اور مشاہدے کے بعد لکھے ہیں اسے تم پرانے زمانے کا سب سے بڑا جغرافیہ داں کہہ سکتے ہو۔ وہ سنہ ء میں مرا۔

اچھا اب ایک مشہور حکیم کا نام سنو اس کا نام اور کارنامے تو ہندوستان کے تمام حکیم یا طبیب بھی جانتے ہیں اور اس کا نام تو شاید تم نے بھی سنا ہو خیر ہم بتلاتے ہیں۔ اس کا نام جالینوس تھا۔ پرانے زمانے میں اس سے زیادہ ہوشیار اور مشہور حکیم اور کوئی نہیں گذرا ایشیائے کوچک میں ایک جگہ تھی پرگیماس یہ حکیم ۱۳۰ء میں وہیں پیدا ہوا۔ کوئی اُنیس برس کی عمر میں اُس نے طب پڑھنا شروع کی۔ اس علم کے حاصل کرنے کا شوق اتنا بڑھا اتنا بڑھا کہ سب کچھ پڑھ لینے کے بعد اُس نے فوراً علاج کرنا اور مطب میں بیٹھنا شروع نہیں کیا بلکہ اُس نے کہا "علم جتنا بھی حاصل کیا جائے کم ہے" اس کی خاطر اس نے سمرنا، یونان اور مصر کا سفر کیا جب ان جگہوں سے طب کا علم حاصل کرکے لوٹا تو اُس کی قابلیت کی شہرت دور دور پھیل گئی اور اس زمانے کے رومی شہنشاہ مارکس اوریلیس نے ۱۶۹ء میں اسے اپنا شاہی طبیب مقرر کیا۔ اس کے بعد شہنشاہ سیوراس کا شاہی طبیب رہا۔

طب کے فن کی کئی شاخیں ہیں۔ ایک شاخ وہ ہے جس میں جسم کی بناوٹ پر بحث کی جاتی ہے اسے علم الابدان کہتے ہیں یعنی بدن کا علم۔ جالینوس کو طب کی اس شاخ سے خاص طور پر دلچسپی تھی اس نے علم الابدان پر اور طب کی دوسری شاخوں پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ وہ بہت بڑا فلسفی بھی تھا۔ فلسفے پر اُس نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کتابوں میں سے بہت کم ہم تک پہنچی ہیں۔ اُن بچی کھچی کتابوں کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جالینوس کس قدر مستقل مزاج حکیم تھا کہتے ہیں نبض دیکھ کر مریض کی حالت جان لینے کا گُر سب سے پہلے اسی نے معلوم کیا۔ یونانی طب میں کئی دواؤں کے نام اس کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ اس نے ۲۰۰ء میں وفات پائی۔

پھر اس کے بعد بہت دنوں تک یوں سمجھو کہ میدان خالی رہا اور علم کی شمع جو یونانیوں نے جلائی تھی وہ کچھ بجھنے سی لگی۔ وہ تو کہو دنیا میں ایک نیا مذہب پیدا ہوا اُس نے علم کی اس میراث کو سنبھالا اُسے ترقی دی اور پروان چڑھایا نہیں تو دنیا سے علم کا نام و نشان ہی مٹ گیا ہوتا تم سمجھے بھی یہ کون سا مذہب تھا۔ یہ جناب مسلمانوں کا مذہب تھا یعنی اسلام، مسلمان جوں ہی اپنے قدموں پر کھڑے ہوئے انھوں نے علم اور فن کی ہر شاخ کی طرف توجہ کی بہت سے مذہبی غیر مذہبی علم تو انھوں نے

خود ایجاد کئے اِن کے علاوہ سائنس اوٗر فلسفے کے علم کو اصلاح اوٗر ترقی کے ذریعے اس طرح اپنایا کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی اُن کے مذہبی علم ہیں۔ ان کے بہت سے علموں کی بنیاد فلسفے پر ہے جیسے علم کلام وغیرہ جڑی بوٹیوں کا علم۔ جراحی یعنی بدن کے زخموں اوٗر پھوڑے، پھنسی کا علم، طب کا علم، فلسفہ، ریاضی نجوم، نباتات، طبقات الارض، علم الحیاۃ غرض یہ جتنے علم تھے سب انھی کی بدوٗلت اتنی ترقی کو پہنچے کیمیا اوٗر جبر و مقابلہ، کا علم تو یوں سمجھو کہ انھی کی ایجاد ہے۔ یہی مسلمان جب اسپین میں پہنچے تو وہاں کی بنجر زمین کو سرسبز و شاداب بنا دیا اوٗر علموں کے ساتھ ساتھ انھوں نے جہاز بنانے، شیشہ بنانے، کپڑا بُننے کی صنعتوں کو بہت ترقی دی۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس زمانے میں یوٗرپ کے عیسائیوں میں بہت جہالت پھیلی ہوئی تھی۔ اُن میں آپس کا مذہبی تعصب علم سے خدا واسطے کا بیر غلط مذہبی عقیدے۔ طرح طرح کے توہمات غرض کہاں تک بیان کیا جائے۔ علم کی روشنی اس ملک میں ایک تو صلیبی لڑائیوں کی وجہ سے پھیلی۔ مذہبی دیوانے جب عربوں سے لڑنے جاتے تھے تو اُن سے ملنے جلنے اوٗر اپنی جہالت کا ان کے علم سے مقابلہ کرنے کا موقع بھی ملتا تھا۔ دوٗسرا سب سے بڑا ذریعہ اسپین تھا یہاں مسلمانوں کے بڑے بڑے مدرسے اوٗر یونیورسٹیاں تھیں اوٗر اُن سے یہوٗدی عیسائی ہر قوم کے لوگ فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔ بڑے بڑے عیسائی بادشاہ اپنے بچوں کو ان مدرسوں میں پڑھانے بھیجتے تھے۔

مسلمان سائنس والوں کی تعداد بے شمار ہے۔ ہمارا ارادہ ان پر پیام تعلیم میں ایک مستقل مضموٗن لکھنے کا ہے۔ اس لئے ہم یہاں اُن کا ذکر نہیں کر رہے ہیں۔

اب ہم پندرھویں صدی عیسوی کے ایک مشہور ہیئت داں کوپرنیکس کا ذکر کریں گے۔ پولینڈ میں ایک جگہ ہے کارکو کوپرنیکس یہیں ۱۴۷۳ء میں (اب سے ۴۷۰ برس پہلے) پیدا ہوا۔ اُس کے ماں باپ غریب اوٗر مفلسی کی وجہ سے اُسے پڑھا لکھا نہیں سکتے تھے مگر کوپرنیکس کو بچپن ہی سے ہیئت (آسمانوں اوٗر تاروں کا حال جاننے کا علم) ریاضی اوٗر دوٗسرے علم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ اُس نے اپنے ملک ہی میں کسی نہ کسی طرح ان علموں کو سیکھا پھر بولونا اوٗر اس کے بعد روٗم کے مدرسوں میں ریاضی پڑھاتا رہا۔ اس نے علم ہیئت کا مطالعہ بھی برابر جاری رکھا۔ کچھ دنوں بعد اُس کے چچا نے اسے پادری بنا دیا یعنی مذہبی عالم یا مولوی۔ اس نے علم ہیئت کا مطالعہ پھر بھی نہ چھوڑا۔ اتنا روپیہ، پیسہ تو پاس تھا نہیں کہ اس کے لئے بڑے بڑے اوٗر قیمتی آلے خریدتا۔ بس اپنے مطالعہ اوٗر مشاہدے پر

بے چارے کو بھروسا کرنا پڑا اور جب اسے زمین، سورج اور دوسرے ستاروں کی گردش کے بارے میں اپنے مشاہدے کے ٹھیک ہونے کا یقین ہوگیا تو آسمانی ستاروں کی گردش کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں سب سے پہلے اسی نے ثابت کیا کہ زمین چپٹی نہیں گول ہے۔ زمین ایک محور (کیلی) پر گھومتی ہے اور سورج کے گرد بھی چکر لگاتی ہے۔ اس سے پہلے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے۔ علاوہ اس کے زمین کو لوگ چپٹا سمجھتے تھے۔ یہی اس کی سب سے بڑی تحقیقات ہے۔ لیکن اس زمانے میں یورپ میں جہالت اور وحشت کا دور دورہ تھا کوپرنیکس کو اپنی یہ تحقیقاتیں لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اُسے ڈر تھا کہ جاہل لوگ اُسے مار نہ ڈالیں اسی ڈر سے تیرہ سال تک اس نے اپنی کتاب نہیں چھپوائی۔ اپنے مرنے سے بس چند مہینے پہلے (۱۵۴۳ء) اس نے اسے چھپنے کی اجازت دی۔ شائع ہونے پر بھی تیس سال تک تو اس کی طرف کسی نے توجہ بھی نہ کی لیکن اس کے بعد اس کی معلومات اور تحقیق کی بہت قدر ہوئی اور اب تو عام ہیئت دان اُس کے اصولوں کو علم ہیئت کی بنیاد سمجھتے ہیں ٭

دریائے حیات

فضل الدین اختر۔ ایم اے

(سالنامے سے سلسلہ ملا کر پڑھو۔)

ثروت:۔ اوہ ہو یہ تو اتنا بڑا ہے۔ بس شاعر بھی کمال کرتے ہیں وہ ہے نا ایک شاعر کا شعر

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا

تو ان کا قطرۂ خون اتنا بڑا ہوتا ہے۔

فصیح:۔ اچھا اب اسے چیر کر بھی دکھاؤں۔

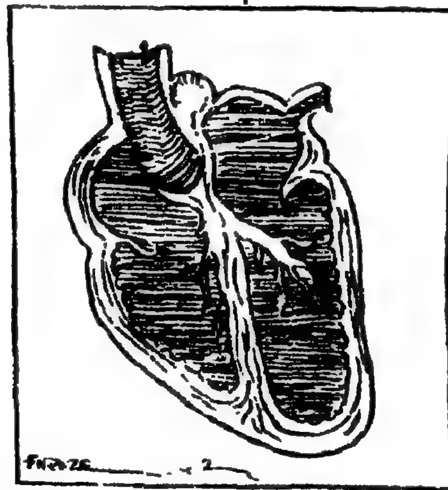
ثروت:۔ ضرور دکھائیے چچا جان۔ ان شاعروں کا آج سارا جھوٹ معلوم کروں گی۔

فصیح:۔ اچھا دیکھو (سلیٹ کے دوسری طرف خاکہ بناتا ہے)

ثروت:۔ ارے چچا میاں یہ تو ارسطو اور دل کو ایک قطرۂ خون بتانے والا شاعر دونوں جھوٹے نکلے۔ آپ نے دوسرے نقشے میں چار خانے دکھائے ہیں دل کے!

فصیح:۔ ہاں دل میں اندر چار خانے ہوتے ہیں۔

ثروت:۔ تو ان چار خانوں کا کیا کام ہے۔



فصیح:۔ کام بہت آسان ہے۔ یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ پھیپھڑوں میں خون صاف ہوتا ہے۔ اب پھیپھڑوں میں خون صاف ہو کر دل کے بائیں جانب والے اوپر کے خانے میں آتا ہے۔

ثروت:۔ پھر یہاں سے!

فصیح:۔ پھر یہاں سے وہ دل کے اسی جانب والے نیچے کے خانے میں چلا جاتا ہے اور یہاں سے وہ

جسم میں دَورے پر روانہ ہوتا ہے۔

ثروت :۔ جسم میں دَورہ کرنے سے آخر کیا فائدہ ؟

فصیح :۔ اچھا اسے یوں سمجھو کہ تمھارے مکان کے پاس سے جو ندی گذرتی ہے اُس سے تمھیں کیا فائدہ ؟

ثروت :۔ اس سے تو بہت فائدہ ہے چچا جان اس کی بدولت ہمارے پڑوس میں کھیتی ہوتی ہے۔ اس سے زمین سیراب ہوتی ہے اور یہی نہیں لوگ اس میں گندگی وغیرہ بہا دیتے ہیں اور اس طرح ان کا آس پڑوس بھی صاف رہتا ہے۔

فصیح :۔ بس یہی دو کام خون کی ندی بھی ہمارے جسم میں کرتی ہے۔ یہ ہمارے جسم کو خوراک دیتی ہے اور ہمارے جسم کی گندگی اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے۔

ثروت :۔ یہ کیسے ؟

فصیح :۔ تازہ خون شریانوں میں بہتا ہے۔ شریانیں آگے بڑھتے بڑھتے ہمارے بالوں کی طرح پتلی ہوتی چلی جاتی ہیں۔ دیکھو تمھیں پھر شکل کھینچ کر سمجھاؤں۔



بس جب خون ہماری بال جیسی باریک شریانوں میں (جنھیں CAPILLERIES کہتے ہیں) ہوکر گذرتا ہے تو وہ جسم کو خوراک دیتا ہے اور جسم کی گندگی اپنے میں جذب کر لیتا ہے۔

ثروت :۔ یہ باریک شریانیں تو جسم میں بے شمار ہوں گی۔

فصیح :۔ اس کا اندازہ تو اس سے لگاؤ کہ جسم میں کہیں خفیف سے خفیف چوٹ بھی لگ جائے تو خون فوراً نکل آتا ہے اور اس سے اُن کی تعداد کا اندازہ لگاؤ کہ صرف پھیپھڑوں کی ان باریک شریانوں کو جوڑ دیا جائے تو یہ بحر اٹلانٹک کے اس پار سے اُس پار تک یعنی انگلستان کے مغربی کنارے سے امریکہ کے مشرقی کنارے تک پہنچ جائیں۔

ثروت :۔ اوہ ہو اچھا اب سمجھ میں آیا کہ خون نیلا کیوں ہو جاتا ہے۔ لیکن چچا جان یہ نیلا خون پھر کہاں جاتا ہے ؟

فصیح :۔ یہ نیلا خون دل کے دائیں جانب بالائی خانے میں پہنچتا ہے

ثروت :۔ اچھا اب سمجھی، یہاں سے یہ اسی طرف کے نیچے کے خانے میں پہنچتا ہوگا اور پھر وہاں سے پھیپھڑوں میں صاف ہونے چلا جاتا ہوگا۔

فصیح :- تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا - بالکل یہی ہوتا ہے - دیکھو میں ایک شکل بنا کر تمھیں سمجھا دوں - اسے یہ دیکھو -

ثروت :- اب تو بات آئینہ ہو گئی چچا جان! آپ کی ڈرائنگ بڑی اچھی ہے اس لئے آپ اور بھی اچھی طرح سمجھا دیتے ہیں، اور چچا جان آپ نے ولیم ہاروے کا شروع میں ذکر کیا تھا تو آپ نے جو کچھ بتایا وہ ولیم ہاروے ہی کی تحقیق تھی؟

فصیح :- ہاں یہ سب ولیم ہاروے ہی کی تحقیق تھی - لیکن یہ بات کہ خون شریانوں اور وریدوں میں (CAPILLERIES کے ذریعے پہنچتا ہے - ایک شخص مارسلو میل فغی نے دریافت کی تھی -

ثروت :- مارسلو میل فغی ف، غ، ی نا چچا جان

فصیح :- ہاں ف، غ، ی -

ثروت :- میں پوچھنا یہ چاہتی تھی کہ اس نے کس سنہ میں ان باریک باریک شریانوں کا پتہ لگایا تھا -

فصیح :- بھئی سنہ تو مجھے یاد نہیں، لیکن ٹھہرنا وہ دیکھو میری میز پر ایک سُرخ کتاب رکھی ہے MASTER THINKERS اسے لاؤ (فصیح ورق الٹتا ہے) ہاں دیکھو یہ سنہ بھی مل گیا، سنہ ۱۶۶۱ء -

ثروت :- (سلیٹ پر حساب لگاتے ہوئے) یعنی چچا جان گیارہ میں سے آٹھ گئے تین اور پانچ میں سے دو گئے تین ...... ولیم ہاروے کی تحقیق کے ۳۳ سال بعد -

فصیح :- شاباش ثروت - تم حساب میں واقعی تیز ....

(فصیح اپنا جملہ پورا بھی نہ کرنے پایا تھا کہ آتشدان میں کوئلہ چٹخا اور ایک بڑی سی چنگاری ثروت پر گری مگر وہ بے تحاشا دو پٹہ پھینک کر اُٹھ کھڑی ہوئی اسی وقت فصیح کی نظر گھڑی کی طرف گئی -) ادھو آٹھ بجنے آئے - ثروت چلو غفور کو آواز دو اور کھانے کا انتظام کراؤ -

ثروت :- (باہر جاتے ہوئے) لیکن چچا جان کھانے کے بعد میں ابھی آپ سے اور باتیں پوچھوں گی -

فصیح :- اچھا منظور لیکن کھانے کے بعد تمھیں چائے بھی پلانی ہوگی!

ہم کیوں سوتے ہیں ؟

۲

مشتاق احمد بی اے علیگ

لطیف صاحب نے کہا " خیر یہ تو کھلی ہوئی بات ہے ۔ ہمارے ہاتھ پیر دن بھر کام کرتے کرتے تھک کر چور ہو جاتے ہیں ۔ اُن کے لئے آرام بہت ضروری چیز ہے سب سے زیادہ ضروری تو یہ ہے کہ ہمارا دماغ چند گھنٹوں کے لئے اپنا کام بند کر دے اس لئے کہ یہ دن بھر کام کرتا رہتا ہے اور نیند کی حالت میں یہی ہوتا ہے ۔"

میں نے کہا " مگر لطیف صاحب دماغ کی تمام کلیں اپنا کام بند نہیں کرتیں ۔ ہاں دماغ کے وہ حصے جن کا کام سوچنا یا ارادہ کرنا تھا نیند کی حالت میں اپنا کام تقریباً بند کر دیتے ہیں لیکن وہ حصے جن کا تعلق دورانِ خون اور سانس لینے سے ہے ، اپنا کام جاری رکھتے ہیں ۔ یہ بھی ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھ جائیں تو دُنیا ایک ہی دن میں اُجاڑ ہو جائے ۔"

لطیف صاحب بولے " پھر بھی سوتے میں دل کی حرکت بہت دھیمی ہو جاتی ہے ۔ سانس بھی آہستہ آہستہ آتی ہے ۔ جسم جاگنے کی حالت میں بہت سی چیزیں پیدا کرتا رہتا ہے ۔ مثلاً آنسو یا ناک میں پانی سوتے میں یہ چیزیں پیدا نہیں ہوتیں ۔ اسی لئے رات کو ناک صاف کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔"

بدر صاحب نے کہا " اچھا آپ نے ایک بات پر غور کیا ہوگا ۔ بستر پہ لیٹتے ہی فوراً نیند نہیں آجاتی " لطیف صاحب بولے " بھئی اس میں غور کرنے کی کیا بات ہے ۔ نیند آنے سے پہلے ہمیں کچھ تھکن سی معلوم ہوتی ہے ۔ آنسوؤں کے غدود جو دن بھر آنکھوں کو نمی یا رطوبت سے تر کرتے رہتے ہیں اپنا کام کرتے کرتے سست پڑ جاتے ہیں ۔ اس لئے ہم آپ ہی آپ بغیر کسی ارادے کے آنکھیں ملنا شروع کر دیتے ہیں تاکہ یہ غدود اپنا کام پھر شروع کر دیں اور اگر ہم رات کو دیر تک جاگتے رہیں تو پلکیں آپ سے آپ بند ہونے لگتی ہیں ۔ بدر صاحب اس کا سبب بھی کچھ معلوم ہے آپ کو کیا معلوم ہوگا

کبھی رات کو جاگتے تو معلوم ہوتا۔" بدر صاحب بولے "۔
دیکھئے پھر آپ نے وہی باتیں شروع کر دیں۔ حساب
امتحان کے زمانے میں میں ایک ایک دو دو بجے رات
تک جاگتا تھا اور آپ مجھے اتنا جاہل کیوں سمجھتے ہیں۔
سنئے اس کا سبب یہ ہے کہ پلکوں کی جو باریک رگیں
اور پٹھے ہیں وہ تھک جاتے ہیں۔ دماغ لاکھ کہتا ہے
کہ پلکوں کو کھلا رکھو مگر وہ تھک اس قدر جاتے ہیں
کہ اس کا حکم ماننا ان کے لئے بہت مشکل ہو جاتا ہے
اور ہم بہت کوشش کے بعد ہی اپنی آنکھیں کھلی رکھ
سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سوتے میں ہماری آنکھیں بند
رہتی ہیں اور جاگنے کے بعد ہی کھلتی ہیں۔ اس وقت ہم
آنکھیں ملنے لگتے ہیں تاکہ آنسوؤں کے غدود اپنا کام
شروع کر دیں۔

لطیف صاحب ہنس کر بولے " یہ بات تو آپ
نے ٹھیک بتائی شاید امتحان ہی کے زمانے میں آپ کو
اس بات پر غور کرنے کا موقع ملا ہوگا۔"

میں نے کہا" دیکھئے لطیف صاحب میں آپ کو
ایک بات اور بتاؤں۔ جسم جب تھک جاتا ہے تو بہت
سے عضو اپنا کام سست کر دیتے ہیں جسم کی گرمی بھی
کم ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے جاڑوں میں ہمیں گرم گرم
بستر کی خواہش ہوتی ہے ہم اپنا جسم کمبل یا لحاف سے
ڈھک لیتے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ سونے کی حالت
میں جسم جو تھوڑی بہت گرمی پیدا کرتا ہے وہ تو کم سے
کم بچی رہے۔ جانور بھی اس طرح کی احتیاط کرتے ہیں۔
بلی یا کتے کو آپ نے سوتے دیکھا ہوگا۔ اب کی موقع
ملے تو غور سے دیکھئے گا کہ کس طرح آلتی پالتی مار کر پیروں
کو پیٹ میں دبا کر سوتے ہیں کہ ان کے بال سارے
جسم کو ڈھک لیں۔"

بدر صاحب بولے " اور یہ عجیب بات ہے
کہ سوتے وقت شروع شروع میں عجیب کچھ بے ہوشی
سی ہوتی ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری
ارادہ کرنے کی قوت آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی
ہے پھر بھی کانوں میں آوازیں آتی رہتی ہیں۔ مثلاً
پاس کے کمرے میں بولنے کی آواز یا سڑک پہ موٹر،
یکے، تانگے کی گھڑ گھڑاہٹ، یا ریل کے انجن کی سیٹی
پھر ایسی غفلت ہو جاتی ہے کہ مرنے جینے کسی چیز کی
خبر نہیں رہتی۔"

میں نے کہا" جبھی تو کہتے ہیں کہ پہلی نیند بڑی
قیمتی ہوتی ہے اسی لئے اسے میٹھی نیند کہتے ہیں۔ تجربے
سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ سب سے گہری نیند
سونے کے ایک گھنٹے بعد آتی ہے۔ اچھا ایک بات
بتلائیے مشتاق صاحب " آپ کے گھنٹے سوتے ہیں"
میں نے کہا" کم سے کم آٹھ گھنٹے "۔ لطیف صاحب
بولے" اور آپ تو بدر صاحب بارہ گھنٹے سوتے ہوں
گے"۔ بدر صاحب کچھ خفا ہو کر بولے" اور آپ اٹھارہ
گھنٹے سوتے ہوں گے"۔ لطیف صاحب ہنس کر بولے

"اچھا آپ میرا مطلب سمجھ گئے میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ بوڑھے
آدمی کے لئے چھ گھنٹے کی نیند کافی ہے۔ جوانوں کے
لئے آٹھ گھنٹے۔ بچوں کے لئے بارہ اور دودھ پیتے
بچوں کے لئے اٹھارہ گھنٹے۔ بچوں کے لئے نیند کی
زیادہ ضرورت ہے۔ انھیں زیادہ دیر تک جگائے
رکھنا اُن پر بہت ظلم ہوگا۔ اس سے اُن کی تندرستی
پر بھی بُرا اثر پڑتا ہے۔ ننھے بچے تو دن بھر سوتے
ہی رہتے ہیں۔"

"اچھا دیکھئے بدر صاحب، خوب غفلت کی نیند
میں کسی کا چہرہ ہاتھ سے چھو دیا جائے یا ناک پر مکھی
بیٹھ جائے تو اس کا ہاتھ خود بخود اُٹھتا اور پریشان
کرنے والی چیزوں کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ گڑگڑاہٹ کی آواز سے سونے
والے کی نبض تیز ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی کسی آواز کی
وجہ سے سونے والا خواب دیکھنے لگتا ہے۔" بدر صاحب
بولے "ہاں صاحب یہ تو روزمرہ کی باتیں ہیں مگر ان
کی وجہ نہیں معلوم"۔ لطیف صاحب نے کہا "وجہ یہ ہے
کہ غفلت کی نیند میں بھی دماغ کا کچھ حصہ تھوڑا بہت
جاگتا رہتا ہے اور کچھ رگیں دماغ تک خبر پہنچاتی رہتی
ہیں لیکن دماغ کو ان کی یہ بات اچھی نہیں لگتی اور
وہ ان خبروں کی زیادہ پروا نہیں کرتا۔ بعض سائنس
دانوں کا خیال ہے کہ سوتے وقت دماغ کچھ چھوٹا
ہو جاتا ہے اور ہاتھ پیر بڑھ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ
یہ بتائی ہے کہ خون کی تھوڑی سی مقدار جسم کے آخری
عضو یعنی ہاتھوں اور پاؤں کی طرف چلا جاتا ہے۔

ارے بھئی بدر صاحب آج ہم نے آپ کے
ساتھ بہت زیادتی کی ہے آپ کو بستر کی یاد ستاتی
ہوگی۔ پلکیں بھی کچھ بھاری ہو رہی ہیں۔ جاکے سوئیے
ہم بھی رخصت ہوتے ہیں"۔ میں نے کہا "اچھا لطیف صاحب
ایک بات اور بتلاتے جائیے اور وہ یہ کہ ہر رات کو
تقریباً ایک ہی وقت میں ہمیں سونے کی خواہش
کیوں ہوتی ہے؟" لطیف صاحب نے کہا "ویسے تو
اس کے بارے میں بہت سائنس دانوں نے اپنی اپنی
رائے ظاہر کی ہے۔ مگر آج کل کے سائنس دانوں کے
نزدیک سونے اور جاگنے کا سبب دماغ میں خون
کے دوران کا بدلنا ہے۔ آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ دماغ میں
رگوں کے ذریعے خون دورہ کرتا رہتا ہے۔ ان رگوں
میں سے کچھ ایسی ہیں جو دوسری رگوں سے خون لے
کر دماغ تک پہنچاتی رہتی ہیں۔ یہ رگیں اپنا کام بہت
تیزی اور محنت سے کرتی ہیں آخر کام کرتے کرتے سست
پڑ جاتی ہیں۔ خون کی روانی یا دوران بھی سست
پڑ جاتا ہے۔ اور ایک خاص وقت میں انسان پر
غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔

چند گھنٹے آرام کے بعد دماغ کو خون پہنچانے
والی رگیں تازہ دم اور چاق و چوبند ہو جاتی ہیں۔ دماغ
میں خون کافی مقدار میں پہنچنے لگتا ہے اور سونے والا

جاگ اُٹھتا ہے۔ آپ نے یہ مثل تو ضرور سنی ہو گی کہ نیند تو پھانسی کے تختے پر بھی آجاتی ہے تو یہ بالکل سچ ہے۔ بعض لوگ جو تھک کر چور ہو جاتے ہیں۔ جہاں کا تہاں پڑکر سو رہتے ہیں۔ پہلے زمانے میں ڈاک لے جانے والے ہرکارے گھوڑوں کی پیٹھ پر سو جاتے تھے۔ بہت سے سپاہی مارچ یعنی چلنے کی حالت میں سوتے ہوئے چلے گئے اور تکلف یہ کہ برابر چل رہے ہیں۔ ایک لڑائی

کے جہاز کے کپتان کا قصہ تو بہت مشہور ہے۔ وہ تھک کر اپنی توپ کے پاس سو گیا توپ برابر سر ہوتی رہی مگر مگر اس نیند کے ماتے کو ذرا خبر نہ ہوئی۔ ارے ! ارے وہ دیکھو بدر صاحب اونگھ رہے ہیں۔ بھئی اب ہم نہیں ٹھہر سکتے۔ بدر صاحب بدر صاحب اب آپ اپنے بستر پر آرام کیجئے۔

آگرے کا خیال

مجیب الرحمٰن عثمانی۔ ابتدائی ششم تعلیمی مرکز

سیر و تفریح سے دلچسپی بچوں کو اور بڑوں کو سبھی کو ہوتی ہے۔ بچوں کے لئے تو یہ ایک طرح سے بہت ضروری ہے۔ اس سے ان کی معلومات و واقفیت بڑھتی ہے۔ اور ان کے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے تعلیمی مرکز علا (جامعہ ملیہ اسلامیہ) قرول باغ کے بچوں کو مدرسے کی طرف سے اس کا زیادہ سے زیادہ موقع دیا جاتا ہے۔ مدرسے کے بچے ہر سال اور ہر مہینے کسی نہ کسی جگہ کی سیر ضرور کرتے ہیں۔

ابھی مارچ کی پندرہ تاریخ کو ابتدائی ششم کے بچے آگرہ اور علی گڑھ کی سیر کے لئے نکلے تھے اور کوئی ایک ہفتہ سیر و تفریح میں ہنسی خوشی گذار کر ۲۲ مارچ کو واپس آئے۔

ان بچوں نے ایک جلسہ کر کے اپنی سیر کے حالات مدرسے کے ساتھیوں کو سنائے۔ اپنی انجمن کے قلمی رسالے میں بھی انھیں شائع کیا۔ ان سے اس سلسلہ میں مختلف عنوانوں پر مضمون بھی لکھوائے گئے۔ مثلاً آگرے کا خیال، تعلیمی مرکز کی ایک رات۔ دہلی سے آگرے تک کا سفر وغیرہ۔ ان میں سے چند اچھے اچھے مضمون منتخب کر لئے گئے ہیں اور پیام تعلیم میں سلسلہ وار چھپیں گے۔

محمد اکرام خاں استاد تعلیمی مرکز

ہم جب اپنے پچھلے چند سالوں کی سیروں اور دلچسپیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو دل میں کچھ عجیب طرح کی امنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں۔

ہم جب دوسری جماعت میں تھے تو اپنے اچھے استادوں کے ساتھ کالا پہاڑ، پوسا کالج اور بھولی بھٹیاری وغیرہ کی سیریں کیں۔ یہ سیریں ان دنوں بڑی ہی دلچسپ معلوم ہوتی تھیں۔ انھی سیروں نے ہمارے دماغ میں وسعت پیدا کی اور ہم نے دو تین دیہاتوں کی سیر کی۔ غرض پانچویں جماعت تک دہلی کی ہر عمارت کو چھان ڈالا۔

جب دہلی کی عمارتیں دیکھتے دیکھتے دل بھر گیا تو اور دور کی سوجھنے لگی۔ اور ہم میں آپس میں دلی سے باہر کی سیر کے لئے سرگوشیاں ہونے لگیں۔

جب ہم پانچویں سے چھٹی میں آئے تو شروع سال سے ہم ماسٹر صاحب کو یاد دہانی کراتے رہتے۔ اتفاق کی بات چھٹی جماعت کی کتاب میں آگرے پر ایک سبق بھی تھا پھر تو یوں سمجھئے کہ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ مل گیا۔ اردو

کے گھنٹے میں جس دن اس سبق کی باری آئی ہم نے دس پندرہ منٹ آگرے کی باتوں میں گذار دیئے۔ اس کے بعد تو روزانہ اکرام صاحب کے گھنٹے میں آگرے کا ذکر ضرور چھڑتا۔ شروع شروع میں تو ہمارے ماسٹر صاحب کچھ مذبذب سے تھے ایک تو آج کل کی مہنگائی پھر ریلوں کی بھیڑ بھاڑ اور کش مکش۔ تاہم وہ ہمارے ارادوں کو پست نہ کرنا چاہتے تھے اور جب انھوں نے دیکھا کہ ہم ارادے میں بالکل پکے ہیں تو انھیں اور بھی دلچسپی ہوگئی۔ آخر ایک دن انھوں نے ہمیں یہ خوش خبری سنائی کہ دسمبر کی چھٹیوں میں آگرے کا سفر ہوگا، ہم خوش خبری سن کر اچھل پڑے اور ایک ایک دن گننے لگے۔ سیر کی تیاری کے سلسلے میں ہماری جماعت نے ایک سیر فنڈ قائم کیا ہر طالب علم روزانہ کچھ نہ کچھ رقم لاتا اور اپنے نام کے کھاتے میں درج کرا دیتا۔ اس فنڈ کے خزانچی محمد تقی بنائے گئے۔

دسمبر کی چھٹیوں سے پہلے اسی سیر فنڈ سے ہم نے اوکھلے کی سیر کی اس سے ہمارا جوش اور بڑھ گیا۔ ہمارے اُستاد ماسٹر اکرام صاحب آگرے کی سیر کو اب بھی ٹالنا چاہتے تھے کبھی کہتے ریل میں بھیڑ بہت ہوتی ہے۔ کبھی کہتے مہنگائی بہت ہے۔ مگر ہمارا شوق ان سب چیزوں پر غالب آنے کی گواہی دے رہا تھا۔

ایک دن ماسٹر اکرام صاحب کے گھنٹے میں آگرے ہی کے بارے میں بات چیت ہو رہی تھی ماسٹر صاحب نے کہا بھئی آپ لوگوں کو آگرے جانا ہی ہے تو دسمبر کا ارادہ ملتوی کیجئے۔ فروری یا مارچ میں چلئے ان مہینوں میں سردی بھی کم ہو جاتی ہے، ہم سب ماسٹر صاحب کی بات مان گئے نہ مانتے تو کیا کرتے۔

مدرسے میں ۲۰ دسمبر سے ۱۳ جنوری تک چھٹیاں تھیں۔ ان چھٹیوں کا زمانہ ہم نے بڑی مصیبت سے کاٹا آخر خدا خدا کر کے اسکول کھلا اور ہم اپنے جوش کو لئے ہوئے اپنے مدرسے میں آئے۔

اب آگرے کے سفر کا چرچا چھٹیوں سے پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا۔ اور اکرام صاحب نے فروری میں چلنے کے لئے کہا تھا اس لئے چندہ بھی بڑے زور روں میں آ رہا تھا چھ فروری تک ہمارے فنڈ میں کوئی ایک سو دس روپے جمع ہو گئے تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد اکرام صاحب نے کہا "بھئی فروری میں بھی کافی سردی ہوگی اس لئے مارچ میں چلیں گے" اس بات کے سنتے ہی جماعت میں دو فریق ہو گئے ایک فریق مارچ کے لئے رضامند تھا دوسرا فروری میں جانا چاہتا تھا۔ کئی دن تک یہ مسئلہ چلتا رہا۔ ماسٹر صاحب نے بھی بہت کچھ سمجھایا مگر کسی کی سمجھ میں بات نہ آتی تھی۔ قرعہ بھی ڈالا گیا مگر کسی نتیجے تک پھر بھی نہ پہنچ سکے آخر مجبور ہو کر انھوں نے فرمایا۔ "پندرہ مارچ بالکل آخری فیصلہ ہے۔"

ہمارے لئے بس یہی ایک مشکل نہ تھی اپنے والدین کو بھی راضی کرنا تھا۔ ان سے سفر کی اجازت لینا تھی اور پھر چندہ لینا تھا۔ دس دس روپیہ کا چندہ! خدا کا شکر ہے کہ اپنے سچے شوق اور پکے ارادے کی بدولت ہمیں اس میں بھی کامیابی ہوئی پندرہ فروری تک سب روپے جمع ہو گئے اور پندرہ مارچ کا ہر ایک بہت بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔

آدمی یا مچھلی



اپنی رائٹنگ کاپی پر
ڈرائنگ کرو

فیروز آرٹسٹ









FIROZE — 42

پیام برادری

پیاری بچیو اور بچو! خوش رہو اور تندرست۔

پچھلے پرچے میں مرحومہ آپا جان کے انتقال کی خبر آ چکی ہے۔ پیامیوں کو اس خبر سے جو صدمہ ہوا وہ ان خطوں سے ظاہر ہے جو روزانہ ڈاک سے پیام تعلیم کے دفتر میں پہنچ رہے ہیں۔ سچ مچ آپا جان کی موت سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیام تعلیم کا اور پیامیوں کا کوئی سچا اور مخلص ہمدرد، پیامیوں کو اچھی راہ دکھانے والا اور بھلائی کی باتیں بتلانے والا دنیا سے اٹھ گیا۔

آپا جان مرحومہ غالباً سنہ ۳۱ یا سنہ ۳۲ء میں برلن سے جامعہ تشریف لائی تھیں۔ اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو چھوڑ کر محض جامعہ کے بچوں کی خدمت کا جذبہ انھیں ہزاروں میل سے ہندوستان کھینچ لایا تھا۔ جامعہ میں پہنچتے ہی وہ اپنے کام میں لگ گئیں۔ کام یعنی بچوں کی خدمت۔ بچے جامعہ کے ننھے ننھے بچے ان سے بہت جلد مانوس ہو گئے اور ان سے محبت کرنے لگے ایسی محبت جو بچہ اپنی ماں سے کرتا ہے۔ اپنی بڑی بہن سے کرتا ہے۔ مدرسے کے گھنٹوں میں وہ انھیں اچھی اچھی تصویریں اچھے اچھے کھلونے بنانا سکھاتیں۔ کھیل ہی کھیل میں وہ کچھ پڑھاتی بھی جاتیں اس انداز سے کہ بچوں کے دل پر نقش ہو جائے۔ چھٹی کے بعد وہ ان کے بورڈنگ میں پہنچ جاتیں۔ بچے انھیں دیکھ کر دور ہی سے دوڑ پڑتے۔ ہماری آپا جان ہماری آپا جان کہتے ہوئے انھیں لپٹ جاتے۔ اب یہ کسی کا منہ دھلا رہی ہیں۔ کسی کا کوئی کپڑا پھٹ گیا ہے یا ادھڑ گیا ہے تو اسے سی رہی ہیں۔ بچوں کے کمرے سجا رہی ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں انھیں بتا رہی ہیں کہ بستر کیسے تہ کرنا چاہیئے اور کمرے کی دوسری چیزیں کس طرح سلیقے سے رکھنی چاہئیں۔ پھر انھیں مزے مزے کے نئے نئے کھیل کھلا رہی ہیں۔ ان کھیلوں میں بچوں کے ساتھ وہ خود بھی شریک ہیں۔ غرض بچوں میں بچہ بن گئی ہیں۔ اور بچے انھیں بھی دوسرے ساتھیوں کی طرح اپنا ایک ساتھی سمجھ رہے ہیں۔ یہ گویا ان کا روزانہ کا معمول تھا۔

انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ جامعہ سے بچوں کا ایک رسالہ بھی نکلتا ہے۔ پیام تعلیم۔ تو بہت خوش ہوئیں۔ اس کی ترقی کے لئے بڑی اچھی اچھی باتیں بتائیں اس کے لئے اچھے اچھے مضمون لکھے پیام برادری کا سلسلہ قائم کیا گیا تو انھوں نے اس کا سرپرست بننا منظور کیا اور اس تجویز کو آگے بڑھانے کے لئے اتنا کام کیا اتنا کام کیا کہ حیرت ہوتی تھی۔ پیامیوں کے خطوں کے جواب لکھنا جرمنی اور دوسرے ملکوں سے ان کی خط و کتابت کرانا۔ غرض کہاں تک لکھا جائے۔ آخر میں ان کی مصروفیتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ پھر بھی جب کبھی انھیں موقع ملتا تھا پیام تعلیم کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور

کرتی تھیں۔ پچھلے سال ان کا ایک اچھا سا مضمون چھپ چکا ہے۔ ایک مضمون (لڑکیوں کے لئے) ہمارے پاس رکھا ہوا ہے اس کا ترجمہ کرایا جا رہا ہے انشاء اللہ جلد شائع کیا جائے گا۔

موجودہ لڑائی کے شروع میں ہندوستان میں جتنے بھی جرمنی کے رہنے والے تھے سب نظر بند کر دیے گئے۔ مرحومہ آپا جان بھی اسی لپیٹ میں آگئیں اور پونا بھیج دی گئیں۔ مگر بعد میں انھیں چھوڑ دیا گیا اور یہ پھر اپنے اسی کام میں لگ گئیں۔ پونا سے واپس آئی ہیں تو تندرستی بہت اچھی تھی۔ مگر پیٹ میں تکلیف تھی۔ یہ تکلیف آہستہ آہستہ بڑھتی رہی۔ ڈاکٹروں نے اسے بہت معمولی مرض خیال کیا جب تکلیف حد سے بڑھی تو ایکسرے کرایا گیا معلوم ہوا کہ پیٹ میں رسولی ہے اور اتنی بڑھ گئی ہے کہ علاج ناممکن ہے۔ آپریشن ہوا اگر اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا اور آخر یہ موذی مرض جان لے کر ٹلا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تمھیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ وہ مسلمان ہو گئی تھیں اور ان کی تجہیز و تکفین اسلامی طریقے پر ہوئی۔ مرحومہ کی مدت کے دن جامعہ کے در و دیوار پر جو اداسی چھائی ہوئی تھی وہ ہمیشہ یاد رہے گی۔ پھر جامعہ والوں نے جنازہ جس شان و اہتمام سے اٹھایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بے لوث اور بے غرض خدمت کرنے والی خاتون سے جامعہ والوں کو کتنا دلی لگاؤ و کیسا سچا خلوص تھا جامعہ کے بچے، استاد بہت سے مہمان جنازے میں شریک تھے۔ جنازے کے دونوں طرف جامعہ کے استاد وردیاں پہنے باقاعدہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ بیچ میں جنازہ تھا مرحومہ کی آخری آرامگاہ بھی جامعہ ہی میں ہے۔ جامعہ کے ننھے ننھے بچے جنھیں وہ دل سے چاہتی تھیں جب ان کی قبر پر جائیں گے اور جب اس پر فاتحہ پڑھیں گے تو ان کی روح کو کتنی خوشی کتنا سکون اور کتنا اطمینان حاصل ہوگا۔

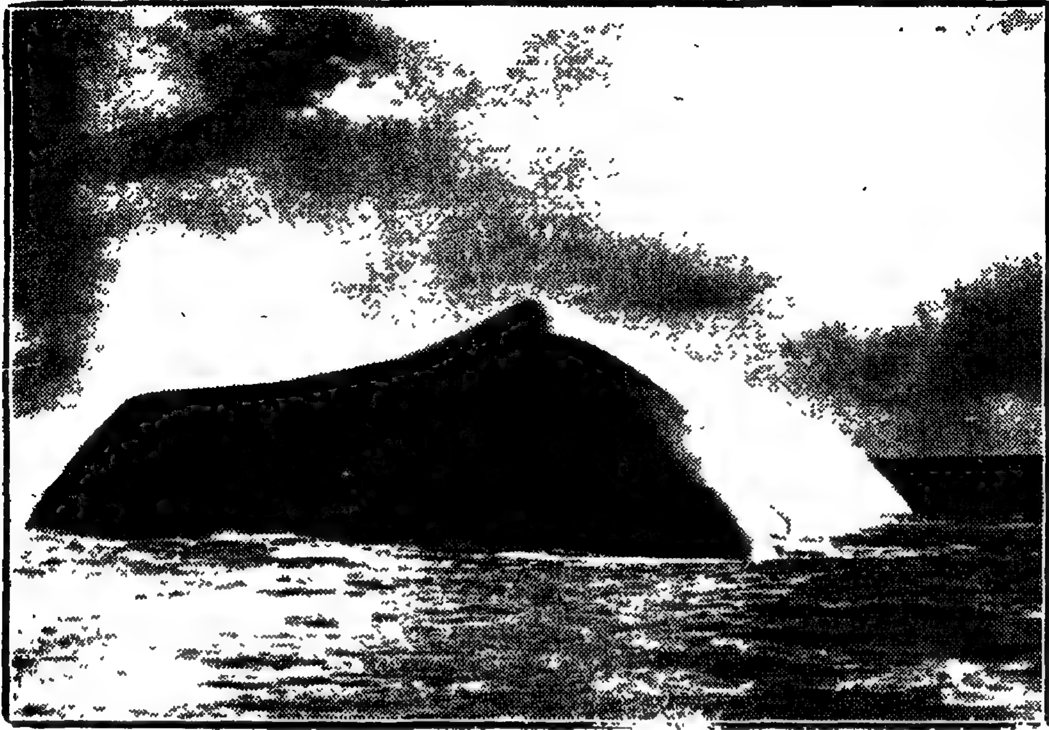
پیامیو! آپا جان رخصت ہو گئیں ہمیشہ کے لئے۔ مگر انھوں نے اپنے لوگوں کی طرح اپنے لئے ایک راہ اختیار کرلی تھی بے غرض خدمت کی راہ یہ راہ ہمارے تمھارے لئے بھی کھلی ہوئی ہے۔ کاش ہم میں بھی بے غرض خدمت کا لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہونے کا۔ لوگوں کی بھلائی کا کام کرنے کا ایسا ہی جذبہ پیدا ہو جائے جس کی مثال مرحومہ آپا جان قائم کر گئی ہیں۔

شاید تمھارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ مرحومہ آپا جان کی کوئی اچھی سی یادگار قائم کی جائے۔ ان کی سب سے اچھی یادگار تو یہ ہوگی کہ پیام برادری میں پھر سے جان ڈالی جائے۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟ ایک چھوٹی سی یادگار یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کے مضمون جو پیام تعلیم میں چھپ چکے ہیں کتاب کی شکل میں چھاپ دیئے جائیں تمھاری اس کے بارے میں کیا رائے ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی تجویزیں ہمارے ذہن میں ہیں پیامی بھی اپنی تجویزیں لکھ کر بھیجیں۔

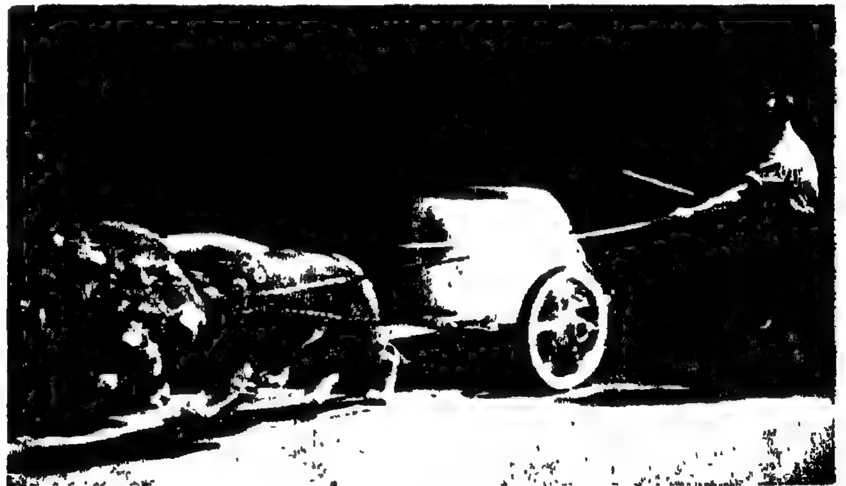
ٹیونسیا کی لڑائی آج کل اپنے آخری مرحلے پر ہے۔ روس میں کیوبان کے علاقے میں خوب لڑائی ہو رہی ہے۔ روس نے پولینڈ سے اپنے تعلقات ختم کر دئے ہیں۔ اس سے اتحادیوں میں بہت ہل چل مچی ہوئی ہے۔ امریکہ میں کوئلے کے کانوں کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی ہے۔ بحر الکاہل میں جاپان آسٹریلیا پر حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ ہوائی لڑائی جاپان اور اتحادیوں میں برابر جاری ہے۔

ہندوستان میں مہنگائی دن پر دن بڑھ رہی ہے۔ سیاسی حالات بدستور ہیں۔ حکومت نے امریکن نمائندے مسٹر فلپس کو گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو سے ملنے کی اجازت نہیں دی۔ بنگال میں مسلم لیگ کی وزارت قائم ہو گئی ہے۔ اسمبلی کی کونسل میں تین ممبروں کے استعفے کی وجہ سے جو جگہیں خالی ہوئی تھیں وہ اب بھر گئی ہیں۔ اپریل کے آخری ہفتہ میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس مسٹر جناح کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسٹر جناح کا خطبۂ صدارت عام طور پر پسند کیا گیا۔

(محمد حسین حسان)



سمندر میں برف کی ایک چٹان

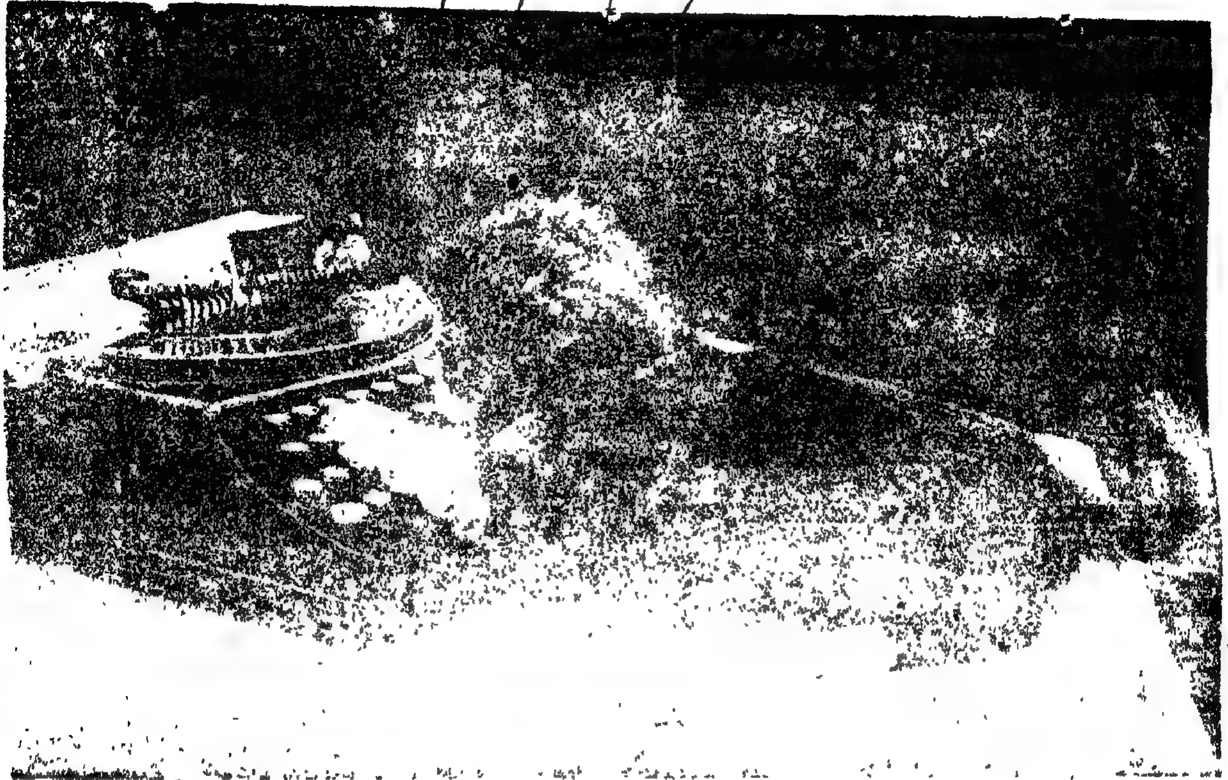


ایک نئے قسم کی سواری



1943

Regd No. L 1961

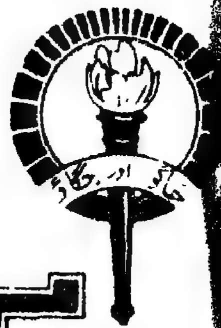




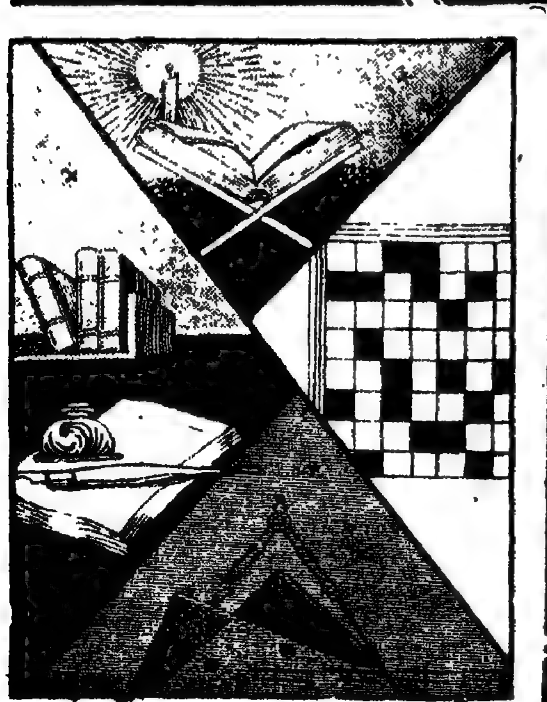


مئی
۱۹۴۳

تعلیمی پیام







FIROZE 42



ریچھ اور بچہ



پیام تعلیم دہلی

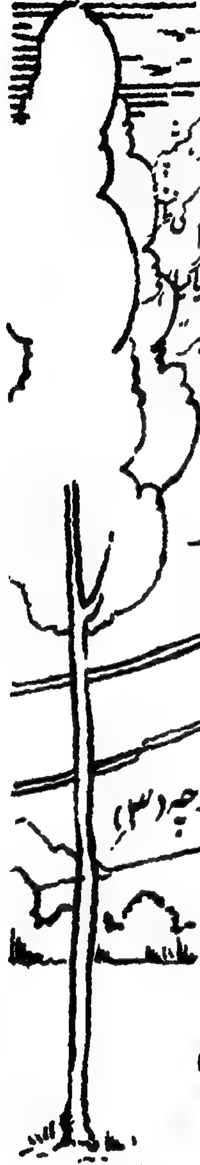
جلد ۲۶	مئی سنہ ۴۳ء	نمبر ۵



"پیام تعلیم"

دہلی یوپی ، سی پی ، بہار ، رام پور ، قلات ، بنگال ، میسور ، حیدرآباد ، سندھ ، کشمیر ، پنجاب بہار اور سرحد کے محکمہائے تعلیم کی طرف سے سرکاری طور پر منظور کیا گیا ہے۔

"منیجر"



قیمت سالانہ (عہ) فی پرچہ (۳)

فہرست مضامین

۱	بچوں سے باتیں	ایڈیٹر	۱۳۰
۲	علم	محمد شفیع الدین نیر	۱۳۱
۳	آپا جان	پروفیسر محمد مجیب ۔ جامعہ دہلی	۱۳۲
۴	سورج مکھی	محمد غوث انصاری	۱۳۷
۵	میرا چھوٹا بھائی	محمد ریاض الاسلام ۔ ام اے	۱۳۹
۶	شرارت کا پتلا	مولوی محمد شفیع الدین نیر	۱۴۱
۷	ہماری زمین	۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔	۱۴۲
۸	بچوں کی دکان	پروفیسر محمد عبدالغفور ام اے	۱۴۶
۹	آگرے کی سیر	محمد عثمان ہاشمی	۱۴۹
۱۰	پیام کیوری	سید سعید الشفیع ۔ علی گڑھ	۱۵۱
۱۱	فرصت کا مشغلہ	جمال آرٹسٹ	۱۵۵
۱۲	پیام برادری	ایڈیٹر	۱۵۶
۱۳	معما	۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔	۱۵۸



ایڈیٹر: محمد حسین حسان

پرنٹر پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین [illegible]

بچوں سے باتیں

اپریل کا پرچہ ابھی تھوڑے دنوں پہلے تمھیں مل چکا ہوگا۔ مئی کا یہ تمھارے ہاتھوں میں ہے۔ جون کا پرچہ بھی تیار ہے۔ جلد شائع ہوگا۔

اس مرتبہ آپا جان والے مضمون کی وجہ سے کئی مضمون چھپنے سے رہ گئے۔ یہ جون میں چھپیں گے۔ آپا جان والا مضمون امید ہے کہ تمھیں پسند آئے گا۔

پیامیوں نے پچھلے معمے کے حل امید سے کہیں زیادہ بھیجے۔ جن پیامیوں کے حل بالکل صحیح ہیں انھیں معمولی انعام کے علاوہ ایک خاص انعام بھی بھیجا جا رہا ہے۔

بعض پیامیوں نے ہم سے پوچھا ہے کہ انعام قرعہ اندازی کے ذریعے تو نہیں دیا جاتا تو بھئی یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ اگر قرعہ اندازی کی جاتی تو بس ایک ہی نام تو نکلتا۔ ہم نے کبھی اس طریقے کو پسند ہی نہیں کیا۔ انعام کے مستحق چاہے جتنے بچے بھی ہوں ان سب کو انعام بھیجا جاتا ہے۔

ہمارے کارکن صاحب کی غلطی سے پچھلے معمے (۳۱) کے انعام دفتر سے نہ بھیجے جا سکے۔ ان بچوں کے پتے کہیں کھو گئے۔ یہ پیامی اپنے پتے بھیج کر انعام منگوا لیں۔

منیجر کو خط لکھتے وقت اپنا نمبر خریداری اور پورا پتہ ضرور لکھ دیا کرو۔ ایڈیٹر کو کچھ لکھنا ہو تو بس اپنا پتہ لکھ دینا کافی ہے۔

علم

محمد شفیع الدین نیّر

علم سے انساں کا دل روشن ہوا / علم ہی سے عقل نے پائی جلا

علم سے عزت ملی انسان کو / علم نے دی تقویت ایمان کو

علم سے رتبہ ملا دولت ملی / علم سے شہرت ملی شوکت ملی

علم سے آساں تجارت ہوگئی / کاشتکاری نے ترقی اس سے کی

علم سے صنعت بڑھی حرفت بڑھی / علم سے راحت بڑھی فرحت بڑھی

علم نے ہم کو اٹھایا خاک سے / اور بڑھایا مرتبہ افلاک سے

حق یہ ہے انسان کا رہبر ہے علم / سچ یہ ہے انسان کا زیور ہے علم

اس لئے اے مالک اے میرے خدا / دل سے میرے یہ نکلتی ہے دعا

علم سے سارا جہاں خوش حال ہو
علم سے نیّر بھی مالا مال ہو

مرحومہ

آپا جان

محترمی پروفیسر محمد مجیب صاحب نے یہ مضمون رسالہ جامعہ اور ہمدرد جامعہ کے لئے لکھا تھا، پیام تعلیم کے لئے وہ فرصت نہ نکال سکے یہ مضمون بہت بڑا تھا۔ ہم اس کے ضروری حصے یہاں نقل کرتے ہیں (ایڈیٹر)

جہاں تک مجھے یاد ہے مس فلیپس بورن سے ذاکر صاحب، عابد صاحب کی اور میری پہلی ملاقات ایک دعوت میں ہوئی جو برلن میں مسز نائڈو کی سب سے چھوٹی بہن مسز نمبیار کے مکان پر ہوئی تھی۔ یہ دعوت کھانے پینے کی نہیں تھی۔ اس کا مقصد ہندوستانیوں اور مہذب، خوش اخلاق جرمنوں کے درمیان میل جول کے موقعے فراہم کرنا تھا۔ دعوت کی تاریخ کیا یاد رہتی سال کا بھی خیال نہیں۔ غالباً ۱۹۲۲ء تھا۔ اس پہلی ملاقات کے بعد دو ایک مرتبہ اور ایسی محفلوں میں ملنا ہوا۔ پھر دعوتوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔

مس فلیپس بورن کی بڑی بہن ڈاکٹر کارل مائر دق کے ایک ماہر کے یہاں کام کرتی تھیں۔ میں ڈاکٹر مائر سے اپنا معائنہ کرانے گیا تو وہ مجھے دیکھ کر اس طرح مسکرائیں کہ گویا برسوں سے جانتی ہیں۔ اُنھی سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ مس فلیپس بورن کی بڑی بہن ہیں۔ مس فلیپس بورن کی چھوٹی بہن کی شادی ایک خوش حال تاجر سے ہوئی۔ ان کا گھر بار تھا، بچے تھے۔ اطمینان سے زندگی بسر ہوتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ قسمت نے اُن کے گھر کو بڑی بے دردی سے اُجاڑا۔ ان کی پونجی لٹ گئی اور اب وہ اپنے شوہر کے ساتھ آسٹریلیا میں ہیں اور اُن کے بچے متحدہ ریاستوں امریکہ میں دوسرے عزیزوں کے ساتھ۔ مس فلیپس بورن کے ماں باپ کے آخری دن بڑی مصیبت میں گذرے۔ ان پر ایک طرف نازی حکومت کی مار پڑ رہی تھی۔ دوسری طرف اولاد سے جدائی کا صدمہ تھا۔

مس فلیپس بورن اپنی بہنوں میں سب سے زیادہ ذہین اور ہنرمند تھیں۔ ان کی طبیعت میں ویسی ہی بے قراری تھی جیسی کہ بڑی بہن میں لیکن

ہنر کا سہارا ملنا بڑی بات ہے۔ اُنھیں یقین تھا کہ جو کچھ کرنا چاہیں گی وہ نہ کر سکیں۔ اُنھوں نے میونخ کے مشہور اسکول میں گانا سیکھا تھا۔ وہ اس فن کو جسے جرمنی میں بڑی عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے برتتی رہتیں تو خاصی مشہور ہو جاتیں۔ اُن کی معقول آمدنی ہوتی اور وہ اپنی زندگی آرام سے گذارتیں۔ لیکن اطمینان سے رہنا انھیں گوارا نہ تھا۔ مس فلپس بورن کی حسّاس اور قدر شناس طبیعت پرورش اور پرداخت کے کسی ادنیٰ منصوبے کو عمر بھر کے لئے کافی نہیں سمجھتی تھی۔ اُنھوں نے نہ جانے کتنے لوگوں کے رنج اور پریشانیاں، فکریں اور الجھنیں، اُمیدیں اور حوصلے اپنا لئے اور یہ ایک خصوصیت تھی جس نے اُن کی اعلیٰ طبیعت کو اعلیٰ تر بنا دیا۔ برلن میں لاوارث یہودی بچّوں کے لئے ایک تربیت گاہ قائم کرنا تجویز ہوا۔ مس فلپس بورن خوشی سے اچھل پڑیں اور ایک مدّت تک اس تربیت گاہ کے سوا اور کسی چیز کا خیال اُن کے دل میں نہ آیا۔ اس کے لئے اُنھوں نے چندہ جمع کیا۔ گھر گھر مانگ کر اس کے لئے ضروری سامان اکٹھا کیا اور سامان کو مزدوروں کی طرح برلن کی سڑکوں پر ٹھیلوں میں لے گئیں۔ تربیت گاہ کا کوئی سرپرست نہ تھا۔ مس فلپس بورن اس کی والی اور وارث بن گئیں۔ ہندوستان آتے ہوئے وہ چند مہینے فلسطین میں ٹھہری تھیں یہاں کا سارا کام شروع سے...... کیا جا رہا تھا اور اس سے ان کو ایک لگاؤ ہو گیا جو جامعہ کی محبت کے باوجود قائم رہا۔ جامعہ کی بے سروسامانی نے اُن کی ہمّت پست کرنے کی بجائے اُن کے شوق کو دوبالا کر دیا۔ وقت کے ساتھ جامعہ والوں کے حوصلے بڑھتے رہے۔ روپیہ ملتا رہا، عمارتیں بنیں لیکن بے سروسامانی کا احساس بھی پہلے سے کچھ زیادہ ہوتا گیا۔ مس فلپس بورن صفر سے عدد بناتی رہیں۔ اِن کا سلیقہ ہماری مفلسی میں رونق پیدا کرتا رہا۔ جامعہ کی خدمت اُن کا آخری منصوبہ تھا اور وہ اس میں اس طرح لگ گئیں کہ اب کوئی ان کو اس سے الگ نہیں کر سکتا۔

مس فلپس بورن کو سب سے مرغوب وہ کام تھے جو نئے ہوں، مشکل ہوں، جنھیں کرنے والے کم ہوں مگر جو انسانیت یا اخلاق کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہوں۔ لوگ ایسے کاموں کی ذمّے داری لینے سے بچتے ہیں، اس لئے کہ اس میں جان کھپانا پڑتی ہے اور ان سے روحانی تسکین کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ مس فلپس بورن کے لئے ان کی سب سے بڑی کشش یہی تھی۔ ہم سب اپنے آپ سے پوچھتے رہتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں آخر کیوں کرتے ہیں اور اگر ہم اس سوال کا کوئی تسلّی بخش جواب نہ دے سکیں تو ہمارا جی چھوٹ جاتا ہے۔ خلق کی خدمت کی جا سکتی ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ خلق اپنی قوم ہی ہو۔ مس فلپس بورن یہودی تھیں جرمن قوم ان کی قوم بن نہیں سکتی تھی۔ یہودیوں

کو ایک قوم بنانا خدا کو منظور نہیں، وہ کرتیں تو کیا کرتیں۔ اس سات سال کی مدت میں جو ہماری پہلی ملاقات اور اُن کے جامعہ آنے کے درمیان گزری یورپی زندگی سے اُن کا رشتہ کم زور ہوتا گیا۔ اُن کا دل آزاد تھا، کہ جہاں جی چاہتا ٹھکانا نہ سکتا تھا۔ جامعہ میں آکر وہ جامعہ کی ہو گئیں۔ انھوں نے ہندوستان کو اپنا ملک مسلمانوں کو اپنی قوم اور ہوتے ہوتے اسلام کو اپنا مذہب بنا لیا۔ اس طرح جامعہ کو ایک بے لوث خادم مل گیا، اور مس فلپس بورن کو اپنے حوصلے پورے کرنے کے لئے ایک دُنیا، جو نئی تھی اور اُن کی اپنی تھی۔

آپا جان کبھی بے فکر اور بے کار نہیں رہ سکتی تھیں کام کے خیال کو اپنے دل سے نکال نہیں سکتی تھیں۔ جنت کرنے والے تھکتے ہیں اور تھکن کو دور کرنے کے لئے ستانا چاہتے ہیں۔ آپا جان کو ستانا بھی گراں لگتا۔ اگر کبھی اُن کے سپرد ایسا کام نہ ہوتا جس میں وہ منہمک رہ سکیں تو وہ رنجیدہ اور پریشان ہو جاتیں سمجھنے لگتیں کہ جامعہ کو اُن کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ اگر انھیں اتنے کام دے دیے جاتے کہ جنھیں معمولاً تین چار آدمی کرتے ہیں تو اُن کی خوشی، چہرے کی رونق اور رفتار کی تیزی دیکھنے کے قابل ہوتی۔ بیماری کے زمانے میں ایک روز انھوں نے مجھ سے کہا کہ "میری طبیعت ہر کام سے تھوڑے دنوں میں ہٹ جاتی ہے

جی چاہتا ہے کہ کوئی اور نیا کام شروع کردوں۔" آپا جان کی طبیعت میں استقلال نہیں تھا، اور اس میں شک نہیں کہ اچھا کام وہی ہوتا ہے جس میں شوق اور سلیقہ اور استقلال تینوں شریک ہوں۔ لیکن آپا جان کا منصب یہ نہیں تھا کہ ایک دو کام پابندی سے کرتی رہیں۔ جامعہ جس دور سے گزر رہی ہے اس میں یہ مفید نہیں ہے کہ اس کے خادم اپنے مقررہ فرائض کو انجام دیتے رہیں، اور نئی ضرورتوں اور مصلحتوں کا خیال نہ کریں۔ آپا جان ہمیشہ نئے کاموں کے لئے بے قرار رہتی تھیں۔ اور ان کی اس بے قراری کے سبب سے جامعہ کے کئی چھوٹے بڑے کام ہو گئے ہیں جس کے لئے قاعدے سے چلنے والے شاید فرصت ہی نہ نکال سکتے۔ آپا جان کی طبیعت میں صبر اور استقلال کی جو کمی تھی اس پر اُن کے شوق کی شدت اور سلیقے کی جمال آفرینی نے ایک خوش نما پردہ ڈال دیا۔ ہم اُن کے کاموں کی خوبی کو دیکھتے رہے اس پر خوش ہوتے رہے کہ ان کی توجہ سے ایک ہی کام نہیں بہت سے کام خوش اسلوبی سے انجام پاتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ آپا جان خود بڑی کش مکش میں رہتی ہیں۔ انھیں ان کا شوق ایک طرف لے جانا چاہتا ہے تو یہ احساس کہ معمول کی پابندی کرنا چاہئے دوسری طرف۔ ایک کام کو کرتے وقت انھیں دس اور کاموں کی فکر ستاتی رہتی ہے۔ پھر بھی جتنے نمونے کے کام آپا جان نے کئے جامعہ میں اور کسی نے نہ کئے

ہوں گے۔ اُن کا اُٹھنا اور بیٹھنا، کھانا اور پینا، ان کے دل کا اجالا، ان کی زندگی کا ماحصل ان کے یہی کام تھے انھوں نے جامعہ کی بستی اور اس کے کاروبار کو اپنے دل میں بسا لیا تھا۔ جیسے ماں اپنے بچے کو گود میں بٹھا لیتی ہے۔ اسے وہ بھول سکتی تھیں نہ چھوڑ سکتی تھیں جو کچھ وہ کرتیں اسی کے لئے کرتیں۔ جامعہ کے کام بہت تھے، آپا جان کو جامعہ سے محبت بہت تھی۔ وہ کاموں کا انتخاب نہیں کر سکیں، ان کو ترتیب نہیں دے سکیں اُن کے لئے جو ذراسی بے تعلقی ضروری ہے اُسے بھی اُن کی طبیعت گوارا نہ کر سکی۔

کاروبار بڑے سے بڑا ہو سکتا ہے مگر آدمی کے دل کو اُس سے بھی بڑا ہونا چاہئے۔ جامعہ کو سب کچھ دے دینے کے بعد بھی آپا جان کے دل میں بہت جگہ رہ گئی۔ اپنے اور کاموں کے ساتھ ساتھ وہ دوسروں کی سرپرستی اور مدد کرنے کے موقعے تلاش کرتی رہیں لاوارث یہودی مردوں اور عورتوں کے خط آخر تک اُن کے پاس آتے رہے۔ اُن کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان تمام یہودیوں کو جو جرمنی سے بھاگ کر آئے تھے جانتی ہیں اور اپنے آپ کو اس کا ذمے دار سمجھتی ہیں کہ جس کا ٹھکانا نہ ہو اُسے ٹھکانے سے لگائیں

جامعہ میں عورتوں اور بچوں کا علاج اور تیمارداری ان کے نزدیک ان کا خاص فرض تھا، اور انھیں بڑا دکھ ہوتا۔ اگر اُن کی مصروفیتوں کی وجہ سے کوئی بیمار اُن کی توجہ سے محروم رہتا اور تمام معاملات میں بھی ان کی انسانی ہمدردی ہر وقت مشورے اور مدد اور خدمت کے لئے حاضر رہتی۔ وہ اس کا انتظار نہیں کرتی تھیں کہ کوئی ان سے مشورہ لے یا مدد مانگے خود ہی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کو پہنچ جاتیں ہندوستانی عورتیں تیمارداری اور بچوں کی تربیت کے متعلق بہت سی باتیں نہیں جانتی ہیں۔ آپا جان کو اس کی وجہ سے بڑی فکر رہتی اور وہ چاہتی تھیں کہ جس طرح بھی ہو سکے وہ دوسری عورتوں کو جلدی سے وہ سب کچھ سکھا دیں جو خود انھیں آتا تھا۔ انھیں اس کی بھی بڑی آرزو تھی کہ مسلمان عورتوں میں کام کرنے کا سلیقہ اور خدمت کا شوق عام ہو جائے ان کی ہمدردی اور محبت جہاں تک بیداری پھیلا سکتی تھی پھیلاتی رہی۔

عورتوں کے لئے نہیں مردوں کے لئے بھی آپا جان ایک مثال تھیں۔ کام کی دشواریاں ان کے جوش کو کبھی ٹھنڈا نہ کر سکیں۔ جامعہ کی بے مائگی سے اُن کے حوصلے کبھی پست نہیں ہوئے۔ اپنے ساتھیوں کے شوق اور ان کی استعداد پر انھیں ہمیشہ اعتبار رہا۔ ایسا اعتبار دوسروں میں خود اعتمادی پیدا کرتا ہے اور بارہا ایسا ہوا کہ آپا جان کی ہمت افزائی نے وہ کام کرا دئے جن کے انجام پا سکنے کی کسی کو امید نہیں تھی۔ ان کی سمجھ میں جیسے یہ نہ آتا تھا کہ کام کٹ ہوتے

ہوئے لوگ مطمئن کیسے رہ سکتے ہیں ویسے ہی وہ یہ نہ سمجھ سکیں کہ وہ مایوس کیوں ہوتے ہیں۔ آپا جان کو جامعہ ہمیشہ پھولتی پھلتی۔ آسمان کی طرف بڑھتی، زمین پر اپنا سایہ پھیلاتی نظر آئی۔ اور انھیں یقین تھا کہ اس کے خلاف کسی کو کچھ دکھائی دیتا ہے تو وہ نظر کا فریب ہے۔ آپا جان کو سمجھانا اور قائل کرنا آسان نہ تھا۔ آخر میں ہم ہی کو ماننا پڑتا کہ ہمارے اندیشے غلط ہیں۔ مایوسی بے بنیاد۔ آپا جان کے دل میں امید کی جو روشنی تھی وہ ہماری آنکھوں کا نور بن جاتی۔

بیماری کی بے بسی انسان کا بڑا سخت امتحان لیتی ہے۔ بیمار کا کوئی فرض نہیں ہوتا، حق ہی ہوتا ہے، اور وہ چاہتا ہے کہ یہ حق اُسے پورا پورا ملے، آپا جان کو اصرار تھا کہ انھیں کم سے کم دیا جائے انھیں برابر اس کی فکر رہتی تھی کہ ان کی وجہ سے جامعہ کے کسی کام کا حرج نہ ہو۔ آپریشن کے بعد کچھ دن ان کی طبیعت اچھی رہی، لوگ ان سے ملنے جاتے تھے تو جامعہ ہی کا ذکر رہتا تھا ان کی حالت بگڑ گئی تب بھی جو دو چار جملے وہ بول سکتی تھیں وہ جامعہ کی نذر ہوتے تھے۔ ۱۸ اپریل کو ان کی سانس اُکھڑ چکی تھی۔ انھیں دیکھنے کے لئے معمول سے زیادہ لوگ چلے گئے۔ کئی گھنٹے بعد انھیں ذرا سا ہوش آیا اور انھوں نے چار پانچ لوگوں کو پلنگ کے گرداگرد کھڑا پایا تو کہا کہ آج جامعہ میں جلسہ نہ ہوگا آپ سب یہاں آگئے ہیں ہم نے اُنھیں یقین دلایا کہ قومی ہفتے کا جلسہ ایک دن پہلے ہو چکا ہے تو انھیں اطمینان ہوگیا اور اُنھوں نے مسکرا کر آنکھیں بند کرلیں جامعہ کی فکر کے ساتھ اُنھیں آخر وقت تک اُس پاس کے لوگوں کا بھی خیال تھا۔ ہسپتال کے جس مریض کو ضرورت ہوتی اس کے پاس وہ اپنی دوا اور غذا اور نرس کو ضد کرکے بھیجتیں مریضوں کا حال دریافت کرتی رہتیں۔ ان کی تکلیف کو اپنا دکھ درد بنا لیتیں۔ انتقال سے ایک دن پہلے اُن کی طبیعت ذرا دیر کے لئے سنبھلی تو انھوں نے ایک بچے کو جو قریب کے وارڈ میں رہتا تھا روتے سُنا۔ اُنھوں نے فوراً نرس کو بھیج کر اسے اپنے پاس بلوا لیا بسکٹ کھلائے، پیار کیا۔ اپنے پاس لٹایا، اور تھپک کر سلا دیا۔ یہ اُن کی محبت کا آخری کرشمہ، ان کی نسوانیت کی معراج تھا +



محمد غوث انصاری
فرنگی محل

آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے

بہت دنوں کی بات ہے۔ سمندر کی تہ میں بہت سی پریاں رہتی تھیں۔ یہ پریاں بہت خوب صورت تھیں۔ اُن کے محل کی دیواریں جواہرات اور موتی کی بنی ہوئی تھیں۔ چھت سنگ مرمر کی۔

ہر ایک پری کے پاس موتیوں کی بنی ہوئی ایک گاڑی بھی تھی۔ تمھیں معلوم ہے سمندر میں گھوڑے تو ہوتے نہیں ان گاڑیوں کو مچھلیاں کھینچتی تھیں۔

دن میں یہ پریاں محل کے اندر خوب ناچتیں، کودتیں۔ آنکھ مچولی کھیلتیں اور مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کرتیں۔ جوں ہی رات ہوتی مچھلیاں اُن کی گاڑیاں کھینچتی ہوئی سمندر کے باہر کنارے پر لاتیں۔ پریاں رات بھر خشکی پر کھیلتیں اور سورج نکلنے سے پہلے اپنے محل میں واپس چلی جاتیں۔ اسی وجہ سے اُنھوں نے اب تک سورج کی روشنی نہیں دیکھی تھی۔

ایک روز اتفاق سے ایک چھوٹی پری کلائٹی بہت دیر تک خشکی پر ٹھیری رہی۔ تھوڑی دیر میں اسے پورب کی طرف سے روشنی سی نظر آئی۔ کلائٹی نے اس سے پہلے ایسی روشنی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ وہ دل ہی دل میں کہنے لگی کتنی اچھی روشنی ہے۔ میں اس کا پتہ ضرور لگاؤں گی کہ یہ کہاں سے آتی ہے۔ وہ برابر روشنی کی طرف نظر جمائے رہی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی سونے کی گاڑی جا رہی ہے۔ دو عمدہ سفید گھوڑے جُتے ہوئے ہیں اور گاڑی میں کوئی بادشاہ بیٹھا ہے بہت شان و شوکت کے ساتھ۔ یہ گاڑی اور یہ بادشاہ اتنا خوب صورت تھا کہ کلائٹی اُسے برابر دیکھتی رہی۔ وہ اپنے دل میں کہنے لگی کاش یہ بادشاہ ہمارے محل میں آتا اور ہم اس کے ساتھ خوب کھیلتے یا یہاں اُترتا اور مجھے اپنے ساتھ لے جاتا۔ مگر بادشاہ نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ کلائٹی اس سے بہت رنجیدہ ہوئی۔

رات کو کلائٹی کی تمام بہنیں پھر خشکی پر آئیں،

اور کلائٹی سے کھیلنے کو کہا۔ مگر کلائٹی اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں۔ صبح کو جو عجیب وغریب چیز اُس نے دیکھی تھی وہ اپنی بہنوں کو بتائی اور کہنے لگی "میں اس وقت تک اپنی جگہ سے نہ ہلوں گی جب تک بادشاہ میرے پاس نہ آئے گا" دوسرے دن صبح کو بھی اور پریاں تو محل کو لوٹ گئیں مگر اس نے اِدھر کا رُخ نہیں کیا۔ کلائٹی اس وقت نہ تو اپنے کو سمندری پری سمجھ رہی تھی نہ سمندر کے بادشاہ کی لڑکی۔ اس وقت تو اُس کے دل میں بس ایک ہی خواہش تھی اور وہ اسی بادشاہ کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔

کلائٹی کئی روز یہی آس لگائے بیٹھی رہی کہ شاید کسی روز بادشاہ اسے دیکھے اور اپنے ساتھ لے جائے۔ مگر بادشاہ ہمیشہ اس کی طرف دیکھے بغیر گذر جاتا تھا۔ ایک روز اُس نے سوچا کسی دوسری جگہ چلنا چاہیئے۔ پھر تو بادشاہ اُسے ضرور دیکھے گا۔ پر جب اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی تو اُسے ایسا معلوم ہوا کہ اُس کے پاؤں جڑیں بن کر زمین میں گھس گئے ہیں اور سنہرے بال پھولوں کی پنکھڑیاں بن گئے اور وہ ایک خوب صورت پھول کا درخت بن گئی ہے۔

جب وہی بادشاہ آسمان پر سے گذرتا ہے تو کلائٹی کے پھول مڑ مڑ کر مہربان بادشاہ کی طرف دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں بادشاہ سلامت مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے چلو۔ مگر اب بھی بادشاہ اس کی طرف دیکھے بغیر گذر جاتا ہے۔ جب لوگ اس کے خوب صورت پھول کو دیکھتے ہیں تو اُسے سورج مکھی کہتے ہیں +

میرا چھوٹا بھائی

ریاض الاسلام
ام۔اے۔ علیگ

حضرت شیخ سعدی کو نہ معلوم کیا تلخ تجربہ ہوا تھا جو انھیں کہنا پڑا "سگ باش برادر خورد مباش" یعنی چھوٹے بھائی ہونے سے کتا ہونا بہتر ہے۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ کبھی کبھی چھوٹے بھائی کا ہونا بھی ایک مصیبت ہو جاتی ہے۔ اگرچہ وہ مصیبت ہوتی ہے مزے دار قسم کی۔ ہمارے چھوٹے بھائی صاحب جب پہلی پہلی ہمارے گھر آئے تو ہماری آزادی بھی کچھ بڑھ گئی۔ اور پابندیاں بھی زیادہ ہو گئیں آزادی اس طرح کہ جب کبھی پڑھنے سے جی گھبراتا، جلدی اُسے کھلانے لگتے، بعد میں پوچھ گچھ ہوتی تو نہایت معقول جواب پیش کر دیتے کہ مدو نے روتے روتے برا حال کر دیا تھا اسے چپ کرانے اور کھلانے میں سارا وقت گذر گیا۔ اور ساتھ ہی یہ احتجاجی ٹکڑا بھی لگا دیتے:

"ابا جان اس نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے دم بھر کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا" جیسے ہم تو پڑھنے کے پیچھے دلوانے ہیں۔ ہماری پابندیاں اس طرح بڑھیں کہ ہمارا جی تو چاہ رہا ہے باہر جا کر کھیلنے کو اور اماں جان نے حکم لگا دیا کہ مسعود جاؤ مدو کے پاس بیٹھ جاؤ دیکھو گرنے نہ پائے، دیکھو روئے نہیں جیسے بچوں کا رونا بھی اختیار کی بات ہے۔ خیر یہ آزادیاں اور پابندیاں تو جیسی تھیں تھیں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ ننھے مدو کے آنے سے گھر میں رونق اور چہل پہل بہت بڑھ گئی تھی۔ سارے گھر کو ایک کھلونا سا مل گیا تھا جسے دیکھو اسی کے گن گاتا تھا اور آپ لوگوں سے اس حقیقت سے چھپانے کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں کہ مدو کے آنے سے کچھ دنوں کے لئے گھر میں میری اہمیت بہت کم ہو گئی تھی ورنہ ان کی آمد سے پہلے تو ہم گھر کے راجہ اور شہزادے تھے۔ کبھی کبھی تو اس تبدیلی کا دل پر اتنا اثر ہوتا تھا کہ جی میں آتا تھا کہ میں بھی اپنا ایک علیحدہ پاکستان بنا ڈالوں۔

مدو کا پالنے کا زمانہ ختم ہوا اور وہ زمین پر کچھ چلنے پھرنے لگے تو ہم نے ایک نئی پالیسی اختیار کی۔ ہمارے ہاتھ سے کوئی چیز ٹوٹی اور ہم

نے مدّو کا نام لے دیا۔ ڈبیے میں سے بسکٹ جیب میں رکھے، پوچھ گچھ ہوئی تو کھٹ سے کہہ دیا کہ سب حرکتیں مدّو کی ہیں۔ جانے گھر میں کیا کیا ٹٹولتا پھرتا ہے۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ ہماری رپورٹ پر مدّو کی شامت آ ہی گئی تھی کہ ہمارے دل میں ایک دم معصوم مدّو کی محبت اُمنڈ آئی اور ہم نے امّی کا ہاتھ روک کر کہا "امّی اسے نہ مارو، اپّا کا حلوہ میں نے کھا لیا تھا"۔ لیکن ہماری یہ پالیسی کچھ زیادہ دنوں تک نہ چل سکی، کاغذ کی ناؤ تھی، کب تک چلتی۔ دو ایک بار ہمارا جھوٹ پکڑا گیا اور ہمیں اس کا سخت کفارا دینا پڑا۔ اس کے علاوہ محمود بھی اب ماشاء اللہ ان باتوں کو سمجھنے لگا تھا۔ اس لئے یہ پالیسی چھوڑنا پڑی۔

محمود اور بڑا ہوا تو ایک نئی مصیبت یہ آئی کہ وہ حضرت اپنے حقوق طلب کرنے لگے۔ تمام وہ چیزیں اور آسائشیں جن پر پہلے ہمارا من مانا اجارا تھا، اب ان میں یہ حضرت بھی حق طلب کرنے لگے امّی سے ہم اکٹھے پیسے جو اینٹھ لیا کرتے تھے اُن میں اُن کا بھی حصہ ہو گیا۔ کھانے پینے کی چیزوں میں جیسے بخرے ہونے لگے گھر والے امرود کی بہار میں آدھا حصہ اُن کا ہو گیا۔ اس دور کو بھی ہم نے جیسے تیسے سہا۔ کبھی کبھی مدّو جب بہت ہاتھ پاؤں پھیلاتا تھا تو ہم اُسے ٹھونک بھی دیا کرتے تھے لیکن صرف کبھی کبھی۔ کیونکہ عام طور سے انھیں پیٹنے کے بعد خود ہمیں بھی پٹنا پڑتا تھا کبھی کبھی میں اُسے پدّو کہہ کر چڑھاتا تھا لیکن وہ اس کا مُنہ توڑ جواب دیتا جو میں آپ کو بتانا مناسب نہیں سمجھتا۔

اس کے بعد مدّو کا مدرسے میں داخلہ ہوا مدّو کے اس دور سے ہم نے بہت فائدہ اُٹھایا۔ مدّو کھلنڈرا نکلا۔ حافجی (حافظ جی) اسے کتنی ہی محنت سے پڑھاتے، وہ سبق یاد نہ کرتا۔ اس کا جی مٹی کے کھلونے بنانے، کاغذ پر ٹیڑھی ٹیڑھی تصویریں بنانے گھر کی آرائش کرنے۔ کھیلنے کودنے میں پڑا رہتا ابا جان ان باتوں سے بہت چڑتے تھے۔ مدّو کو سبق یاد کرانے اور اس کا سبق سننے کا کام ہمارے سپرد کیا گیا۔ سبق مدّو کی دکھتی رگ تھی۔ یہاں اُسے ہمیں دبنا پڑتا تھا۔ اسی زمانے میں مدّو کو کبھی ہماری شکایت کرنے کی ہمت نہیں پڑی اور سبق سنانے کے سلسلے میں انھیں اکثر اپنی مٹھائی میں سے ہمیں بھی حصہ دینا پڑتا تھا۔

ہم اس زمانے میں مدرسے کے چکّر سے نکل کر اسکول میں داخل ہو گئے۔ اسکول کے داخل ہونے پر مجھے بہت جلد اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ جو چیز محمود کو پڑھائی میں بدذوق بنائے ہوئے ہے وہ حافجی کا پٹنی اور رٹنی والا طریقہ ہے میں نے

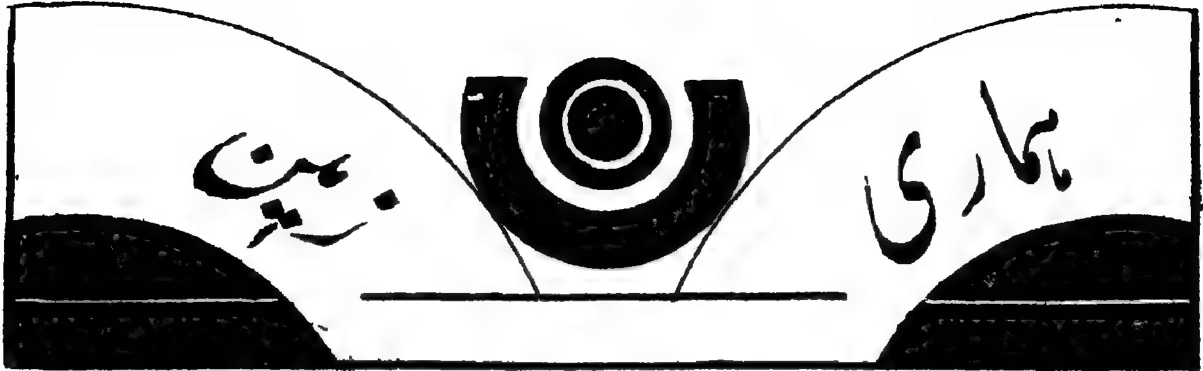
والد صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ محمود کو بھی اسکول کے پہلے درجے میں داخل کرا دیں۔ اوّل اوّل تو انھوں نے مخالفت کی لیکن میں نے ان کے دو اک دوستوں کو کچھ اس طرح گانٹھا کہ آخرکار اُنھیں بھی ہاں کرنا ہی پڑی۔ میرا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔ اسکول میں آ کر محمود کے جوہر کھلے وہ بہت جلد اپنے کلاس کا سب سے اچھا طالب علم سب سے اچھا کھلاڑی اور سب سے ہر دل عزیز لڑکا ہو گیا۔

محمود اب خوب بڑا ہو گیا ہے۔ اب بھی میں کبھی کبھی اس کے کان کھینچ لیتا ہوں۔ لیکن پیار سے۔ ہم اب دونوں کبھی ایک دوسرے کی شکایت نہیں کرتے۔ کبھی کبھی ان بیتے ہوئے دنوں کی یاد آ جاتی ہے تو خوب ہنسی آتی ہے اور ایسا لطف آتا ہے جیسے کسی مزے دار چیز کے کھانے کے بعد تالو میں اس کا مزا رہ جاتا ہے +

شرارت کا پتلا

محمد شفیع الدین نیّر

یہ اک لڑکے کا قصہ ہے
شرارت کا جو پتلا تھا
وہ اتنا چیختا دن بھر
کہ گھر سر پر اُٹھا لیتا
بڑوں کا کچھ لحاظ اُس کو
نہ اِس کو پاس چھوٹوں کا
نہ اُس کو فکر تھی ماں کی
نہ اس کو باپ کی پروا
بہن ہو یا کہ ہو بھائی
ہر اک سے اُس کا تھا جھگڑا
اُڑائے اس نے پھل اُس کے
مٹھائی اس کی لے بھاگا
نہ پڑھنے سے اُسے رغبت
نہ اُس کو شوق لکھنے کا
وہ سارے دن یہی کرتا
اِدھر پھرتا اُدھر پھرتا
کبھی اس چیز کو چھیڑا
کبھی اُس چیز کو توڑا
کبھی اِس تخت کو پھیلا
کبھی اُس میز کو کاٹا
کبھی بابا کو دھمکی دی
کبھی نوکر سے لڑ بیٹھا
کبھی اس نے شکایت کی
کبھی اُس نے کیا شکوا
غرض اس کی شرارت سے
سبھی کا ناک میں دم تھا



ہم نہا دھو کر غسل خانے سے نکلے تو ناشتہ تیار تھا۔ واجد میاں بہت بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے تھے، رہ رہ کے پہلو بدل رہے تھے۔ آخر ضبط نہ ہو سکا کہنے لگے "پیارے بھائی آئیے نا جلدی سے، ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے" حبیب میاں بھی ماموں صاحب کی گود میں آکر بیٹھ گئے، بہت بھوکے تھے پھر سیر کرکے آئے تھے، اس لئے انھوں نے کسی کا انتظار مناسب نہیں سمجھا۔

میں نے ناشتہ شروع کیا تو واجد میاں بولے "ہاں پیارے بھائی آپ اس وقت کیا کہہ رہے تھے۔ شاید پانی کا ذکر تھا" میں نے کہا "بھئی ایسی جلدی کیا ہے، ذرا ناشتہ تو کر لینے دو" واجد میاں بہت لجاجت سے بولے "نہیں میرے پیارے بھائی ناشتہ بھی ہوتا جائے، باتیں بھی ہوتی جائیں" میں اُن کی صورت دیکھ کر ہنس دیا۔ ماموں صاحب کو بھی ہنسی آگئی۔ واجد میاں پہلے تو کچھ جھینپ سے گئے مگر پھر سنبھل کر بولے "ہاں پیارے بھائی وہ پانی والی بات تو سمجھ میں آگئی اب اس کے بعد بتایئے کہ پھر کیا ہوا" ماموں صاحب نے بھی کہا "ہاں بھئی پانی کے بارے میں تم نے جو کچھ بتایا وہ ٹھیک ہی ہوگا مگر یہ پہاڑ وہاڑ کہاں سے نمودار ہو گئے" میں نے کہا دیکھئے زمین جوں جوں ٹھنڈی پڑی اس کے اوپری پرت میں شکنیں پیدا ہوتی گئیں۔ یہی شکنیں آہستہ آہستہ اونچی ہوتی گئیں اور پہاڑ وجود میں آگئے۔

اس وقت فہمیدہ، آصفہ، سعیدہ آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ ہماری باتوں کی بھنک بھی اُن کے کانوں میں پڑ گئی۔ فہمیدہ بولیں دیکھا کیسی بے پر کی اُڑا رہے ہیں۔ میں تو حیران ہوں ایسی باتیں جانے کہاں سے اُن کے دماغ میں آجاتی ہیں۔ ماموں صاحب بولے "یہ شکنوں والی بات تو ہماری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ واجد میاں

نے بھی نعرہ لگایا، ہاں پیارے بھائی ہم بھی نہیں سمجھے میں نے کہا " اچھا دیکھو سیب ہے نا سیب اسے بہت دنوں تک یوں ہی رکھا رہنے دو، اس کے چھلکے پر جھریاں پڑ جائیں گی، یہی حال زمین کے اوپری پرت کا ہوا۔ جب یہ ٹھنڈا پڑا تو سکڑنے لگا اور اس پر شکنیں یا جھریاں پڑنے لگیں " واجد میاں بولے " ہاں اب تو کچھ سمجھ میں آرہا ہے " عائشہ بہن تو بے پر روٹی ڈال رہی تھیں اٹھلا کے بولیں " سمجھ میں آرہا ہے خاک سمجھ میں آرہا ہے .... " آصف نے کہا دیکھو تم نے پھر اٹھلا کے بات کی اور واجد کو چھیڑا۔ واجد میاں نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں برابر میری طرف دیکھتے رہے۔ میں نے کہا " اچھا ٹھہرو میں ایک بات اور بتاتا ہوں۔ زمین کا اوپر کا پرت تو بہت جلد ٹھنڈا ہو گیا مگر اس کے نیچے یعنی اس کے اندر کا حصہ اسی طرح گرم رہا۔ تم نے تازہ تازہ سموسہ کھایا ہے کبھی دھوکے سے کھا نہ لینا منہ جل جائے گا۔ اس کے اوپر کا پرت تو ہوا لگتے ہی ٹھنڈا ہونے لگتا ہے، مگر اندر کا حصہ خوب گرم رہتا ہے، پھر تھوڑی دیر بعد وہ بھی ٹھنڈا ہو کر سکڑنے لگتا ہے ہماری زمین بھی ایک طرح سے سموسے ہی سے ملتی جلتی ہے " یہ سن کر واجد میاں کے منہ میں کچھ پانی سا بھر آیا کہنے لگے پیارے بھائی یہ مثال تو آپ نے

بڑے مزے کی دی، ابا پیارے سموسے پکوائیے بڑے مزے کے پکاتی ہیں " میں نے کہا " بھئی پہلے میری بات تو سن لو، ہاں تو سموسے کی طرح زمین کے اندر کا حصہ بھی آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہو کر سکڑنے لگا۔ اس سکڑنے سے اوپر کی زمین دھنسنے لگی۔ زمین میں جو بھاری چیزیں تھیں وہ اس گڑھے میں نیچے چلی گئیں، ہلکی چیزیں مثلاً چٹانیں وغیرہ اوپر آگئیں اور پہاڑ بن گئے۔ اس کے علاوہ بعض چٹانوں پر مٹی کی تہیں جمی ہوئی تھیں، مینہہ کے پانی سے مٹی دھل گئی اور پہاڑ نکل آئے۔ پہاڑوں کے وجود میں آنے کا ایک سبب اور بھی ہے اور بہت حیرت میں ڈالنے والا " واجد میاں بولے " کیا؟ کیا؟ پیارے بھائی جلدی سے بتائیے " ماموں صاحب بھی چار کی پیالی تشتری میں رکھ کر میری طرف سے غور سے دیکھنے لگے " میں نے کہا " دیکھو پہاڑوں پر مینہہ برستا ہے، اور خوب تیز تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ ان کی وجہ سے پہاڑوں میں ٹوٹ پھوٹ ہوتی رہتی ہے۔ پہاڑی چٹانیں ریزہ ریزہ ہو کر دریاؤں کے ذریعے بہہ کر سمندر کی تہہ میں چلی جاتی ہیں " واجد میاں بولے " یہ کیسے پیارے بھائی " میں نے کہا " پہلے تو یہ سمجھ لو کہ جتنے بھی دریا ہیں ان سب کا پانی سمندر میں جا گرتا ہے " واجد میاں بولے " تو کیا پیارے

بھائی سب ندیاں سمندر سے جا ملتی ہیں۔ میں نے کہا" نہیں چھوٹے چھوٹے دریا اور ندیاں بڑے بڑے دریاؤں سے جا کر مل جاتی ہیں جیسے دریائے گنگا ہے وہی گنگا جو کان پور میں بہتا ہے۔ اس دریا میں نہ جانے کتنی ندیاں آ کر ملتی ہیں اور یہ دریائے گنگا ان سب کا پانی سمندر میں لے جا کر ڈال دیتا ہے۔ ہاں تو یہ دریا پہاڑوں سے، پتھروں کے ریتے اور میدانوں سے کیچڑ اور مٹی بھی بہا لے جاتے ہیں یہ چیزیں سمندر کی تہہ میں بیٹھتی جاتی ہیں اور سمندر میں ان کی تہوں پر تہیں جمتی چلی جاتی ہیں ہوتے ہوتے لاکھوں، کروڑوں برس میں یہ تہیں پانی کے اوپر آ جاتی ہیں تم نے ہمالیہ پہاڑ کا نام سنا ہے دہرادون گئے تھے نا اپنی پھپن آپا کے ہاں اور پھر وہاں سے دو دن کے لئے مسوری بھی گئے تھے تو یہ مسوری شہر ہمالیہ پہاڑ ہی پر تو ہے۔ دہرادون پہاڑ کی جڑ میں ہے۔ ہمالیہ پہاڑ پر ایسے ایسے جانے کتنے شہر آباد ہیں یہ پہاڑ بھی تو بہت لمبا چلا گیا ہے کوئی تیرہ سو میل لمبا۔ واجد میاں کہنے لگے" تو پیارے بھائی جہاں اب دہرادون آباد ہے وہاں پانی ہی پانی ہوگا۔ میں نے کہا" اور کیا"۔ واجد میاں کچھ اس انداز سے باتیں کر رہے تھے جیسے انھیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہنے لگے تو یہ اتنا پانی کیسے خشک ہو گیا پیارے بھائی۔ میں نے کہا" یہ کوئی ایک دن کی بات ہے! لاکھوں، کروڑوں برس میں یہ سب باتیں ہوئی ہوں گی۔ ماموں صاحب نے پوچھا مگر یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ پہاڑ سمندر میں سے نکلا ہے۔ میں نے کہا" سائنس دانوں کی تحقیق! ہمالیہ میں کوئی سولہ ہزار فٹ کی اونچائی پر عجیب عجیب طرح کی چٹانیں ملتی ہیں۔ مثلاً گھونگھوں کی یا اور جانوروں کی جو پتھر بن گئے ہیں اور سمندر ہی میں پائے جاتے ہیں" ماموں صاحب بھی اور واجد میاں بھی میری باتیں سن سن کر بہت حیران ہو رہے تھے میں نے کہا" یورپ میں بھی ایک پہاڑ ہے اس کا نام الپس ہے۔ وہ بھی اسی طرح سمندر میں سے نکلا ہے۔ واجد میاں بولے" اور پیارے بھائی یہ سمندر کیا ہوتا ہے۔ ہم نے تو دیکھا نہیں کیا آپ نے دیکھا ہے" میں نے کہا" ہاں میں ایک دفعہ کراچی گیا تھا۔ یہ شہر سمندر کے کنارے ہے بلکہ کشتی میں بیٹھ کر سمندر کی سیر بھی کی تھی تو بھئی سمندر کا معاملہ یہ ہے کہ شروع بالکل شروع زمانے میں جب زمین بن رہی تھی تو اس کے بعض حصے تو آہستہ آہستہ اونچے خوب اونچے ہوتے چلے گئے بعض حصے نیچے ہوتے چلے گئے اور بڑے بڑے گڑھے بن گئے" واجد میاں بولے بات کاٹ کر۔ جیسے تایا میاں کے گاؤں میں گھر کے

سامنے گڑھے ہیں۔ میں نے کہا "ہاں" مگر ان گڑھوں سے لاکھوں، کروڑوں گنا بڑے تو ان گڑھوں میں اسی زمانے میں پانی بھر گیا اور سمندر بن گئے۔ ان سمندروں کی گہرائی تو کہیں کہیں سو گز سے بھی کم ہے اور کہیں سات میل اور کہیں تو تھاہ ہی نہیں ملتی۔ سمندر کی گہرائی کا حال سن کر تو واجد میاں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حبیب میاں ان کی صورت دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑے۔ اور کہنے لگے "ارے یہ دیکھو ماموں صاحب کو کیا ہو گیا ہے" میں نے کہا "ہاں بھئی ایک پہاڑ کا ذکر کرنا تو میں بھول ہی گیا اسے آتش فشاں پہاڑ کہتے ہیں۔ زمین کے اندر جو گرم گرم مادہ ہے اُسے جہاں اوپر کی زمین نرم ملتی ہے وہاں چھید کر کے نکلنے لگتا ہے۔ اس مادّے کو لاوا کہتے ہیں۔ لاوا زمین کے اندر سے نکل نکل کر جمع ہوتا رہتا ہے اور اس کی تہیں جمتی چلی جاتی ہیں یہاں تک کہ یہ ایک دن اونچا سا پہاڑ بن جاتا ہے۔ جاپان میں بحرالکاہل سمندر کے بہت سے جزیروں میں اور اٹلی وغیرہ میں ایسے بہت سے آتش فشاں یا آگ پھینکنے والے پہاڑ ہیں۔

واجد میاں کچھ اور پوچھنا چاہتے تھے۔ اتنے میں رمضانی باہر سے آیا کہنے لگا "منے میاں باہر بیٹھے ہیں آپ کو بلا رہے ہیں کوئی ضروری کام ہے" ماموں صاحب ناک بھوں سکوڑ کے بولے "منے نے بھی کس وقت ہتیا دی ہے۔ کیسی مزے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اچھا یہ ڈبیا بٹوا لے جاؤ کہنا "آپ جب تک پان کھائیے وہ ابھی آتے ہیں" میں نے کہا "میرے خیال میں تو آپ تشریف ہی لے جائیے معلوم نہیں کیا ایسا ضروری کام ہے اور حبیب واجد صاحب آپ کی باتوں میں میری چاء ٹھنڈی ہو گئی، دوسری چاء بنوائیے۔ واجد میاں بولے ابھی لیجیے پیارے بھائی مگر ابھی باتیں تو پوچھے گا نا۔ میں نے کہا "اب بس کرو، دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد باتیں ہوں گی۔ مجھے ذرا بازار جانا ہے +

بچوں کی دکان

آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے

پروفیسر عبدالغفور ایم اے

آج بچوں کی دکان کا سالانہ جلسہ تھا۔ مدرسے میں خوب چہل پہل تھی، سارا اسکول دلہن بنا ہوا تھا اور سارے بچے باراتی تھے۔ ہر طرف رنگین جھنڈیاں۔ گلدستے اور سنہرے تختے سجے ہوئے۔ ویسے تو اس جلسے میں سبھی کچھ ہوا۔ مگر سب سے دلچسپ تقریب وہ تھی۔ جب ہر بچے کو ایک خوب صورت کرتے ہوئے مخملی بٹوے میں ٹکسال کی تازہ ڈھلی ہوئی چونیاں اور اٹھنیاں دی گئیں۔ "للو میاں چوتھے درجے میں پڑھتے تھے بٹوا ہاتھ میں آیا تو مارے خوشی کے پھولے نہ سمائے، لگے ہوا میں اچھالنے، اتنے میں اُن کے ایک لنگوٹیے دوست شمو دبے پاؤں پیچھے سے آئے اور ہوا ہی میں سے بٹوا دبوچ لیا۔ للو میاں کا دل دھک سے ہو گیا۔ جی میں کہنے لگے لو یہ چاندی کی ایسی جھنکار دینے والی چڑیا کیسے ہاتھ سے نکل گئی۔ مگر پیچھے مڑ کر دیکھا تو شمو تھے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ کہنے لگے "واہ صاحب آپ نے تو کمال کر دیا۔ ہمارا انعام ہی لے بھاگے تھے۔"

"انعام! انعام کون سا؟"

"یہی جو آج جلسے میں ہمیں ملا ہے۔" اس پر شمو قہقہہ مار کر ہنسے۔ اور کہنے لگے۔

"واہ بھئی واہ۔ تم بھی للو میاں ہی رہے ارے صاحب انعام کیسا۔ یہ تو ہمارا حق ہے دکان کا نفع دکان کے حصہ داروں میں تقسیم ہوا جس کا حصہ تھا اُسے پہنچا۔ اس میں انعام کا کیا سوال؟"

"اوہو ہم تو یہی سمجھ رہے تھے کتنی غلط بات تھی مگر یہ دکان میں حصہ داری کیسی؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ بھی خوب رہی۔ ہم ہی گاہک۔ اور ہم ہی دکان دار۔"

ارے بھئی یہ تو تمھیں ہیڈ ماسٹر صاحب کا

شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ انھیں کی مدد سے تو بچوں نے مل جل کر ...... دُکان کھولی ہے ورنہ للّو حلوائی کے یہاں سے گھٹیے تو بچوں کی سڑی بُسی مٹھائیاں کھاتے رہے اور اب تو دکان میں وہ صفائی اور قرینہ ہے کہ خواہ مخواہ کچھ نہ کچھ کھانے کو جی چاہتا ہے اور پھر آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ سال بھر سستی اور اچھی چیزیں خریدو اور آخر میں نفع کا نفع رکھوالو۔ بھئی یہ بھی خوب مزے کی رہی۔ ہماری تو ایک بات سمجھ میں آئی ہے۔ آج ہی گھر پہنچ کر محلّے میں ایک ایسی ہی دکان کھلوالیں۔ پھر تو چوبیس گھنٹے جشن رہیں گے۔ ادھر اماں سے پیسہ ملا، اور جھٹ دکان پر پہنچے۔ اور دیکھو! دکان پر اپنی پسند کی چیزیں رکھوائیں گے۔ اور پھر سال کیا چھ مہینے کے بعد نفع۔ (ذرا رُک کر اور متفکر ہو کر) لیکن بھئی! یہاں مدرسے میں تو سب لوگ لکھے پڑھے ہیں۔ انھوں نے تو دکان چلالی مگر محلّے والے کیسے چلائیں گے!

"واہ چلائیں گے کیوں نہیں۔ اپنا نفع نقصان سمجھتے ہیں۔ تو مزدور چلائیں گے اور تمھیں معلوم ہے کہ بچوں کی دکانیں اور امدادِ باہمی کی انجمنیں سب سے پہلے کس نے چلائیں؟ انھی بے چارے اَن پڑھ مزدوروں نے! انگلستان میں رابرٹ اوون نام ایک ہمدرد کارخانہ دار نے اپنے ہاں کے مزدوروں کی دُکان قائم کی۔ اس میں ہر مزدور کا حصّہ تھا۔ اس سے پہلے وہاں کے بنئے بقال بچارے مزدوروں کو خوب لوٹ لوٹ کر کھا رہے تھے۔ چیزیں مہنگی بھی دیتے تھے اور خراب بھی۔ امدادِ باہمی کی دکان نے اس لوٹ مار کو بند کر دیا۔ مگر رابرٹ اوون کے کارخانے میں مزدوروں کے حوصلے بہت بلند تھے دونوں ایک ساتھ مل جل کر پورے کارخانے کو حصّے داروں کی طرح چلانا چاہتے تھے۔ اور اکٹھے ہو کر ایک ایسی دنیا بسا لینا چاہتے تھے جس میں سب کے گھر اکٹھے۔ باورچی خانے اکٹھے کارخانے اکٹھے اور زمینیں اکٹھی ہوں۔ انگلستان کے مزدوروں میں ان خیالات کا پرچار سب سے پہلے رابرٹ اوون نے کیا تبھی تو اُسے سوشلزم کا علم بردار کہتے ہیں۔

"سوشلزم! ارے سوشلزم یہ کچھ ہے۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ سوشلزم بس اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے اور گپ بازی کرنے کا نام ہے۔"

"نہیں نہیں! سوشلزم تو زندگی بسر کرنے کا ایک ڈھنگ ہے اس کے ماتحت دولت پیدا کرنے والے اور چیزیں تیار کرنے والے ذریعے سب سماج یعنی قوم کے ہو جاتے ہیں۔"

"خدا نخواستہ یہ سماج نہ ہوئی، کسی مٹھ کی گورو گفتال۔ کسی درگاہ کی پیر ہو گئی۔ ہمارے ماموں ایک خانقاہ میں داخل ہو گئے تھے۔ وہ بھی یوں کہا کرتے تھے کہ مرید کی دولت اور کمائی سبھی کی ملکیت ہے اور سب کو مل بانٹ کر کمانا کھانا چاہیئے۔

"ہاں یہ خیال کچھ ایسا نیا تو نہیں ہے پرانا ہے مگر پرانے خیالات ہی نیا جنم لے کر دنیا میں نئے نئے انقلاب پیدا کرتے رہتے ہیں پچھلی صدی میں جب انگلستان میں سوشلسٹوں نے اپنا پرچار شروع کیا تو وہ بھی یہی کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ سوشلسٹ تھے اور پھر مشرق اور مغرب ہر جگہ دنیا میں اسی قسم کے خیالات رہے ہیں۔ ابن بطوطہ جس نے چودھویں صدی میں اسلامی دنیا کی سیر کی۔ لکھتا ہے کہ اس نے ملک روم کے کئی شہروں میں اخی لوگوں کی جماعتیں پائیں۔ یہ آپس میں بھائی بھائی کی طرح رہتے تھے۔ دن بھر مختلف مزدوری کرتے اور رات کو سب اخی اپنی کمائی مل بانٹ کر کھاتے تھے۔"

اور مل جل کر کام کرنے کا اصول تو انسانوں ہی میں ہی نہیں بلکہ جانوروں، پرندوں اور کیڑوں تک میں پایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کوؤں کا ایکا تو ایک کہاوت بن گیا ہے۔ اکثر چھوٹی چھوٹی چڑیاں بھی اکٹھا ہو کر بڑے پرندوں کو مار بھگاتی ہیں۔ اور چیونٹے، چیونٹیاں جب مل جھتے ہیں تو بڑے بڑے جانور گھبرا جاتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب نے چیونٹیوں کا ایک بھرا ہوا تھیلا لٹوں پر جھٹک دیا۔ تو بے چارے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے۔ ایک دفعہ تو چیونٹیوں نے بھڑوں کا ایک چھتہ مار گرایا۔"

خیر۔ ایک مشترکہ دشمن کے خلاف تو سبھی مل جل کر مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں لیکن جانوروں میں ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ کھانے پینے کے معاملے میں مل جل کر کام کرتے ہیں مثلاً ایک پیٹ بھری چیونٹی ایک بھوکی چیونٹی کے لئے کھایا پیا اگل دیتی ہے اور اس سے دوسری چیونٹی اپنا پیٹ بھر لیتی ہے۔ اسے سن کر گھن تو ضرور آتی ہے مگر ہے کیسی قربانی کی بات۔ بلکہ بعض تو یہ کہتے ہیں کہ چیونٹی کی خوراک کی نالی میں دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک میں تو اپنے لئے کھانا رکھتی ہے اور دوسرے میں اپنے ساتھیوں کے لئے کھانا محفوظ رکھتی ہے۔ بھلا جب جانور اور کیڑے پتنگے اپنے ساتھیوں کا اتنا خیال رکھتے ہیں، تو انسان کو ایک دوسرے کے لئے کیا کچھ کرنا چاہیئے۔

(باقی آئندہ)

آگرے کی سیر

تعلیمی مرکز میں ایک رات

محمد عثمان ہاشمی، ابتدائی ششم۔ تعلیمی مرکز جامعہ

۲۸ مارچ کی رات سے ہماری سیر کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

آہا! تعلیمی مرکز کی یہ رات کتنی پیاری، کتنی سہانی معلوم ہو رہی ہے۔ ہال روشنی سے جگمگا رہا ہے۔ تقریباً سب لڑکے اپنے سفر کے سامان کے ساتھ ہال میں جمع ہیں۔ محترم جناب اکرام خاں صاحب لڑکوں کے حلقے میں بیٹھے کچھ فرما رہے ہیں۔ میں نے جوں ہی ہال میں قدم رکھا۔ لڑکے فوراً چلا اٹھے "اب ہم سب ساتھی آچکے ہیں"۔ میں نے اپنا بستر ایک طرف رکھا اور ماسٹر صاحب کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ میں اپنے ساتھ اپنا بنایا ہوا ٹیلیفون لایا ہوں۔ ماسٹر صاحب اور میں نے ٹیلیفون پر باتیں کرنا شروع کیں۔ اس وقت تقریباً ۱۰ بجے ہیں۔ نویں تاریخ کا چاند ہماری اس دلکش اور پیاری رات کو دیکھنے کے لئے یا یوں کہیے کہ ہماری خوشی میں شامل ہونے، ہماری سیر سے لطف اٹھانے یا ہمارے سفر کو دلچسپ بنانے کے لئے اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے اور خاص ہمارے ہال کی طرف پیچھے اترنے کی تاک لگا رہا ہے اسے دیکھ کر لڑکوں کے دلوں میں اور بھی امنگ اور ولولہ پیدا ہو رہا ہے۔

چاند صرف شاعر ہی کے دل کو نہیں بھاتا بلکہ اگر اس سے لطف اٹھایا جائے تو ہر کسی کا دل شاعر کا دل بن سکتا ہے۔ یہی حالت ہماری بھی ہے میں بھی سب ساتھیوں کے ساتھ انہی خیالات میں محو ہوں، کہ جناب سید احمد علی صاحب اوپر سے فرماتے ہیں "اب سو جاؤ معلوم نہیں ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں۔ جلد سو جاؤ ورنہ صبح اٹھنے میں بہت دقت ہوگی"۔ یہ فرما کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کچھ دیر تک تو ہم خاموش رہے جب دیکھا اب لیٹ گئے ہوں گے تو پھر وہی شور و غل مچانے لگے۔ کچھ لڑکے کیرم بورڈ کھیلنے میں مشغول ہو گئے۔ کچھ ڈرافٹ کھیلنے لگے۔ غرض ہر لڑکا کسی نہ کسی کھیل میں مشغول ہو گیا کچھ لڑکے کہانیاں کہہ رہے ہیں اور ادھر ادھر کی باتیں کر رہے ہیں۔ جب کافی وقت گذر گیا، تو

اکرام صاحب نے کہا کہ "سب لڑکے اپنا اپنا بسترہ کرلیں، اور سو جائیں۔ سب لڑکوں نے اپنے اپنے بستر کرلیے۔ لیکن قصے کہانیوں اور باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

یہ رات ہمارے لیے اتنی دلچسپ رات ہے کہ شاید ایسی رات پھر نہ آئے۔ ہم نیند پر اتنا قابو پا چکے ہیں کہ نہ خود سوتے ہیں اور نہ دوسروں کو سونے دیتے ہیں۔ ہمارے کچھ چھوٹے ساتھی نیند کی آغوش میں کھیل رہے ہیں۔ اشرف تمیز علی صاحب اپنے بستر سے اٹھے اور کھانستے ہوئے یہ صدا لگائی "بھائیو جاگتے رہنا" اور آگے بڑھے۔ آتے ہیں... جناب اکرام صاحب نے دریافت کیا۔ "کون ہے بھئی" کہا "جناب چوکیدار ہوں، جاگتے رہنا"

اس وقت ڈیڑھ بج چکا ہے۔ کچھ لڑکوں پر نیند کا غلبہ ہے۔ کچھ ایسے ہیں جنھیں نیند اپنی آغوش میں چھپا لینا چاہتی ہے۔ مگر ان کا ذوق شوق اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ نیند سے دور بھاگتے ہیں۔ اور سونے والے لڑکوں پر فقرے کستے ہیں۔ کانسٹبل کی سیٹیاں، بتیاں گل ہو جانے کے بعد اس سنسان ہال میں ایک وحشت طاری کر رہی ہیں۔ شاید ان سے ڈر ڈر کر سب لڑکے نیند کی آغوش میں چھپ جاتے ہیں اور پھر اتنے مدہوش ہو جاتے ہیں کہ کسی کو کسی کی خبر نہیں رہتی۔ جب گھنٹے نے تین بجائے تو نہ معلوم کس نے کسی کو جگا دیا۔ اس طرح جتنے اٹھتے گئے وہ جگانے والوں کی مدد کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم سب لڑکے رفتہ رفتہ جاگ اٹھے اور ایک جگہ جمع ہو گئے۔ نیند کے جھونکے اب بھی آ رہے تھے۔ لیکن ہم ہیں کہ اسے اپنے پاس تک نہیں پھٹکنے دیتے۔ کچھ لڑکے منہ ہاتھ دھونے جا رہے ہیں۔ کچھ بستر باندھ رہے ہیں۔ غرض ہر لڑکا کسی نہ کسی کام میں مشغول ہے۔

تھوڑی دیر میں سب بستر باندھ لیے اور سامان درست کرکے چلنے کو تیار ہو گئے ابھی نماز ہی پڑھ رہے تھے کہ لاری آگئی۔ نماز سے فارغ ہو کر تمام سامان لاری میں رکھا، اور لاری میں بیٹھ کر اسٹیشن کی راہ لی۔ اس وقت خوشی کے مارے ہمارا برا حال ہے۔ تاج کا پورا نقشہ ہماری نظروں کے سامنے ہے اور دلی تمنا اور خواہش ہے کہ جلدی سے گاڑی میں سوار ہوں اور آگرے پہنچیں +

جب تم منیجر کو خط لکھو تو اپنا خریداری نمبر ضرور لکھو، نہ لکھو گے تو تمھاری شکایت دور کرنے میں بہت دقت ہوگی، یہ بھی ممکن ہے کہ منیجر کو مجبور ہو کر تمھارا خط ردی کی ٹوکری میں ڈالنا پڑے۔



پرانے بہت پرانے زمانے کے لوگ کہا کرتے تھے کہ دنیا میں صرف چار چیزیں یا چار عنصر ہیں :- آگ ، پانی ، ہوا اور مٹی - انھی چار چیزوں یا چار عنصروں سے یہ دنیا بنی ہے مگر جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا گیا سائنس میں بھی ترقی ہوتی گئی اور سائنس داں برابر نئی نئی چیزوں یا نئے نئے عنصروں کا پتہ لگاتے رہے چنانچہ اس وقت تک ۹۲ عنصر معلوم ہو چکے ہیں -

ان معلوم کئے ہوئے عنصروں میں ایک "ریڈیم" بھی ہے - یہ دنیا کی سب سے قیمتی دھات ہے - علم کیمیا کو اس سے بہت ترقی پہنچی ہے اور غالباً آئندہ اس کی بدولت اور نئی نئی چیزیں معلوم ہوں گی -

اس قیمتی دھات کی معلوم کرنے والی ایک عورت تھی - گو وہ اب زندہ نہیں ہے مگر اس کا نام اور شہرت اب بھی اسی طرح زندہ ہے -

یہ خاتون پولینڈ کے دار السلطنت وارسا میں ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئی ، اس کے باپ کا نام اسکلوڈوسکی تھا چنانچہ اس لڑکی کا نام "میری اسکلوڈوسکی" پڑ گیا - اس کے باپ اسکول کے سائنس ماسٹر تھے میری بچپن ہی سے اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتی تھی اور بوتلیں وغیرہ دھوتی تھی - اس طرح چھوٹی سی عمر ہی میں اسے سائنس سے دلچسپی پیدا ہو گئی -

میڈم کیوری نے اپنی شروع کی زندگی میں اپنی قوم کی سیاسی خدمت کرنی چاہی ، مگر اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکی - زار روس پولینڈ والوں پر بڑی بیدردی سے حکومت کر رہا تھا - پولستان والے آزادی اور روس کی غلامی سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے یہ حالات دیکھ کر میری بھی ایک سیاسی جماعت میں شامل ہو گئی مگر جلد ہی اس کا پتہ حکومت کو چل گیا اور اس کو اپنے ملک سے نکلنا پڑا -

اپنے ملک سے جدا ہونے کے بعد اسے اپنی پڑھائی کا خیال آیا - اس نے کراکو دیہ پہلے کبھی پولستان

کا دار السلطنت تھا) یونیورسٹی میں اپنے داخلے کے لئے درخواست دی مگر منظور نہ ہوئی ناامید ہو کر وہ پیرس چلی گئی۔

پیرس میں کچھ دن اُس نے بہت پریشانی میں گذارے۔ وہ بڑے خستہ حال میں تھی۔ اس نے ایک نہایت چھوٹا سا مکان کرایے پر لیا اور روزی کی تلاش کرنے لگی .... بہت مشکلوں کے بعد اسے "ساربون یونیورسٹی" میں بوتلیں دھونے پر نوکر رکھ لیا گیا۔ بہت ذہین اور سمجھدار تو تھی ہی وہاں کے پروفیسروں کو جب اس کی ذہانت اور ہوشیاری کی حالت معلوم ہوئی تو اُنھوں نے اُسے آئندہ تعلیم دینے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے باپ سے بھی اجازت منگالی۔ میری نے جب بی، ایس، سی (B.S.C) کی ڈگری حاصل کر لی تو ایک اسکالر کے ساتھ ریسرچ (تحقیق) کا کام شروع کر دیا۔ یہ اسکالر بہت سنجیدہ اور محنتی تھا۔ تھوڑے دنوں میں دونوں کے تعلقات نہایت خوش گوار ہو گئے .... اور آخر کار دونوں نے شادی کر لی۔ اس اسکالر کا نام پیئر کیوری تھا

پیئر کیوری کی شادی ہر لحاظ سے کامیاب رہی .... دونوں میں بے انتہا محبت اور اپنے کام سے بہت دلچسپی تھی۔ دونوں کو شہرت پسند نہ تھی، اور اپنے کام سے کام تھا۔ عام طور پر سائنس دانوں کا رجحان اُس وقت طبیعات کی طرف ہو چلا تھا۔ ۱۸۹۵ء میں رونجن نے (X RAYS) لاشعاعیں دریافت کی تھیں ان شعاعوں میں یہ خاصیت تھی کہ وہ ہر چیز کے پار ہو جاتی تھیں۔ یہی دیکھ کر ڈاکٹروں نے اپنے کام میں اُن سے مدد لی۔ ان دریافتوں سے محققوں میں تحقیق کا نیا شوق پیدا ہو گیا اور سائنس کی اکثر تجربہ گاہوں میں اس پر تحقیق شروع ہو گئی۔ پیئر کیوری نے اچانک ایک نئی چیز دریافت کر لی۔ فلورسنٹ اشیا، (یعنی ایسے مرکبات جو اپنے اندر روشنی لے لیں اور پھر ان سے یہی روشنی مختلف رنگوں میں تبدیل ہو کر نکلے .... سمندر کے پانی میں یہ صفت پائی جاتی ہے۔ رات کے وقت جہازوں سے سمندر کی موجیں ٹکراتی ہیں تو یہ روشنی نکلنے لگتی ہے .... اس کے علاوہ تم نے دیکھا ہوگا اکثر گھڑیوں میں چمکنے والا مسالہ لگایا جاتا ہے۔ اس میں بھی خاصیت ہوتی ہے) اور وہ اُن کی خاصیتوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اِنھی خاصیتوں میں یورنیم (دھات) کا نمک بھی شامل تھا جس سے سبز رنگ کی شعاعیں نکلتی تھیں۔ جب وہ یہ تحقیق کر رہا تھا تو اسے معلوم ہوا کہ اس میں سے ایک شعاع اور بھی نکلتی ہے۔ جو نہ صرف لاشعاعوں (X RAYS) کی طرح ہر چیز کے پار ہی ہو جاتی ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ فوٹو (کیمرہ) کی پلیٹ پر بھی اثر کرتی ہے۔

میڈم کیوری کو اس سے دلچسپی ہوگئی اور
ایک دن اس نے "پچ دھات" (جس سے یہ دھات
نکالی جاتی ہے) پر تجربے کئے اور اس کی حیرت
کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ پچ بلنڈ میں
تابکاری کی یورنیم سے زیادہ طاقت ہے۔ اب اس
کے دل میں سوال پیدا ہوا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔
یہ بڑا زبردست اور ٹیڑھا سوال تھا۔ اُس نے
متعدد تجربے کئے اور آخر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ
کوئی اجنبی چیز پچ بلنڈ میں موجود ہے۔

پیئر کیوری کسی دوسری تحقیق میں مصروف
تھے۔ مگر یہ دیکھ کر اپنی بیوی کی مدد کے لئے تیار
ہوگئے۔ اور اس کا ہاتھ بٹانے لگے۔ زیادہ تحقیق
کرنے پر پتہ چلا کہ پچ بلنڈ میں ریڈیم کی مقدار بہت
کم ہے۔ ...... یہ دونوں بہت غریب تھے
اُن کے پاس اتنا روپیہ کہاں تھا جو بہت سا
پچ بلنڈ خریدتے ...... مگر حکومت نے اس
کی مدد کی اور بہت سا پچ بلنڈ میڈم کیوری کو دیا
کہ ریڈیم الگ کرنے کی کوشش کرے ......
اُنھوں نے کام کرنا شروع کر دیا اور بڑی محنت
صبر اور استقلال سے اُسے جاری رکھا۔ انھوں نے
ایک الگ تجربہ خانہ بنایا ...... جیسے جیسے کام
ترقی کرتا گیا بے کار اجزاء الگ ہوتے گئے اور
کار آمد حصے کی مقدار کم ہوتی گئی ..... بار بار چھاننا
قلمیں جمانا۔ اور پھر مختلف عناصر کی پلیٹوں کو علیحدہ
رکھنا ...... بہت طولانی اور تکلیف دہ کام
تھا اور اس میں صبر اور استقلال کی ضرورت تھی۔
مگر انھوں نے صبر، استقلال اور ہمت کو کبھی ہاتھ سے
نہ جانے دیا اور آخر انھیں ایک بڑا طاقت ور تابکار
عُنصر معلوم ہوا جس کا نام میڈم کیوری نے اپنے
وطن کے نام پر "پولونیم" رکھا۔ یہ عنصر ۱۶ جولائی
۱۸۹۸ء کو معلوم ہوا ...... مگر ...... ابھی
میڈم کیوری اپنے اصلی مقصد میں کامیاب نہ
ہوئی تھی ...... وہ برابر تجربے کرتی رہی،
یہاں تک کہ ۱۹۰۲ء میں ۲۶ دسمبر کو خالص "ریڈیم"
جو "پولونیم" سے بھی طاقت ور تھا معلوم کیا گیا۔ یہ
ریڈیم اس نے معلوم تو کر لیا تھا مگر ابھی اسے علیحدہ
نہ کر سکی تھی ..... چنانچہ وہ اس میں مشغول رہی۔

۱۹۰۳ء میں میڈم کیوری کو پیرس یونیورسٹی
نے ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری سے سرفراز کیا۔
۱۹۰۶ء یعنی اس کے ایک سال بعد اس کا شوہر
پیئر کیوری موٹر کے نیچے آکر مر گیا ..... ظاہر ہے
کہ اس کی بیوی کو اس کی موت کا کتنا صدمہ ہوا
ہوگا۔ مگر وہ کچھ عرصے بعد پھر اپنے کام میں
(تحقیق کے کام میں) مصروف ہوگئی اور آخر کار وہ
ریڈیم کو علیحدہ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ ۱۹۱۱ء
میں اسے نوبل پرائز ملا۔

ریڈیم میں شعاعوں کے پھیلانے کی قوت یورینیم سے بیس لاکھ گنا زیادہ ہے۔ ہم یہاں اس کی چند خاصیتوں کا ذکر کرتے ہیں :-

ریڈیم ایک نہایت خطرناک دھات ہے۔ اسے شیشے کی چیز میں رکھا جائے اور اس کے قریب کوئی چیز جائے تو اس پر اس کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ اس کی زد میں آنے والے جانوروں کے بال مل جاتے ہیں آنکھوں کی روشنی ضائع ہو جاتی ہے۔ اگر ان پر زیادہ دیر تک اثر باقی رہے تو مر بھی جاتے ہیں۔ کئی سائنس والوں نے جب اُسے ہاتھ لگایا تو ان کے ہاتھوں میں بڑے زخم ہو گئے ...... ایک مرتبہ پیئر کیوری اپنی جیب میں ریڈیم برومائڈ رکھ کرے جا رہے تھے چند گھنٹوں میں جیب جل کر راکھ ہو گئی اور اُن کے سینے پر سخت زخم آئے۔ پیئر کیوری نے لکھا ہے کہ اپنے کمرے میں قدم رکھنا جہاں تولہ بھر ریڈیم ہو جان سے ہاتھ دھونا ہے۔

ریڈیم ایک طرف تو اس قدر خطرناک عنصر ہے مگر دوسری طرف مفید بھی اتنا ہی ہے۔ اس سے لاعلاج مریض تندرست ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً سرطان کے لئے تو یہ اکسیر ہے..... اسی طرح اندھوں کے علاج کے لئے بھی اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ریڈیم سے جسم کے اندرونی حصے صاف نظر آجاتے ہیں۔ اسی لئے ڈاکٹروں کو اس سے بہت مدد ملی ہے۔

جب پچھلی بڑی لڑائی شروع ہوئی تو فرانس کے بڑے ہسپتال کا انچارج اور تصویر لینے کے محکمے کا انتظام میڈم کیوری کے سپرد کیا گیا اور اس نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ریڈیم کے ذریعے تصویریں لینے کے انتظامات کئے اور اس طرح ملک کی بڑی خدمت کی۔

میڈم کیوری کی گھریلو زندگی بہت سادہ تھی وہ شہرت سے گھبراتی اور دور بھاگتی تھی۔ غرور کا اس کے یہاں کام نہ تھا تاہم اپنے کارناموں کی بدولت اُس نے تمام دنیا میں عزت و شہرت حاصل کر لی۔ ایک مرتبہ جب اُس نے پیرس میں تقریر کی تو سننے والوں میں (۱) سر ولیم ریمزے (۲) فرانس کا پریسیڈنٹ (صدر) (۳) پرتگال کا بادشاہ (۴) لارڈ کیلون جیسے لوگ موجود تھے۔

۱۹۲۱ء میں جب اُس نے امریکہ کا سفر کیا تو امریکہ کی عورتوں نے ایک گرام ریڈیم خود پریسیڈنٹ ہارڈنگ کے ہاتھوں وائٹ ہاؤس میں اس کی خدمت میں پیش کیا۔ ۱۹۲۳ء میں پیرس میں ایک بڑا جشن ہوا یہ ریڈیم کے معلوم کرنے کی خوشی میں تھا۔ فرانسیسی حکومت نے چالیس ہزار فرانک سالانہ اس کے خاندان کے لئے منظور کیا۔

۴ جولائی ۱۹۳۴ء کو وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی تمام دنیا میں اس کے مرنے کا سوگ منایا گیا۔

رنگ بھرو

فرصت کا مشغلہ

چہرہ ، ہاتھ اور ٹانگیں - ہلکی چاکلیٹی -
نیکر ، موزہ - ہرے -
بال - چاکلیٹی -
ڈبے - لال ، ہرے اور پیلے -
پیام تعلیم - ہلکا نیلا -
قمیص - لال -



پیامِ برادری

پیاری بچیو اور بچو! خوش رہو اور تندرست۔ محترمہ آپا جان کے بارے میں پیامیوں کے خط برابر آ رہے ہیں بعض پیامیوں کا اصرار ہے کہ پیام تعلیم کا آپا جان نمبر شائع کیا جائے ہماری خود بھی یہی خواہش تھی مگر موجودہ حالات میں یہ بہت مشکل ہے ہم یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ہر پرچے میں آپا جان کے بارے میں کوئی نہ کوئی مضمون یا نظم ہو اس پرچے میں محترمی جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب کا ایک مضمون چھپ رہا ہے۔ یہ مضمون پیامیوں کے لئے نہیں لکھا گیا تھا اس لئے اس کی زبان اور انداز بیان ذرا مشکل ہے ہم اسے اس لئے شائع کر رہے ہیں کہ مرحومہ آپا جان کی شروع کی زندگی کا یعنی اُس وقت کا جب وہ جرمنی میں تھیں کچھ حال معلوم ہو جائے۔ اگر پیامی آپا جان پر کوئی مضمون یا نظم بھیجیں تو ہم بڑی خوشی سے شائع کریں گے۔ مگر نظم یا مضمون کا معیار پیام تعلیم کے معیار کے مطابق ہونا چاہیے

آج کل گرمی بہت زوروں پر ہے ہمارے بہت سے پیامی اپنے اپنے امتحان سے کامیابی کے ساتھ فرصت پا چکے ہوں گے اور چھٹیاں منا رہے ہوں گے چھٹیوں میں سیر و تفریح اور کھیل کود سے بہتر اور کیا مشغلہ ہو سکتا ہے۔ اگر وہ ان دلچسپیوں سے تھوڑا سا وقت بچا کر پیام تعلیم کی کچھ خدمت کر سکیں تو کیا اچھا ہو۔ پچھلے دنوں کاغذ نہ ملنے کے سبب سالنامہ دیر سے چھپا تھا بعض پیامیوں کو یہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ اور بہت سے پرچوں کی طرح کہیں یہ بھی بند نہ ہو جائے۔ یہ اندیشہ انھوں نے اپنے خطوں میں ظاہر کیا تھا اور لکھا تھا کہ پیام تعلیم آپ کا نہیں ہمارا پرچہ ہے اور اس کے خدا نہ خواستہ بند ہونے کا ہمیں جتنا غم ہوگا اس کا آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ یہ بات سچ مُچ ہمارے لئے بہت خوشی کی ہے کہ پیامی پیام تعلیم کو بالکل اپنی چیز سمجھتے ہیں۔ بس ایسے ہی پیامیوں سے ہمیں اُمید ہے کہ وہ اپنے اس پرچے کو اپنے دوسرے ساتھیوں اور ہمجولیوں تک پہنچانے یعنی اس کے خریدار بڑھانے کی کوشش کریں گے۔

شمالی افریقہ کی لڑائی آخر ختم ہو گئی۔ اس میں اتحادیوں کی فتح ہوئی۔ کامل فتح! ٹیونسیا کے میدان میں اتحادی فوجوں نے دو لاکھ سے زیادہ اٹلی اور جرمنی کے سپاہی گرفتار کئے۔ جرمن فوج کا سپہ سالار یا کمانڈر انچیف ہر آرنم بھی گرفتار ہو گیا اور اب یوں سمجھو کہ شمالی افریقہ کا علاقہ انگریزوں کے دشمنوں سے بالکل خالی ہو گیا۔ اس فتح کی تمام اتحادی ملکوں میں خوشی منائی گئی۔ خصوصاً ہندوستان میں انگریزی حکومت نے بہت اہتمام سے تمام ملک میں ٹیونسیا ڈے منایا۔ شاید اس لئے کہ اس کامیابی میں ہندوستان کی جو فوج تھی فوج کی کوششوں کو بھی بہت دخل تھا۔ جرمنی والے اس لڑائی کی اہمیت کو کم کرنا چاہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس میدان میں لڑائی ہمارا مقصد تھا ہی نہیں۔ ہم تو اتحادیوں کو وہاں پھنسائے رکھنا چاہتے تھے تاکہ اس عرصے میں ہم اپنے ہاں کی اہم جگہوں کو خوب مضبوط بنا لیں اور اتحادی یورپ کو لڑائی کا میدان

نہ بنانے پائیں۔ چنانچہ اب ہم نے خوب تیاری کر لی ہے اور اب افریقہ میں لڑائی جاری رکھنے کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

اس فتح کے فوراً بعد انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر چرچل امریکہ تشریف لے گئے۔ وہاں وہ... جمہوریہ امریکہ کے صدر مسٹر روزولٹ سے مشورے کر رہے ہیں۔ امریکنوں کی خواہش ہے کہ جرمنی سے پہلے جاپان سے نبٹا جائے۔ روس چاہتا ہے پہلے مغربی یورپ کو لڑائی کا میدان بنایا جائے۔ بہت سے انگریز مدبروں کی بھی یہی رائے ہے کہ اصل دشمن ہٹلر ہے اسے نیچا دکھا دیا جائے تو جاپانیوں کو شکست دینا آسان ہوگا۔ دیکھئے چرچل اور روزویلٹ اب کیا نئے منصوبے بناتے ہیں اور لڑائی کا زور کدھر بڑھتا ہے۔

جاپان کا رُخ اب آسٹریلیا کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ اس طرف اس کی ڈھائی لاکھ فوج حملے کے لئے تیار ہے۔ ہوائی حملے شروع ہو گئے ہیں اُدھر جاپانی فوجوں نے آزاد چینی حکومت کے دارالسلطنت چنگنگ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا ہے تیسری طرف امریکن فوجیں اُن جزیروں پر جاپانیوں سے لڑ رہی ہیں اور کوئی عجب نہیں جو تھوڑے ہی دنوں میں جاپانیوں کو ان جزیروں سے نکال دیں۔

آج کل روس کے میدان میں کچھ زیادہ سرگرمی دکھائی نہیں دیتی۔ سُرخ فوجیں اور جرمن فوجیں ایک بڑی لڑائی کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ یہ لڑائی بہت زبردست ہو گی۔ روس میں ایک انجمن تھی جس کا کام یہ تھا کہ تمام دُنیا میں اشتراکیت پھیلانے کی کوشش کرے یعنی یہ انجمن دنیا بھر میں اس قسم کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرے جیسی روس میں ہے۔ انگلستان میں اور دوسرے ملکوں میں اس انجمن کی شاخیں تھیں یا ایسی انجمنیں تھیں جو روس کے اس مقصد سے ہمدردی رکھتی تھیں۔ کچھ دنوں سے جرمنی یہ پروپیگنڈا کر رہا تھا کہ روس جمہوری ملکوں سے دوستی کی آڑ میں وہاں کے لوگوں میں اپنے عقیدوں کو پھیلانے کی خوب کوشش کر رہا ہے۔ روس نے دشمن کے اس پروپیگنڈے کا توڑ اس طرح کیا کہ اس انجمن ہی کو ختم کر دیا۔ یورپ میں روس کے اس فیصلے کو بہت اطمینان کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔

ہندوستان میں چیزوں کی مہنگائی اور اس کے ساتھ لوگوں کی پریشانیاں برابر بڑھ رہی ہیں۔ انگریزی حکومت اس سلسلے میں بہت کچھ کوشش کر رہی ہے مگر اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ پچھلے دنوں سر سپرو اور دوسرے لیڈروں نے ایک بیان شائع کیا تھا جس میں گاندھی جی اور دوسرے کانگرسی لیڈروں کو رہا کرنے اور آزاد عدالت میں ان پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ مگر حکومت نے اس مطالبے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ مسلم لیگ کے قائد اعظم مسٹر جناح نے دہلی کے سالانہ جلاس میں فرمایا تھا کہ اگر گاندھی جی سچ مچ مسلمانوں سے سمجھوتہ کرنا چاہتے ہیں تو مجھے خط لکھیں حکومت اس خط کو روکنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ گاندھی جی نے اس قسم کا خط لکھا مگر حکومت نے اسے روک لیا اور گاندھی جی اور مسٹر جناح کو اس کی اطلاع بھی دے دی۔ یہ خبر اخباروں میں چھپی۔ اکثر اخباروں نے حکومت کے اس رویے کی مذمت کی مسلم لیگ کے سرکاری اخبار ڈان اور چند مسلم لیگی لیڈروں نے بھی حکومت کے اس فعل کو اچھا نہیں بتایا۔ دوسرے تیسرے دن قائد اعظم کا بیان بھی نکلا اس میں انھوں نے کہا کہ گاندھی کے دل میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی ہے ورنہ وہ اپنی پچھلی کارروائیوں سے بیزاری ظاہر کرتے اور آئندہ کے لئے وعدہ کرتے علاوہ اس کے گاندھی جی مسلمانوں کو اور انگریزوں کو لڑانا چاہتے ہیں۔ قائد اعظم کے اس بیان کے بعد مسلم لیگ کے سرکاری اخبار نے قائد اعظم کی تائید میں اپنا ایڈیٹوریل لکھا۔ معلوم نہیں ان مسلم لیگی لیڈروں پر کیا بیتے گی جو قائد اعظم کے بیان سے پہلے بیان دے چکے ہیں اور حکومت کی مخالفت میں۔*

* دہلی کے اخبار ہندوستان ٹائمس نے لکھا ہے کہ حکومت گاندھی جی سے جس معافی نامے کا ایک سال سے مطالبہ کر رہی ہے۔ قائد اعظم چاہتے ہیں کہ وہ معافی نامہ بجائے حکومت کے گاندھی جی انھیں بھیجیں
(محمد حسین حسان)

معما نمبر ۴۲

انعام اول .... ے

انعام دوم .... للعہ

(انعام میں کتابیں بھیجی جائیں گی)

مشقی کوپن

■	■	۵ ن	۴ ا	۳ ج	۲ ا	پ	۱ آ
■	۷ پ	ا	ج		۶	■	
ع		د	۹	■	ر		۸ ا
■	ق	ا		۱۱ ز	۱۰	■	■
۱۴ ن	ے	۱۳	■		ل		۱۲ ج
	۱۸	■	۱۷	۱۶ ن	■	■	و
ن	■		۲۲ د	■	۲۱	۲۰	۱۹ ا
	۲۴ گ	■	ی	گ	د	ن	۲۳

دائیں سے بائیں

۱۔ انھوں نے جامعہ کو اپنایا تھا اب جامعہ نے ہمیشہ کے لئے ان کو اپنا لیا۔

۶۔ دنیا میں سب سے گرم مقام ..... میں جیکب آباد ہے۔

۸۔ حاکم نالائق.. ظالم، رعایا اُن کے ظلم سے تنگ۔ جب حالت یہ ہو تو رعایا اپنے حاکموں کا دل سے ساتھ نہیں دے سکتی۔

۹۔ رُخصت کرنا۔

۱۰۔ خدا کا ایک نام

۱۲۔ ایسے نوٹ اور روپیے وغیرہ بنانے والے کبھی نہ کبھی پکڑے ہی جاتے ہیں۔

۱۳۔ زیادہ جاگ کر یہ خراب کرنے سے کیا فائدہ

۱۶۔ جو بچے شروع ہی سے اردو لکھتے ہیں ان کا خط خراب ہو جاتا ہے۔

۱۸۔ علم .. وہ دولت ہے جو خرچ کرنے سے بڑھتی ہے۔

۱۹۔ ایک شاعر کا تخلص

۲۲۔ ۱۴ مئی کو کسی نے .. دہاڑے اللہ بخش سابق وزیر اعظم سندھ کو گولی سے مار دیا۔

۲۳۔ صحیح معنی وہی یہ قابل قدر ہے جس پر دوسرے بھی رشک کریں۔

۲۴۔ کہتے ہیں کہ اس کی عمر بہت بڑی ہوتی ہے۔

اوپر سے نیچے

۱۔ صاحب، مالک، بڑا بھائی۔

۲۔ اس مہینے کی ۲۳ کو دہلی میں مسٹر جناح کا جلوس نکلا تھا۔

۳۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ان کا وجود نہیں وہ غلطی پر ہیں۔

۴۔ مثل مشہور ہے کہ یہ وہ جو سر پر چڑھ کے بولے (بے ترتیب)

۵۔ نہ اس کی دوستی اچھی نہ اس کی دشمنی اچھی۔

۷۔ گھر کا کام کر کے نہ لانے پر طالب علم کو یہ بنانے کے بجائے صاف کہہ دینا چاہیے۔ (بے ترتیب)

۱۱۔ گھوڑے کی کاٹھی۔

۱۲۔ گناہ کرنے سے پہلے لوگ اس کا یہ سوچ لیتے ہیں۔

۱۴۔ داروغہ:۔ کیوں یہ دن دہاڑے چوری

حضور:۔ رات میں مجھے ..... آجاتی ہے۔

۱۷۔ دُنیا عجیب بازار ہے کچھ جنس یاں کی سات ہے نیکی کا بدلا نیک ہے بد سے ... کی بات ہے (دنظیر)

۲۰۔ آج کل غریبوں کو پیٹ بھرنے کے لئے روٹی اور یہ ڈھانکنے کے لئے کپڑا تک میسر نہیں۔

۲۱۔ لفظ بمعنی ہوا۔

قواعد

۱- حل کے ساتھ ایک آنے کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

۲- ایک سے زیادہ حل بھی بھیجے جا سکتے ہیں، چار حلوں کی رعایتی فیس ۳ر ہے۔

۳- دونوں انعام تقسیم کردیئے جائیں گے۔ قرعہ اندازی نہ ہوگی۔

۴- تمام حل ۱۷ کو جوان کی تک دفتر پیام تعلیم دہلی پہنچ جانے چاہئیں۔

۵- ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

۶- پیام تعلیم میں چھپے ہوئے کوپن کے علاوہ پیامی اپنے کوپن بھی بنا کر بھیج سکتے ہیں۔

۷- کسی کوپن میں کوئی حرف کٹا یا مٹا ہوا ہوگا یا پنسل سے بھرا ہوا ہوگا تو مقابلے میں شامل نہ کیا جائے گا۔

۸- ایک لفافے میں ایک نام سے حل آنے چاہئیں۔

۹- چھوٹی ی اور بڑی ے کا فرق لازمی ہے۔ (ی - ے)

۱۰- سب ایڈیٹر پیام تعلیم، مکتبہ جامعہ، دہلی، قرول باغ۔

معمّا نمبر ۳۳ کا صحیح حل

ل	غ	■	ہ	ل	ا	س	ر
ن	ا	ب	ز	■	خ	د	ش
ج	ل	■		■	ن	ا	ک
■	ت	ا	ر	س	ا	■	■
	■	ق	■	■	ق	ر	ب
	■	ر	■	ج	■	و	ن
	■	ا	ن	ا	ت	س	ہ
■	ی	ر	ا	ہ	ن	■	ہ

صحیح حل فی کس عمہ اور ایک خاص انعام

۱- طلعت حسین۔ لینسڈاون

۲- محمد عزیز۔ الہ آباد

۳- شبیر احمد۔ مالیگاؤں

۴- غلام جیلانی۔ دہلی

۵- سراج السالکین ۔ "

۶- مکرم الدین "

ایک غلطی فی کس ۴ر

(اگلے معمے میں ۵ کوپن بھیج سکتے ہیں)

(۱) محمد شفیق صدیقی۔ موہان (۲) محمد حسن خاں۔ رام پور

(۳) محمد حنیف۔ حیدر آباد (۵) احمدی بیگم۔ علی گڑھ

(۴) سید سراج احمد حسنی " (۶) عبد اللطیف لعل۔ اندر کھیڑا

(۷) خواجہ جمیل اختر۔ میانوالی (۱۰) وحید احمد۔ ہری رام پور

(۸) اہلیہ محمد نظام الدین۔ سکندرا (۱۱) عبد الماجد عثمانی۔ بھوپال

(۹) صلاح الدین۔ اجمیر (۱۲) احسن حامد۔ جامعہ نگر

(۱۳) سید منصور حسن دہلی

(۱۴) سید اقبال رضا "

(۱۵) سید ذاکر علی "

(۱۶) محمد ہاشم خاں امرتسر

معمّا نمبر ۳۴ کوپن نمبر

نام ....

پتہ ....

محلہ ....



معمّا نمبر ۳۴ کوپن نمبر

معمّا نمبر ۳۴ کوپن نمبر

نام ....

پتہ ....

محلہ ....

معمّا نمبر ۳۴ کوپن نمبر



دوپامی مکاباز

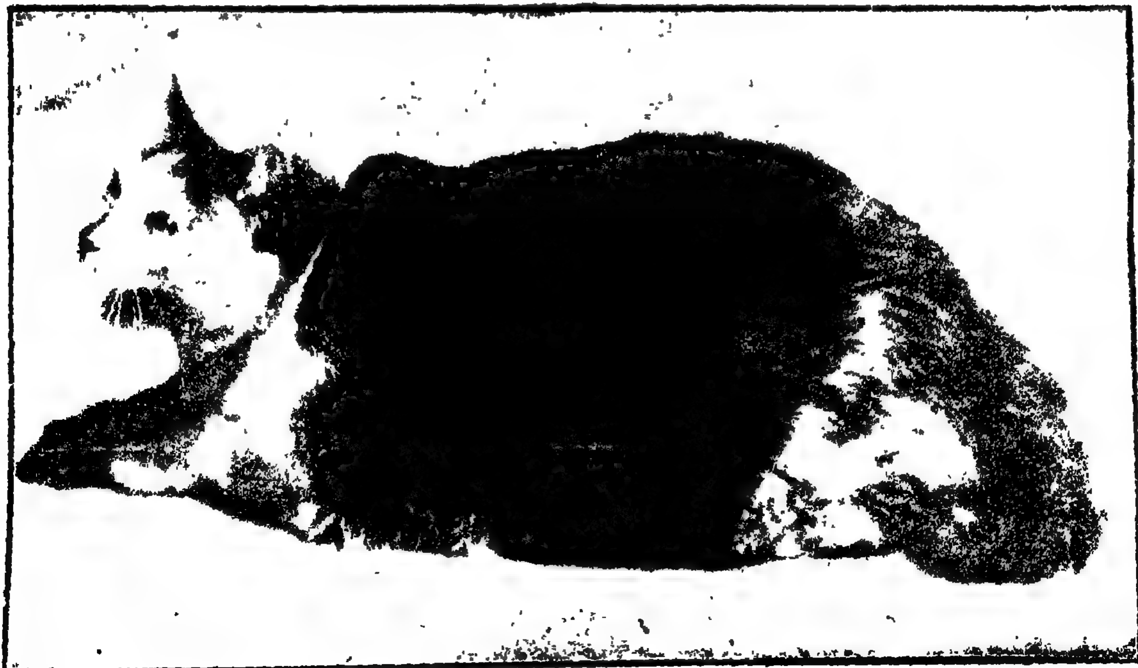
Regd. No.L.1961



آبا جان کے جنازے [illegible]



[illegible] جان کے جنازے کا دوسرا منظر



آبا جان کی بلی

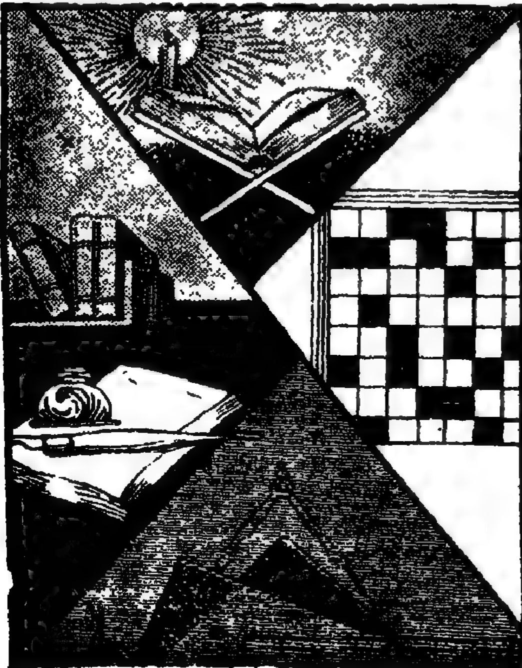
جون

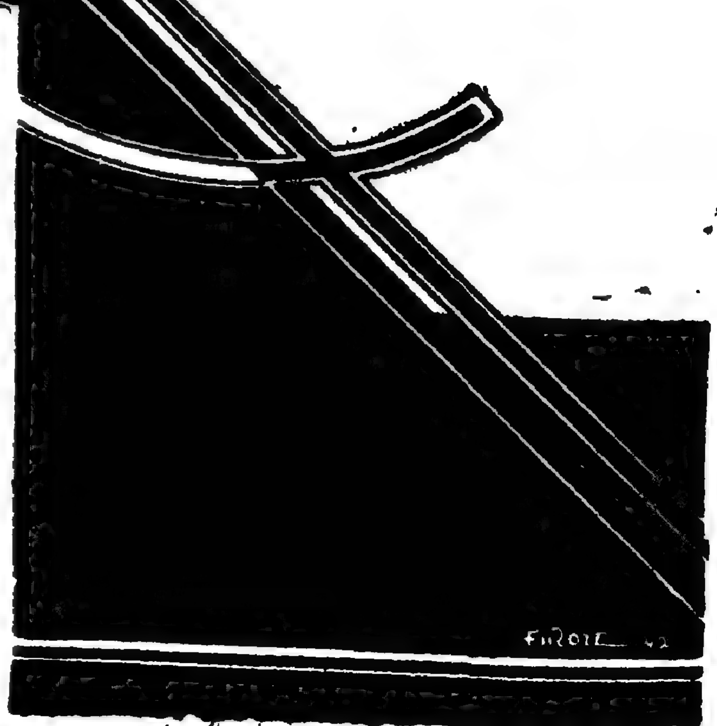
۱۹۴۲

پیام تعلیم











ڈاکٹر انصاری مرحوم (سابق امیر جامعہ) آج سے سات سال پہلے اسی مہینے
آپ کا انتقال ہوا تھا

پیام تعلیم

دہلی

قیمت سالانہ عا
فی پرچہ ۳

پیام تعلیم
دہلی، یوپی، سی پی، برار، میسور، قلات، بنگال، رامپور، حیدرآباد، سندھ، کشمیر، پنجاب، بہار اور سرحد کے محکمۂ تعلیم کی طرف سے سرکاری طور پر منظور کیا گیا ہے۔

جلد ۲۶ — نمبر ۶

فہرست مضامین جون سنہ ۴۳ء

۱	بچوں سے باتیں	ایڈیٹر	۱۶۲
۲	ہماری آپا جان	انتر فاروقی استاد جامعہ	۱۶۳
۳	ڈاکٹر لٹھماری	...	۱۶۵
۴	ایک ننھے بدھو میاں	سلیم احمد اودھی	۱۶۶
۵	ہماری زمین	محمد حسین حسان	۱۷۰
۶	اچھا لڑکا	محمد شفیع الدین نیر	۱۷۳
۷	سائنس والوں کی کہانی	سید نور الحسن ہاشمی	۱۷۴
۸	دہلی سے آگرہ	محمد نقی، محمد عثمان	۱۷۷
۹	بچوں کی دکان	محمد عبد الغفور ایم اے	۱۷۹
۱۰	بچوں کی نظمیں	...	۱۸۲
۱۱	موجدوں کی کہانی	سید نور الحسن ہاشمی	۱۸۳
۱۲	آؤ تصویریں بنائیں	جمال آرٹسٹ	۱۸۶
۱۳	بچوں کی کوششیں	...	۱۸۸
۱۴	رنگ بھرو	جمال آرٹسٹ	۱۹۰
۱۵	پیام برادری	ایڈیٹر	۱۹۱

پرنٹر پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی۔ محبوب المطابع پریس دہلی

ایڈیٹر محمد حسین حسان

JAMAL ...43

بچوں سے باتیں

ایڈیٹر

کاغذ نہ ملنے کی وجہ سے پیام تعلیم کی اشاعت میں کچھ بے ترتیبی اور بے قاعدگی پیدا ہو گئی تھی خوشی کی بات ہے اب ہم رفتہ رفتہ اسے وقت پر لانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

ابھی چند دن پہلے مئی کا پرچہ تمھیں ملا ہوگا، اب یہ جون کا شائع ہو رہا ہے۔ خدا نے چاہا تو جولائی کا پرچہ اپنے وقت پر شائع ہوگا۔

اس پرچے میں ڈرائنگ کے متعلق ہم ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ پیامی اس کے بارے میں ہمیں اپنی رائے بتائیں۔

بہت سے پیامیوں کی خواہش تھی کہ رنگ بھرنے کی تصویروں کا سلسلہ پھر سے شروع کیا جائے پچھلے پرچے سے ہم نے یہ بھی شروع کر دیا ہے۔ یہ تصویریں رنگ بھر کر ہمیں بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

پروفیسر محمد عبدالغفور صاحب کا دلچسپ مضمون اس پرچے میں ختم ہو جائے گا۔ اگلے پرچے میں ان کا ایک اور مضمون چھپے گا "پگ ڈنڈی کی کہانی"۔ یہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ اور پیامیوں کو پسند آئے گا۔

اگلے پرچے میں مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر کی ایک مزیدار کہانی اور ایک نظم بھی چھپے گی۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی دلچسپ مضمون شائع ہوں گے۔

ہماری زمین والا مضمون پیامیوں نے بہت پسند کیا اس مضمون کا سلسلہ دو تین پرچوں تک اور چلے گا۔

آپا جان کی یاد میں

آرٹسٹ جامعہ



یہ نظم جناب اختر صاحب فاروقی نے اپنی بچی عزیزہ جمال فاطمہ عرف ممّی سلمہا کے لئے لکھی، جو عزیزہ نے مس فلس بورن مرحومہ) آپا جان کے جلسۂ تعزیت میں پڑھ کر سُنائی۔

مری پیاری آپا، مری پیاری آپا

مجھے اچھی لڑکی بنا دینے والی | پڑھا دینے والی لکھا دینے والی
مجھے راہ سیدھی دکھا دینے والی | بُرائی سے مجھ کو بچا دینے والی

مری پیاری آپا، مری پیاری آپا

تمھی نے مجھے کام کرنا سکھایا | تُمھی نے بُرائی سے ڈرنا سکھایا
تُمھی نے مجھے دُکھ سے لڑنا سکھایا | مجھے اپنے بل پر اُبھرنا سکھایا







مری پیاری آپا، مری پیاری آپا

تمھاری وہ اُلفت ہے اب یاد آتی | تمھاری وہ شفقت ہے اب یاد آتی
تمھاری وہ محنت ہے اب یاد آتی | تمھاری نصیحت ہے اب یاد آتی

مری پیاری آپا، مری پیاری آپا

بتاؤ تو کیوں اب خفا ہوگئیں تم | خطا کیا ہوئی، کیوں جدا ہوگئیں تم
کہوں ہائے کیوں کر فنا ہوگئیں تم | سمجھتی ہوں ہم پر فدا ہوگئیں تم

مری پیاری آپا، مری پیاری آپا

جو آپا نہ تھی بات کچی تمھاری | جو آپا محبت تھی سچی تمھاری
کرو پیار آکر ہوں بچی تمھاری | میں ممتی ہوں شاگرد اچھی تمھاری

مری پیاری آپا، مری پیاری آپا



ڈاکٹر انصاری

ہمارے سابق امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری مرحوم کو اس دنیا سے رخصت ہوئے آج ساتواں سال ہے۔ آج سے سات سال پہلے اسی مہینے اُن کا انتقال ہوا تھا۔ اس موقع پر ہم اُن کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہمدرد جامعہ سے نقل کرتے ہیں اُن کی آخری آرام گاہ جامعہ نگر میں ہے۔ اس مزار کی تصویر اس پرچے میں شائع کی جاتی ہے۔ (ایڈیٹر)

ڈاکٹر انصاری ملک و قوم کی خدمت کے سلسلے میں ایک بار جیل میں تھے وہاں اور بھی ساتھی نظر بند تھے ایک دن وہ اپنے ایک ساتھی کے کمرے پر (جیل کی کوٹھری میں) گئے اور اُسے رنجیدہ اور پریشان دیکھ کر پوچھنے لگے "کہ کیا بات ہے"۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ گھر سے والدہ کا خط آیا ہے لکھا ہے کہ "تم تو قومی خدمت کرتے کرتے وہاں پہنچ گئے اور یہاں قرض کی وجہ سے مکان تک ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ اگر سولہ سو روپئے ادا نہ ہوئے تو تیرے بچوں کے لئے سر چھپانے کے لئے کوئی ٹھکانا نہ ہوگا، اور وہ گلی میں باہر نکال کھڑے کر دئے جائیں گے۔ تم اس کی کوئی تدبیر کر کے ہنس گے"۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "ارے بھائی مولانا یہ بھی کوئی فکر کی بات ہے جب گھر بار چھوڑ کر انسان اس کام میں لگ جاتا ہے تو پھر گھر کا خیال اور اُس کا فکر بالکل چھوڑ دینا چاہیے اور آپ کا بھروسہ تو خدا پر ہے۔ اس جیل میں تو دنیا و مافیہا سے بالکل بے تعلق رہنا چاہیے۔ آؤ کو قد اہل بیٹھ" مولانا نے جواب دیا "آپ کہ دل لگی سوجھی ہے اور میں فکر میں ڈوبا ہوا ہوں، کسی کام کو جی نہیں چاہتا"۔ ڈاکٹر صاحب نے انھیں پھر اللہ پر بھروسہ رکھنے اور اسی کے سپرد تمام کام کر دینے کی تلقین کی اور پھر فرمایا "یہاں بیٹھے ہوئے کیا کر سکتے ہو۔ وہاں جا کر سب درست کر لوگے یہاں اپنی زندگی ہلاک کرنے سے کیا فائدہ وغیرہ وغیرہ۔ غرض اسی طرح مختلف باتوں سے انھیں تسلی و تشفی دی اور بات آئی گئی ہوئی۔ دس بارہ روز کے بعد وہ مولانا صاحب ڈاکٹر صاحب مرحوم کے پاس آئے اور فرمانے لگے "آپ نے تو کمال کر دیا اور میرے بال بچوں کو اپنے احسان میں جکڑ دیا میں آپ کی محبت آپ کے اخلاص اور آپ کی اخوت اسلامی اور سچی ہمدردی کی دل سے قدر کرتا ہوں اور آپ کے بار احسان سے سر نہیں اُٹھا سکتا"۔ ڈاکٹر صاحب نے ٹالنا چاہا اور دوسری باتیں شروع کرنی چاہیں لیکن اُنھوں نے پھر اسی سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا "اماں کا خط آیا ہے جس میں لکھا ہے کہ ڈاکٹر انصاری صاحب کی کوٹھی دار السلام دریا گنج دہلی سے سولہ سو روپئے کا بیمہ آیا تھا جس میں تحریر تھا کہ ڈاکٹر انصاری صاحب کی ہدایت کے مطابق جو جیل سے اُنھوں نے بھیجی ہے مبلغ سولہ سو روپئے برائے ادائگی قرض رہن مکان ارسال کئے جاتے ہیں چنانچہ وہ رقم قرض میں ادا کر دی گئی ہے مطمئن رہیے"۔

ڈاکٹر صاحب آپ نے اس قدر فیاضی سے کام لیا اور مجھ ناچیز خادم پر اس قدر بڑا احسان کیا اس کا اجر سوائے خدا کے کون دے سکتا ہے۔



ایک تھے میاں بُدھوٗ

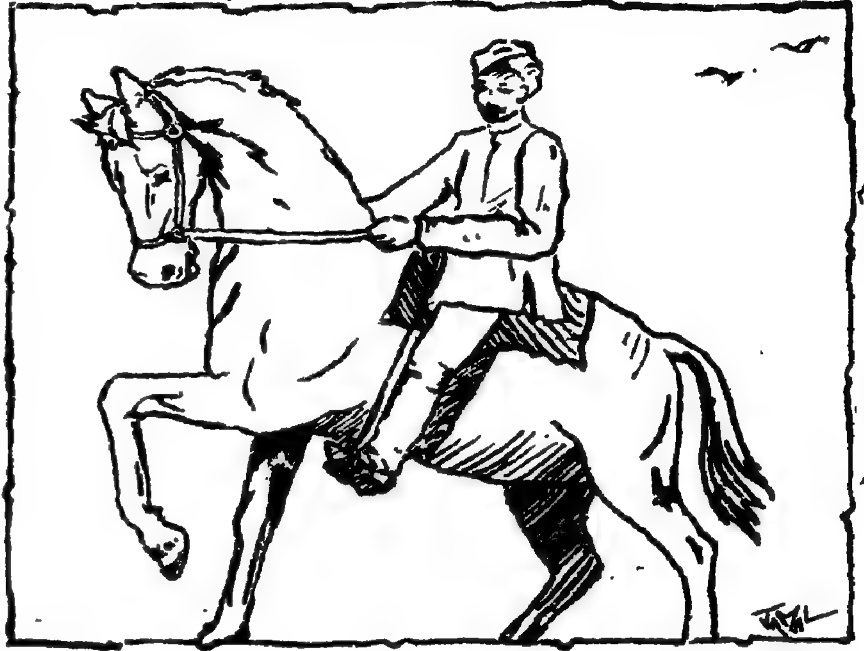
سلیم احمد لودھی - گلبرگہ

آؤ بچو تمھیں ایک کہانی سنائیں۔ ایک تھا امیر آدمی، بہت امیر۔ اس کے بہت سے نوکر بھی تھے ایک نوکر کا نام تھا میاں بُدھو۔ بچارا بڑا سیدھا سادھا۔ ایمان دار نوکر تھا۔ ۷ سال تک تو اُس نے بڑی ایمان داری سے مالک کا کام کیا مگر بھائی تم جانو تھا تو آدمی ہی نا۔ تھک گیا اور اپنے گھر واپس جانے کی ٹھانی۔ مالک سے اجازت لینے جو گیا تو مالک کہنے لگا تو بڑا ہی ایمان دار نوکر ہے۔ اس لئے میں تجھے یہ ایک بڑا سونے کا ٹکڑا انعام میں دیتا ہوں۔ بدھو بہت خوش ہوا۔ رکھ کے سر پہ سونا چل پڑا گھر کی طرف چلا چل چلا چل چلتا رہا آخر چلتے چلتے تھک گیا اور آرام لینے کے لئے ایک درخت کے سایے تلے بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک شخص اس طرف سے گھوڑا دوڑاتا ہوا نکلا۔

بدھو بے چارا تھکا ہوا تو تھا ہی کہنے لگا۔ ہائے سر پر اتنا بڑا بوجھ اُٹھاکے پیدل چلنے سے میں کتنا تھک گیا۔ ذرا اس گھوڑے والے کی طرف تو دیکھو کیا مزے سے گھوڑا دوڑائے چلا جارہا ہے۔ خدایا اگر تو مجھے اس بوجھ کی جگہ وہ گھوڑا دیتا تو کیا اچھا ہوتا۔ اتفاق سے گھوڑے سوار نے یہ سب باتیں سن لیں۔ وہ بولا " بھیا! مجھے تمھاری حالت پر بہت رحم آتا ہے۔ یہ عمر اور اتنا بڑا بوجھ۔ اگر تم چاہو تو میرا گھوڑا لے لو اور وہ سونے کا ٹکڑا مجھے دے دو۔" بدھو بہت خوش ہوا اور گھوڑے پر بیٹھ کر چل دیا۔ گھوڑے والا بھی خوش خوش سونا لے کر چلتا بنا۔

چلا چل چلا چل جب بدھو تھوڑی دور اور چلا تو اس کو خیال آیا کہ ذرا تیز چلنا چاہئے۔ اس نے لگائی جو ایڑ تو گھوڑا بدھو کو ایک طرف پھینک، ہوا ہو گیا۔ اتفاق سے دوسری طرف ایک شخص بوڑھی گائے ہانکے چلا آرہا تھا۔ اس نے جو گھوڑے کو بغیر سوار کے بھاگتے دیکھا تو جھٹ اُسے پکڑ لیا اور غلام محمد کے پاس لے آیا تم جانو گھوڑے پر سے گرا تھا بے چارے کے

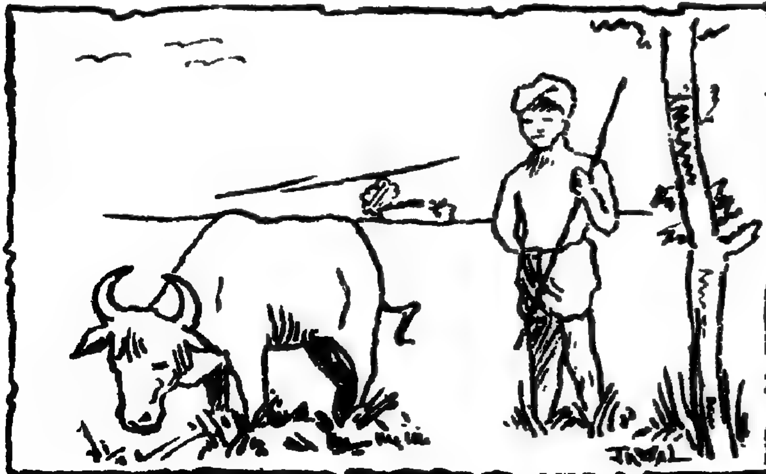
بہت چوٹ آئی تھی۔ پڑا کراہ رہا تھا۔ اس شخص نے اُٹھا کر بٹھایا، دلاسا دیا۔ جب ذرا ہوش آیا تو کہنے لگا۔ بھئی سچ ہے تم بڑے ہی خوش قسمت ہو۔ ہاں



بھئی اللہ کی دین ہے۔ دیکھو تو تمھارے پاس کیسی اچھی گائے ہے۔ دودھ دیتی ہوگی اس کا دہی بنتا ہوگا۔ چھاچ بنتا ہوگا۔ غرض کتنی چیزیں تیار ہوتی ہوں گی۔"

گائے والا سمجھ گیا کہ ہے کوئی عقل کا اندھا، گانٹھ کا پورا۔ جھٹ کہنے لگا" بھئی اگر تمھیں میری گائے ایسی ہی اچھی معلوم ہوتی ہے تو لے لو۔ میں تمھاری ہی خاطر اس گھوڑے کی مصیبتوں کو برداشت کرلوں گا۔" بس پھر کیا تھا اُٹھے اور جلدی سے گائے ہانکتے ہوئے چل دئے

چلا چل چلا چل بیچارا چلتے چلتے تھک گیا تم جانو گرمی کا موسم پیاس لگ آئی۔ بدھو نے سوچا۔ اب پانی کہاں سے پئیں۔ گائے کا دودھ ہی دوھ کر پی لیں۔ اس نے اپنی پگڑی سے چاروں پاؤں باندھ دئے۔ اب دودھ دُہنے کے لئے کوئی برتن پاس نہ تھا۔ اُنھوں نے کیا کیا؟ جھٹ سر سے ٹوپی اُتاری اور اسے نیچے پکڑ کر دودھ دُہنے



لگے۔ گائے تھی بڈھی۔ دودھ تو کیا دیتی۔ پاؤں چھڑا کر میاں بدھو کے ایسے رسید کئے کہ

بچارا لڑھکتا، بڑھکتا دور جا پڑا۔ اتفاق دیکھئے کہ اُدھر سے ایک شخص بکریوں کا ریوڑ ہانکے چلا آرہا تھا اس نے جو اس بچارے کو اس بری حالت میں پڑے ہوئے دیکھا تو مُنھ میں پانی ڈالا۔ اُٹھا کر بٹھایا۔ جب ذرا ہوش آیا تو کراہتے ہوئے کہنے لگا۔

"ارے بھائی ذرا ...... ہائے ....

ذرا دیکھو تو ہائے ..... میر میر .... میری

ہائے گ .... لے کو ہائے ....

کیا..... کیا ہو ..... ہو ..... ہوا، ہائے"

ریوڑ والا کہنے لگا کہ دیوانے تو نہیں ہو۔ اتنی بوڑھی گائے بھی کہیں دودھ دیتی ہے۔

بدھو میاں مایوسی سے کہنے لگے "ہائے .... ر..... ی قسمت، اچانک اُن کی نظر ایک خوب صورت بکری پر پڑی اور بے اختیار چلا اُٹھے۔ ارے رے رے کیسی اچھی بکری ہے (بکری کو پیار کرتے ہوئے) بھئی بڑا ہی احسان ہو اگر یہ بکری دے دو اور یہ گائے لے لو۔"

بکری والے نے کہا "بھئی اچھا اگر تمھاری یہی مرضی ہے تو لے لو، ہمیں خدا اور دے گا۔"

میاں بدھو خوش خوش بکری لے کر چل دیئے تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ اُنھوں نے دیکھا ایک آدمی بطخ لئے چلا آرہا ہے۔ میاں بدھو سے چپ نہ رہا گیا اس کو ٹھیرا کر بڑی شان سے تمام حالات شروع سے آخر تک سُنا دیئے۔ وہ سمجھ گیا کہ حضرت بے وقوفوں کے بادشاہ ہیں۔ جھٹ کہنے لگا "رام، رام، رام..... یہ بکری تو پاس کے گاؤں کے زمیندار کی ہے۔ کل رات سے گم ہے۔ گاؤں بھر میں اس کی ڈھونڈ پڑی ہے۔ کہیں تمھیں کسی نے بکری لے جاتے دیکھ لیا تو اتنا مارے گا اتنا مارے گا کہ نانی یاد آجائے گی۔

بے چارا بدھو ڈر سے کانپنے لگا اور کہنے لگا:۔ "ب .... بھا! .... ی .....

خدا ..... ک .... کے ..... لیے

کو ..... ی ..... تر ..... بتا .....

..... ؤ"

وہ کہنے لگا "ایک ترکیب ہے وہ یہ کہ تم یہ بطخ لے لو اور بکری مجھے دے دو۔"

بدھو نے جلدی سے بکری کی ڈور چھوڑ کر فوراً اس سے بطخ چھین لی اور اپنی راہ لی۔ راستے میں اُس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ چکّی کے پاٹ بنا رہے ہیں آپ کھڑے ہو کر بڑے تعجب سے دیکھنے لگے کہ یہ کیا کر رہے ہیں، تم جانو دیہاتی تو ہوشیار ہوتے ہیں اُنھوں نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ میاں بڑے ہی سیدھے سادھے ہیں۔ ایک اُٹھ کر اُن کے پاس آیا اور

کہنے لگا "جناب یہ پتھر بڑے کراماتی ہیں۔ جس کے پاس یہ پتھر ہوتا ہے وہ ہمیشہ سُکھی رہتا ہے۔ بڑے بڑے امیر لوگ اس کو خریدتے ہیں"۔

راستے میں پھر آپ کو پیاس لگی۔ اتفاق سے ایک تالاب نظر آیا۔ آپ پتھر کو کنارے رکھ کر پانی پینے کو جو جھکے تو پتھر بھی ہاتھ لگ کر پانی میں گر گیا۔



اب لگے غلام محمد دیہاتی کی منت سماجت کرنے کہ بھئی یہ بطخ لے لو اور پتھر دے دو۔ پہلے تو دیہاتی نہ مانا کہ اتنے سستے داموں نہ دوں گا۔ لیکن آخر مان گیا اور بطخ لے کر ایک بھدا سا پہاڑی پتھر اُٹھا کر دے دیا۔ اب غلام محمد خوش خوش گھر چلے

اور نظروں سے غائب ہو گیا۔ اب آپ خوش خوش گھر پہنچے کہ ہر قسم کی فکروں سے نجات مل گئی۔ جب آپ گھر پہنچے تو یہ شعر پڑھنے لگے :-

جان بچی لاکھوں پائے
خیر سے بدھو گھر کو آئے



میں بازار سے واپس آیا تو واجد میاں میرا انتظار کر رہے تھے۔ میرے پیچھے وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ میدان میں کھیلنے چلے گئے تھے مگر جی نہ لگا اور پیچھا چھڑا کے بھاگ آئے۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے "واہ پیارے بھائی آپ نے تو بہت دیر لگا دی ہم جانے کب سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ابا بھی آپ کی راہ دیکھ رہے تھے۔ کھانا تیار ہے۔ اپیا دال بگھار رہی ہیں۔ پیاری آپا چٹنی پیس رہی ہیں۔ روٹی پک چکی ہے۔ آپ کے لئے تھوڑا سا آٹا رہنے دیا ہے۔ گرم روٹی آپ کو اچھی لگتی ہے۔ دستر خوان لگوادوں پیارے بھائی؟" میں نے کہا "ہاں ہاں مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔"

واجد میاں آج بڑی دھن میں لگے ہوئے تھے جلدی جلدی دستر خوان بچھایا خود ہی کھانا لگایا، ابا جی کو بلا کے لائے، سب کھانا کھا چکے تو کہنے لگے "چائے بنوادوں پیارے بھائی؟" میں نے مسکرا کر کہا "نہیں میاں کھانے کے فوراً بعد کوئی تیز گرم یا زیادہ ٹھنڈی چیز نہیں پینی چاہیے۔ معدے کو کم زور کرتی ہے۔" کہنے لگے "اچھا تو پان تو کھا لیجئے۔" ماموں صاحب مسکرا کر بولے "بھئی آج تمھاری خاطر ہو رہی ہے" فہمیدہ نے کہا "ایران، توران کی جو سننے میں آ رہی ہیں۔" واجد میاں بولے "پیارے بھائی آپ اپیا کی باتوں پر نہ جائیے۔ یہ تو یوں ہی کہتی رہتی ہیں ہاں پیارے بھائی اس وقت آپ کس چیز کا ذکر کر رہے تھے۔ ہاں پہاڑوں کی بات تھی تو کیا پتھر کا جو کوئلہ ہوتا ہے وہ بھی پہاڑوں میں سے نکلتا ہے؟" میں نے کہا "نہیں یہ تو کانوں میں سے نکلتا ہے۔ یہ زمین کے اندر مٹی کے نیچے دبا ہوتا ہے لوگ اسے کھود کھود کر نکالتے ہیں۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں جنگل کے جنگل زمین میں دھنس گئے۔ جانے کس وجہ سے۔ پھر ان پر زمین کا دباؤ پڑا اتنا سخت دباؤ کہ یہ جل کر کوئلہ ہو گئے۔ یہ کوئلہ اسی دباؤ کی وجہ

سے پتھر کی طرح سخت ہو گیا جہاں سے یہ کوئلہ نکلتا ہے اسے کان کہتے ہیں۔ دیکھو کیسے کام کی چیز ہے۔ ایک یہی کیا ہماری زمین میں تو نہ جانے کتنے خزانے بھرے پڑے ہیں۔ لوہا، تانبا، سیسہ، ٹین، سونا چاندی ابرک اور جانے کن کن دھاتوں کی کانیں ہماری زمین کے سینے میں محفوظ ہیں۔" واجد میاں بولے "اُفوہ یہ سب چیزیں زمین سے نکلتی ہیں اور تیل بھی تو زمین سے نکلتا ہے پیارے بھائی"۔ عائشہ اماں صاحب کو پانوں کی ڈبیہ دینے آئی تھیں۔ ہنس کر بولیں "کیوں بھیا سرسوں کا یا تل کا، کاہے کا؟" واجد میاں جھلّا کے بولے "مٹّی کا تیل نکلتا ہے یا سرسوں کا، بڑی بے چاری قابل بنتی ہیں"۔ میں نے کہا "ہاں بھئی مٹّی کا تیل بھی زمین ہی سے نکلتا ہے۔ اس کے بھی چشمے ہوتے ہیں مگر بڑی بڑی مشینوں کے ذریعے نکلتا ہے۔ یہ بھی بہت کام کی چیز ہے پٹرول اسی سے بنتا ہے۔ موٹریں، ہوائی جہاز وغیرہ، اسی پٹرول کی بدولت چلتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان گنت کام کی چیزیں اس تیل سے تیار ہوتی ہیں"۔ واجد میاں نے پوچھا "اور پیارے بھائی زمین میں سے گرم پانی کے فوارے بھی تو چھوٹتے ہیں۔ ایک دن ہمارے ماسٹر صاحب بتا رہے تھے۔ وہ تو کہہ رہے تھے ان کا پانی بہت ہی گرم ہوتا ہے"۔ میں نے کہا "ہاں ایسے چشمے وہاں ہوتے ہیں جہاں پہلے آگ

پھینکنے والے یا آتش فشاں پہاڑ تھے۔ بات یہ ہے کہ برسات کا پانی زمین میں جذب ہوتا رہتا ہے۔ یہ پانی زمین کے اندر گرم مادّے یا لاوے کی وجہ سے بھاپ بننے لگتا ہے۔ بھاپ زمین کے اندر سے نکلنا چاہتی ہے اور جہاں اسے موقع ملتا ہے، فوراً نکل آتی ہے۔ یہ بھاپ اپنے ساتھ پانی بھی اوپر کھینچ لاتی ہے۔ ایسے چشمے امریکہ، آئس لینڈ اور نیوزی لینڈ میں بہت ہیں۔ ان میں سے بعض بعض تو ستر ستر فٹ چوڑے ہیں اور ان میں سے ابلتے ہوئے پانی اور بھاپ کا ایک ستون اٹھتا ہے۔ دو سو فٹ سے بھی اونچا۔ کہیں کہیں تو ان چشموں کا پانی اتنا گرم ہوتا ہے کہ اس میں ہر چیز آسانی سے گل جاتی ہے اور لوگ اسے کھانا پکانے کے کام میں لاتے ہیں۔ گویا ان علاقوں میں پانی سے آگ کا کام لیا جاتا ہے۔ واجد میاں بولے "تو پیارے بھائی اس زمین میں اتنی قیمتی قیمتی چیزیں ہیں مگر ہمیں تو اس میں مٹّی ہی مٹّی دکھائی دیتی ہے"۔ میں نے کہا "یہ دھاتیں وغیرہ تو زمین کے بہت نیچے دبی ہوئی ہیں۔ سائنس جاننے والے خاص خاص علامتیں دیکھ کر ان کا پتہ لگاتے ہیں"۔ واجد میاں نے کہا "تو آخر یہ زمین ہے کتنی گہری؟" ماموں صاحب نے ایک خاص انداز میں جواب دیا "یہی کوئی چار پانچ سو گز سمجھ لو"۔ واجد میاں بہت حیران

ہوئے "چار پانچ سو گز! اتنی گہری!!" میں نے کہا "زمین میں کئی تہیں ہیں ایک تو اوپر کا پرت ہے اس کا دَل پچاس میل بتاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد کی تہہ ہے یہ کوئی سترہ سو میل موٹی ہے۔ ایک آخری یعنی بیچوں بیچ کی تہہ ہے یہ دو ہزار دو سو میل موٹی ہے۔" ماموں صاحب کچھ دیر تو حیرانی کے عالم میں میری طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتے رہے۔ پھر بولے" تو آخر زمین کے اندر کا حال کیسے معلوم ہوا؟" اس وقت انھیں بھی میری بات پر کچھ یقین سا نہیں آرہا تھا۔ میں نے کہا" زمین کے اندر کے حصے پر جب زیادہ دباؤ پڑتا ہے تو وہ تڑق جاتی ہے جس جگہ یہ تڑقن ہوتی ہے اس جگہ سے زمین کے اندر ہی اندر ہر طرف لہریں دوڑ جاتی ہیں۔ جس طرح تالاب میں پتھر پھینکنے سے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہریں یا گول گول دائرے سے بنتے چلے جاتے ہیں اسی کو زلزلہ کہتے ہیں۔" فہمیدہ خاتون انیس میاں کو گود میں لئے ہوئے ایک طرف کھڑی تھیں یہ سن کر کہنے لگیں" اے ہے سنتے سنتے کان پک گئے۔ ہم تو اپنی بڑی بوڑھیوں سے یہ سنتے آئے ہیں کہ زمین کے نیچے گائے کھڑی ہے اور زمین اس کے سینگوں پر قائم ہے۔ جب گائے سینگ ہلاتی ہے تو زلزلہ آجاتا ہے۔ اور یہ ہیں کہ آج بالکل نئے شگوفے کھلا رہے ہیں۔" ماموں صاحب بولے،

"فہمیدہ تم تو بالکل پاگل ہو۔ بھلا آج کل کوئی بھی سمجھدار آدمی ایسی باتوں کا یقین کرے گا؟" میں نے اپنی باتوں کا سلسلہ جاری رکھا اور کہا" ہاں ویسے تو ہندوؤں میں بھی یہ خیال تھا کہ زمین ناگ دیوتا کے پھن پر رکھی ہے جب وہ زمین کو ایک پھن سے دوسرے پھن پر رکھتا ہے تو زلزلہ آجاتا ہے مگر یہ سب پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ اب انھیں سن کر ہنسی آتی ہے۔ بہر حال میں کہہ رہا تھا کہ زمین کے اندر سے یہ لہریں جب اوپر کی زمین پر آتی ہیں تو چند آلوں کی مدد سے رصدگاہوں میں ان کا حال لکھ لیا جاتا ہے اور اسی کی مدد سے زمین کے اندر کے حصے کا حال معلوم کیا جاتا ہے۔"

عائشہ خاتون مشین کے پاس بیٹھی انیس میاں کا ننھا منا سا کرتا کتر رہی تھیں مجھ سے کہنے لگیں:۔ "پیارے بھائی، پیارے بھائی ذرا خیال رکھئے گا۔ کہیں آسمان ٹوٹ کر نیچے نہ گر پڑے! ہاں!! اور ہم سب دب دبا جائیں۔" فہمیدہ بولیں" ہاں ہاں تعجب کیا ہے جب ایسی انوکھی باتیں سننے میں آئیں گی تو سچ مچ آسمان ٹوٹ پڑے گا۔" ماموں صاحب نے ڈبیا میں سے پان، بٹوے میں سے چھالیا اور تمباکو نکالی اور گردن نیچی کئے مسکرا کر بولے" بھئی یہ عائشہ بہت شریر ہو گئی ہے۔" پھر کچھ سوچ کر کہنے لگے" بھئی تم پہاڑوں دریاؤں اور نہ جانے کن کن چیزوں کا ذکر کر چکے مگر تم نے یہ نہیں بتایا کہ حضرت انسان

نے اس بستی کو کب سے آباد کیا؟ میں نے کہا" جی میں بتانے والا ہی تھا مگر اب ظہر کی نماز ہو چکی ہے نماز پڑھ لیجئے پھر باتیں ہوں گی۔"



اچھا لڑکا

محمد شفیع الدین نیر

یہ اک لڑکے کا قصہ ہے　　یہ لڑکا تھا بہت اچھا
تھی رغبت اُس کو پڑھنے سے　　تھا اُس کو شوق لکھنے کا
بدن اپنا لباس اپنا　　وہ رکھتا صاف اور سُتھرا
نہ کرتا گھر کبھی میلا　　نہ رہتا وہ کبھی گندا
پڑھائی کی بھی سب چیزیں　　قرینے سے وہ رکھتا تھا
وہ اُٹھتا وقت پر سو کر　　وہ اپنے وقت پر سوتا
وجاتا وقت پر پڑھنے　　وہ کھاتا وقت پر کھانا
اُسے ورزش کی عادت تھی　　وہ تھا ہر کھیل میں یکتا
بدی سے اس کو تھی نفرت　　بھلائی اس کا تھا شیوا
وہ سُنتا باپ اماں کی　　وہ کرتا باپ کا کہنا
نہ لیتا کام دھوکے سے　　نہ دیتا وہ کبھی چکما
تھا اپنے قول کا سچا　　تھا اپنی بات کا پورا
پرائے ہوں کہ ہوں اپنے　　تھے اس پر دل سے سب شیدا
تھا گھر کا نور وہ نیرّ
تھا باہر سب کو وہ پیارا



سائنس دانوں کی کہانی

سید نور الحسن ہاشمی ایم۔اے (علیگ)

اسی طرح ایک اور مشہور ہئیت داں ٹائکو براہے ڈنمارک میں گذرا ہے (۱۵۴۶ء ۱۶۰۱ء) بچپن ہی سے اُس کی عادت تھی کہ رات گئے تک ستاروں کو دیکھا کرتا تھا۔ ماں باپ کی خواہش تھی کہ وہ وکالت کا پیشہ اختیار کرے۔ ۱۵۶۲ء میں یہ لیپزگ یونیورسٹی اسی مقصد سے بھیجا گیا، مگر یہاں بھی دن بھر کام کرنے کے بعد رات کو یہ ستاروں کے مطالعے میں مشغول ہو جاتا اس مطالعے میں مدد دینے کے لئے اُس کے پاس کچھ ایسے آلے بھی نہ تھے صرف ایک کمپاس تھا اور ایک چھوٹا سا گلوب تھا۔ بس انھی دو چیزوں سے یہ اپنا کام نکال لیا کرتا تھا۔ ابھی سترہ ہی برس کی عمر تھی مگر وہ اس علم میں اتنا ہوشیار ہو گیا تھا کہ بڑے بڑے ہئیت دانوں کی غلطیاں نکالتا اور پھر اُنھیں ٹھیک بھی کر دیتا قسمت سے اس کے ایک رشتے کے چچا نے اس کے لئے ایک بڑا ترکہ چھوڑا، اس طرح گویا وہ روزی کی فکر سے آزاد ہو گیا اور اپنا زیادہ سے زیادہ وقت ستاروں کی تحقیقات میں صرف کرنے لگا۔ ۱۵۷۲ء میں اُس نے ایک نیا ستارہ دریافت کیا ۱۵۷۳ء میں اس نے ایک دیہاتی لڑکی سے شادی کر لی۔ اس عرصے میں ایک ہیئت دان کی حیثیت سے دور دور اس کی شہرت پھیل گئی۔ شاہ فریڈرک ثانی نے ..... اپنے خرچ سے اس کے لئے ایک رصدگاہ بنوا دی۔ یہ اس رصدگاہ میں بیس سال تک کام کرتا رہا۔ اس نے ہئیت میں بہت سی نئی نئی باتوں کا انکشاف کیا اور ہئیت جاننے والوں کے لئے نئے نئے سامان بنوائے۔ مگر اس بادشاہ کے مرنے کے بعد ڈنمارک میں بہت گڑبڑ مچی۔ ملک کے رئیس اور امیر براہے سے ناخوش تھے۔ ایک تو اس لئے کہ وہ سارا وقت ہئیت کے متعلق تحقیقات میں ضائع کرتا ہے، دوسرے اُس نے ایک دیہاتی لڑکی سے شادی کر لی۔ اُنھوں نے اسے اتنا پریشان کیا کہ بے چارا ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔

یہاں سے وہ بوہیمیا چلا گیا اور پراگ کے قریب
بیناش کے قلعے میں اپنے کام میں لگ گیا۔ یہاں کے
بادشاہ نے اس کے لئے کچھ وظیفہ بھی مقرر کر دیا،
تاکہ اُسے کوئی مالی تکلیف نہ ہو۔ یہیں ایک اور مشہور
ہیئت داں کیپلر اس کا شاگرد اور مددگار بنا۔

کیپلر بھی (۱۵۷۱ء-۱۶۳۰ء) اپنے اُستاد
کی طرح بہت ہی مشہور ہیئت داں ہوا ہے، اور
بہت سی نئی باتیں اُس نے دریافت کی ہیں۔ یہ بات
پہلے اُسی نے معلوم کی کہ سمندروں میں جوار بھاٹا
چاند کی کشش سے پیدا ہوتا ہے۔

کیپلر میگسٹاٹ جرمنی کا رہنے والا تھا۔ اس
کے ماں باپ بہت ہی غریب تھے۔ خود اس نے بھی
غربت ہی میں زندگی بسر کی۔ وہ تو کہو ڈیوک آف
ورٹمبرگ اس پر بہت مہربان تھا، اسی کی مدد
سے اُس نے اپنی تعلیم پوری کی، اس نے ٹوبنگن یونیورسٹی
سے ایم اے کی ڈگری اتنے اعزاز سے لی کہ گراز اور
لینز کی مشہور یونیورسٹیوں کا پروفیسر مقرر ہو گیا
اور اس کے کام کی اتنی شہرت ہوئی کہ ۱۶۰۰ء
میں براہے کا مددگار چنا گیا۔

براہے اس زمانے میں ستاروں کی ایک
تقویم بنا رہا تھا۔ اس کام میں کیپلر ہی اس کا مددگار
تھا، دوسرے سال براہے اس کام کو ادھورا
چھوڑ کر اس دنیا سے چل بسا۔ کیپلر نے یہ کام
جاری رکھا اور کامیابی کے ساتھ ختم کر دیا۔ اس عرصے
میں اس نے ستاروں کے بارے میں اپنی تحقیقات
برابر جاری رکھی۔ اور اپنی تمام نئی دریافتیں جدید
ہیئت کے نام سے ۱۶۰۹ء میں چھپوائیں۔ اس
نے ۱۶۳۰ء میں انتقال کیا اور ایک جگہ راتسبان
میں دفن ہوا۔ مرنے کے دو سو سال بعد وہیں اس
کی یادگار میں ایک مقبرہ تعمیر کر دیا گیا۔

اسی زمانے میں ایک بہت ہی مشہور سائنس
داں گذرا ہے جس کا نام آج بھی بڑی عظمت سے
لیا جاتا ہے۔ اس کا نام گلیلیو تھا۔ سولھویں اور سترھویں
صدی میں یورپ میں بہت جہالت چھائی ہوئی تھی
صرف گلیلیو کی ہستی ایسی تھی جس نے علم کی
مشعل روشن کی۔ یہ اٹلی میں (۱۵۶۴ء) بمقام
پیسا پیدا ہوا۔ اس کی سب سے مشہور ایجاد ایک
تو گھڑی ہے، دوسرے ستاروں کے دیکھنے
کی دوربین ہے۔ اِن دو کے علاوہ بھی اُس نے
بہت سی چیزیں ایجاد کیں۔ ایک خاص بات اس
کی طبیعت میں یہ تھی کہ وہ ہر بات کی وجہ معلوم
کرنے کی فکر میں سرگرداں رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس
ٹوہ میں رہتا تھا کہ کوئی بات کیوں اور کیوں کر
ہوتی ہے بس یہی اس کی کامیابی کا گر تھا۔ وہ ہر
چیز کو غور سے دیکھتا، اور کوئی چیز ایجاد کرنے سے
پہلے خوب غور و خوض کرتا۔

جوانی میں اُسے ریاضی سے بہت دلچسپی تھی۔ اس علم میں اُس نے اتنی واقفیت پیدا کر لی کہ بائیس برس کی عمر میں پسا یونیورسٹی میں ریاضی کا پروفیسر مقرر ہو گیا۔

ایک دن وہ پسا کے مشہور گرجا میں گیا۔ گرجا کے ہال میں بیچوں بیچ ایک جھاڑ لٹکا ہوا تھا اس وقت اُسے کسی نے ہلا دیا تھا اور وہ جھولے کی طرح ادھر اُدھر پینگیں لے رہا تھا۔ گلیلیو کو یہ برابر کے نپے تُلے پینگ عجیب معلوم ہوئے اچانک اس کے ذہن میں یہ بات آئی کیوں نہ ایسے باقاعدہ ہلنے کو وقت کے ناپنے میں استعمال کیا جائے۔ اس نے اسی وقت سے اس خیال پر غور کرنا شروع کر دیا اور آخرکار ایک ٹکٹن والی گھڑی ایجاد کی۔ دنیا کی تمام گھڑیوں کی ماں گویا یہی گھڑی تھی۔

اسی طرح اس کا ایک اور واقعہ مشہور ہے۔ پسا میں ایک بہت اونچا مینار ہے۔ ایک دفعہ گلیلیو اس پر چڑھ گیا۔ اس پر سے اُس نے بہت سی چیزیں، مختلف وزن کی نیچے پھینکیں، بھاری چیزیں جلد زمین تک پہنچ گئیں۔ ہلکی چیزیں دیر میں پہنچیں۔ جس حساب سے یہ چیزیں جلد یا دیر میں گریں۔ اُن سے اُس نے حرکت کے ایسے قاعدے قانون معلوم کئے جو اب تک سائنس دانوں کے کام آتے ہیں۔

۱۶۰۹ء میں اُسے معلوم ہوا کہ ہالینڈ میں کسی آدمی نے ایسی دوربین بنائی ہے جس سے دور کی چیزیں بالکل قریب نظر آتی ہیں۔ اُس نے سوچا اگر میں بھی ایسی دوربین بنا لوں تو میرے لئے آسمان اور ستاروں کا مطالعہ کرنے میں بڑی آسانی ہو گی۔ یہ سوچتے ہی اُس نے ایک بہت بڑی دوربین بنانا شروع کی اور تھوڑے ہی دنوں میں اتنی بڑی دوربین بنا لی جس سے ستارے بہت قریب نظر آتے تھے۔ اس طرح اسے ستاروں کے بارے میں بہت سی نئی نئی باتیں معلوم ہوئیں مثلاً (۱) یہ کہ چاند میں پہاڑ ہیں (۲) کہکشاں کو لوگ پہلے محض ایک روشن راستہ سمجھتے تھے دوربین کے ذریعے گلیلیو کو یہ ستاروں کا ایک بہت بڑا جھرمٹ نظر آیا۔ (۳) مشتری ستارے کے چاروں طرف اُسے بہت سے چھوٹے چھوٹے ستارے گردش کرتے نظر آئے، بالکل اسی طرح جیسے چاند زمین کے گرد گھومتا ہے (۴) سورج خود بھی اپنی کیلی پر گھومتا ہے بالکل ٹھیرا ہوا نہیں ہے پہلے لوگ اسے ٹھیرا ہوا سمجھتے تھے *



دہلی سے آگرہ

محمد نقی دوم و محمد عثمان ہاشمی ابتدائی ششم تعلیمی مرکز

۱۵ مارچ ۱۹۴۳ء کو صبح چھ بجے لاری پر سوار ہوکر اسٹیشن پہنچے اس وقت ہم سب کے دل میں کچھ عجیب جوش اور ولولہ تھا، ہم لوگوں نے لاری سے اُتر کر سب سامان ایک جگہ جمع کیا۔ اس وقت ہم میں سے تین لڑکے غیر حاضر تھے۔ تھوڑی دیر میں محمد صادق بھی آگئے۔ ماسٹر اکرام صاحب ٹکٹ لینے چلے گئے۔ انھوں نے ٹکٹ بابو کو پچیس روپئے ٹکٹوں کے دئے مگر وہ پانچ روپے بھول گیا۔ یہ پانچ روپئے بڑی دقت سے وصول ہوئے۔ ماسٹر اکرام صاحب نے اپنے کسی کرم فرما کے ذریعے گاڑی کا ایک ڈبہ اپنے لئے رزرو کرا لیا۔ اچھا بڑا ڈبہ تھا۔ ہم نے سامان اُٹھا اُٹھا کر جلدی سے ڈبے میں رکھا۔ اور دو رزرو کارڈ ڈبے کے دونوں طرف لگا دئے۔ کوئی پونے گھنٹے بعد گاڑی نے سیٹی دی اور آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ تھوڑی دیر میں اس کی رفتار کچھ تیز ہوئی اسے پہنچئے وہ نئی دہلی کا اسٹیشن آگیا۔ یہاں ہمارے دونوں ساتھی عبدالباسط اور عبدالواجد موجود تھے

اب گویا ہم سب ساتھی پورے ہوگئے تھے۔ یہاں گاڑی تھوڑی دیر رکی اور چل دی۔ اب ہم لوگوں نے کھانے کی طرف توجہ کی۔ وہیں ڈبے میں دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا اس کے بعد کوئی تو سوگیا اور کوئی جاگتا رہا۔ گاڑی فرآٹے بھرتی۔ لہلہاتے کھیتوں کو چھوڑتی کچھ عجیب انداز سے چلی جارہی تھی۔ اس کے لئے یہ سب دلچسپیاں ہیچ تھیں اسے تو اپنی منزل پر پہنچنے کی دھن تھی۔ میدان کے لہلہاتے کھیت۔ آموں کے درختوں کے جھنڈ۔ گاؤں کی آبادیاں اور خوش رنگ پرندوں کے غول بھی اُسے اپنی طرف متوجہ نہ کرسکے۔ آخر فریدآباد کے اسٹیشن پر آکر رُکی۔ یہاں ہم نے پانی اور اس نے مسافروں کو لیا اور چل دی اور دو تین اسٹیشنوں پر رکتی ہوئی۔ متھرا کے اسٹیشن پر ٹھیری۔ یہاں مسافروں کی بہت بھیڑ تھی۔ ہمارا ڈبہ رزرو تھا اور کوئی غیر آدمی اس میں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ پھر بھی کچھ لوگوں نے اس میں گھسنے کی کوشش کی جب ہم نے بتایا کہ

ڈبہ تو زرد ہے تو وہ کہنے لگے " اس پر کارڈ تو لگا ہی نہیں " اب جو دیکھا تو واقعی کارڈ غائب تھا دوسری طرف ایک کارڈ باقی رہ گیا تھا۔ اس نے ہماری مدد کی اور ان لوگوں سے نجات دلائی۔ اس کے بعد والے اسٹیشن پر تو اُترنا ہی تھا اس لئے اطمینان سے دو آدمیوں کو بٹھا لیا۔ اب ہم لمحہ بہ لمحہ اپنی منزل (یعنی آگرے) سے قریب ہو رہے تھے۔ ہم میں سے چند ساتھیوں نے ایک دوسرے کو بہکانا شروع کیا " وہ رہا تاج ، وہ رہا آگرہ شہر" غرض انھی دلچسپیوں میں تھے کہ گاڑی کی رفتار مدھم پڑ گئی اور تھوڑی دیر کے بعد بالکل ٹھیر گئی " یہ راجہ کی منڈی " اسٹیشن تھا۔ ہمیں یہیں اُترنا تھا۔ خود اُترے اور سامان اُتارا۔ سامان اُتار چکے تو معلوم ہوا کہ چراغ الدین چپراسی کا بستر غائب ہے۔ ماسٹر صاحب نے دہلی کے اسٹیشن ماسٹر کو اسی وقت تار دیا اور شہر میں مکان کی تلاش میں چل دئے۔ شام کو واپس آئے اور خان بہادر اختر عادل صاحب کی کوٹھی پر رہنے گئے۔ شام کا کھانا جامع مسجد پر کھایا اور دل میں تاج دیکھنے کا ارمان لے کر سو گئے۔ رات کو خواب میں آگرے کی خوب سیر کی۔

بچوں کی دُکان

آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے

پروفیسر محمد عبدالغفور ایم۔ اے

انسانوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تو یہ بات ہمیشہ رہی۔ مگر ملکوں ملکوں اور کل دنیا میں اس کا چرچا پچھلی صدی ہی سے شروع ہوا۔ انقلاب فرانس کا ذکر تو تم نے سنا ہوگا۔ اس انقلاب نے عام لوگوں کو رائے دینے کا حق دیا۔ اب حکومت کے مالک بادشاہ اور اُن کے وزیر نہ رہے بلکہ عوام کی ایسی اسمبلیاں ہوگئیں جنھیں امیر و غریب دونوں نے مل کر ووٹوں کے ذریعے چنا ہو تو ایک لحاظ سے غریب امیروں سے برابر ہو گئے۔ دونوں ایک ساتھ ووٹ دیتے تھے۔ ایک ساتھ ملک کا انتظام کرنے والوں کو چنتے تھے، پھر بھی امیر امیر رہے، غریب غریب۔ ویسے تو برابری حاصل ہوگئی مگر اقتصادی اور مالی برابری پیدا نہ ہوئی۔ سوشلزم کے ذریعے بعض لوگوں نے ایسی برابری اور جمہوریت کی بنیاد ڈالی۔ جو انسانوں کو مالی اور اقتصادی لحاظ سے بھی ایک برابر موقع کردے۔ مگر یہ کام سمجھانے بجھانے صلح و صفائی سے ہونا چاہیئے۔ جہاں تک ہوسکے۔ امیر طبقے کو باتوں باتوں میں رام کیا جائے دنگے فساد کی نوبت ہی نہ آئے، اُن سے کہا جائے کہ بھائیو! دولت پیدا کرنے کے ذریعے تو کسی ایک آدمی کی ملکیت نہیں۔ دولت پیدا کرنے کا ذریعہ ایک تو زمین ہی ہے اور زمین خدا کی ہے۔ علیحدہ علیحدہ انسانوں کی نہیں۔ اگر ہو بھی تو سب کی اکٹھی۔ جب ساری قوم ایک چیز کی مالک ہے تو تم علیحدہ علیحدہ مالک بننے والے کون؟ اسی طرح کانیں اور اُن کی پیداوار۔ یہ بھی قدرت کی طرف سے سب انسانوں کے لئے تحفے ہیں۔ تو اُن کے علیحدہ علیحدہ فرد مالک کیوں ہوں۔ یہ بھی ساری سماج کی ملکیت سمجھی جائیں۔ اسی طرح کارخانہ صنعت و حرفت اور تجارت بھی ایک ایسا مشترکہ کاروبار سمجھا جائے۔ جیسے پوری قوم ایک خاندان کی طرح سب کی بھلائی کے لئے چلاتی ہو جیسے ایک خاندان

میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کہ لیٹا تو اس کی ہر اور بدھتا آیا کا اسی طرح سماج میں بھی کوئی ایسی چیز جو دولت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ کسی کی ذاتی ملکیت نہ ہو۔ بعض لوگ تو اتنا بڑھ گئے کہ کسی عورت کے پاس اس کی ذاتی سلائی کی مشین بھی نہ ہونی چاہیے۔ نہ کسی مرد کے پاس اس کا ذاتی سبزیوں کا باغ ہو۔ بہر حال جب ساری پیداوار کے ذریعوں کی ساری قوم مالک ہو۔ تو اس مشترکہ ملکیت کا انتظام کرنے والا کون بنے۔ اور سب کی بھلائی کے لئے اس کا انتظام کون کرے اب تک تو سبھی لوگ ایک رائے کے تھے نظام کرنے والوں کا سوال پیدا ہوا تو جتنے منہ اتنی باتیں۔ بعض نے کہا " اس کا انتظام ریاست کے سپرد ہو " دوسروں نے کہا " نہیں! یہ کام تو خود اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔ جو چیز پیدا کرنے کے لئے کام میں ہاتھ بٹاتے ہیں یعنی یہ انتظام مزدوروں کے گروہوں کے ہاتھ میں ہو " اور بعض نے کہا نہیں، نئے انتظاموں کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کام پرانے منتظموں کے ہاتھ میں رہے۔ اور وہ سب کی بھلائی کے لئے انتظام کریں۔ گویا پرانے کارخانے والے اور سرمایہ دار مالک نہ رہے بلکہ قوم کی طرف سے دولت پیدا کرنے والے ذریعوں کے منتظم ہو گئے۔

رابرٹ اوون جس نے سب سے پہلے انگلستان میں سوشلزم چلایا۔ ایسے ہی خیالات کا حامی تھا۔ وہ خود نیک اور ہمدرد انسان تھا اور اسے یقین تھا کہ ہر کارخانے کا مالک یا زمیندار اسی حیثیا انسانوں کا ہمدرد اور بہی خواہ ہے۔ اس نے "نیو لینرک" میں دوسرے کارخانہ داروں کے سامنے ایسی ہی تجویز پیش کرنا چاہی جو انصاف اور ہمدردی پر مبنی ہو۔ مگر جب اُس نے اپنے اس ارادے کا اپنے دوستوں سے ذکر کیا۔ تو وہ مسکرائے۔ بھلا کارخانوں کی ایسی دُنیا میں جہاں مزدوروں کو نیند سے اُٹھانے کے لئے کوڑے استعمال کئے جاتے تھے۔ جہاں ننھے ننھے بچے بارہ بارہ اور چودہ گھنٹے کانوں کی اندھیاری میں خطرناک قسم کے کام انجام دیتے تھے، وہاں ایسے خیالات کی کیا گنجائش تھی مگر اوون دلیر آدمی تھا۔ اس نے ہمت نہ ہاری بلکہ ایک حد تک اپنے تجربے کو کامیاب کر دکھایا کارخانے کے مزدور اس کے لئے مشین کے پرزے نہ تھے۔ نہ کسی گھڑی کے دندانے تھے کارخانے کو چلانے اور انتظام میں اس کے شریک کار تھے۔ ایک مرتبہ امریکہ سے روئی آنا بند ہو گئی کوئی اور کارخانے دار ہوتا تو کارخانہ بند کر کے مزدوروں سے کہتا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے گھر تشریف

نے جلتیے۔ اب کارخانہ بند رہے گا" لیکن اوون انہیں ہر ہفتہ باقاعدہ تنخواہ دیتا رہا۔ چار مہینے تک بغیر کام کے مزدوروں کو تنخواہ ملتی رہی۔ مزدور روز حاضر ہوتے تھے۔ مشینوں کی دیکھ بھال کرتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ کہیں چار مہینے بعد کارخانہ دوبارہ چلا۔ اس دوران میں اوون کے ہزاروں پونڈ اُٹھ گئے۔ لیکن بہرحال مزدوروں کو اس پر پورا بھروسہ ہوگیا۔ اور انھوں نے اس زور شور سے کام شروع کیا کہ سب اگلی پچھلی کسر نکال دی۔

رابرٹ اوون بھلا آدمی تھا مگر سبھی کارخانہ دار تو ایسے نہیں ہوتے۔ دُنیا میں سبھی قسم کے لوگ ہیں۔ اچھے بھی ہیں اور بُرے بھی اس لئے کارخانہ داروں کی دُنیا میں سوشلزم سیاسی لحاظ سے کامیاب نہ ہوا مگر اس کے طفیل غریبوں کو بہت سی سماجی نعمتیں مل گئیں۔ رابرٹ اوون کا تجربہ زمین میں دفن ہوگیا مگر اس کے مزار پر دو قندیلیں جلتی رہیں۔ ایک تو انجمن امداد باہمی کی قندیل اور دوسرے بچوں کے مدرسوں کی شمع۔ اوون نے اپنے مزدوروں کے بچوں کے کے لئے ایک آرام دہ اور خوب صورت مدرسہ ایسے زمانے میں بنایا جب امیروں کے بچے بھی

چھوٹی عمر میں خاک دھول میں لوٹتے پھرتے تھے اس کے بعد ملک بھر میں کنڈر گارٹن اور نفنٹ اسکول کھلنے لگے۔ اسی طرح عیسائی سوشلسٹ حضرت عیسیٰؑ کے سنہرے زمانے کو تو دوبارہ زندہ نہ کرسکے مگر انھوں نے غریب اُستانیوں اور سلائی کا کام کرنے والی عورتوں کی زندگی میں ایک خوش گوار انقلاب پیدا کردیا۔ سلائی والیوں سے تو دکان دار زر خرید غلاموں سے بھی بُرا سلوک کرتے تھے۔ لندن میں ایک سلائی کرنے والی کو جمعرات کی صبح کو جو کام پر لگایا تو اتوار کی صبح تک برابر کام کرایا گیا۔ اس دوران میں وہ ایک لمحہ بھر نہ سوئی۔ بیٹھے بیٹھے نیند آنے لگتی، تو کھڑی ہوکر کام کرتی۔ عیسائی سوشلسٹوں نے ان کے لئے خاص دُکانیں بنوائیں جہاں اُنھیں کام کے لئے مناسب سہولتیں فراہم کی گئیں۔ ان کے علاوہ غریبوں کی بھلائی کے کئی اور نیک کام شروع کئے گئے۔ کسی نے کہا ہے کہ "نیکی کر دریا میں ڈال" سوشلسٹ لوگوں نے نیکی کی اور اس سے نئے خیالات اور سماجی خدمت کے کے ایسے بند کھول دئے جن سے انسان آج تک فیض یاب ہورہے ہیں ✦



بچّوں کی نظمیں

محمد شفیع الدین نیّر کی اصلاح کے بعد

ابرِ بہار

اظہار الحق، پٹنہ

ہر پھر کے آئے بادل گھر گھر کے آئے بادل
کالے ہیں اور پیلے اودے ہیں اور نیلے
بجلی چمک رہی ہے جھم جھم جھمک رہی ہے
بادل گرج رہا ہے باجا سا بج رہا ہے
کوئل بھی گا رہی ہے گانا سنا رہی ہے
دھڑ دھڑ پڑے گی بارش جل تھل بھرے گی بارش

ہم بھی نہال ہوں گے
غم پائمال ہوں گے

ہمارا دین

مطیع اللہ، تعلیمی مرکز جامعہ

اے مرے مولا اے مرے مولا دین دیا ہے تونے انسا
ہے جو سب دینوں سے اعلا ہے جو سب دینوں سے نرالا
دین ہے یہ اسلام ہمارا ہے یہ ہم کو دل سے پیارا
رستہ ٹھیک دکھاتا ہے یہ باتیں ٹھیک بتاتا ہے یہ
اچھے کام سکھاتا ہے یہ سیدھی راہ چلاتا ہے یہ

اے مرے مولا اے مرے مولا
مجھ کو بھی تو بنا دے اچھا

برسات

عبد الحلیم خاں

بادل آئے کالے کالے قدرت کے ہیں کھیل نرالے
چاروں طرف سے گھر کر آئے ساتھ میں اپنے پانی لائے
بجلی چمکی بادل گرجا خوب ہی پھر تو پانی برسا
ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا خوب ہی سب کا جی بہلایا
قدرت کے ہیں کھیل نرالے بادل آئے کالے کالے

چکور

سید محمد زماں شاہ جاوید - نورالائی

ہم نے ایک چکور ہے پالا بھولا بھالا پیارا پیارا
رنگت اس کی زردی مائل ہے یہ پرندہ بہت ہی عاقل
جب بلّی کو دیکھ ہے پاتا جھٹ سے چپکے سے یہ چھپ جاتا
فوفو میاں نام ہے اس کا پنجرا ایک مقام ہے اس کا

ہے جاوید نے پالا اس کو
دیتا ہے وہ دانا اس کو



(اپریل کے پرچے سے سلسلہ ملاکر پڑھو)

بُننے والوں کے سلسلے میں ایک نام اور سُن لو اور پھر ان جُلاہوں کی کہانی ختم کرو۔ یہ آخری شخص ایڈمنڈ کارٹ رائٹ (۱۷۴۳ - ۱۸۲۳) تھا۔ تھا تو یہ پادری لیکن اسے مشین بنانے کا بڑا شوق تھا۔ مشین کا کرگھا اس کی ایجاد ہے۔ ۱۷۸۵ء میں اس نے پہلا مشین کا کرگھا بنایا۔ وہاں کے جتنے جلاہے تھے سب اس سے خفا ہوگئے۔ یہ بھاگ کر مانچسٹر پہنچا۔ یہاں کے جلاہے اور بھی زیادہ بپھرے اور ایک دن موقع پاکر اس کا کرگھا توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا۔ اور تمام شہر میں بڑے فسادات ہوئے۔ لیکن مشین تو دماغ کی پیدا ہے۔ کل پُرزوں کو کوئی لاکھ توڑے پھوڑے، دماغ جب تک سلامت ہے بیسیوں مشینیں تیار ہوسکتی ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ کارٹ رائٹ کی مشین تو تباہ کردی گئی۔ لیکن مشینوں کے کرگھے کا رواج ہوکر رہا۔ ۱۸۰۹ء میں گورنمنٹ نے کارٹ رائٹ کو بطورِ انعام دس ہزار روپے سالانہ کی پنشن مقرر کردی جو اُسے آخر وقت تک ملتی رہی۔

موزہ بُننے اور سینے کی مشینوں کا قصّہ بھی دلچسپ ہے۔ موزہ بُننے والی مشین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ملکہ الزبتھ کے زمانے میں ایک غریب پادری ولیم لی (WILLIAM LEE) تھا اس کی بیوی موزے بُن بُن کر اپنی اور اپنے شوہر کی کفالت کیا کرتی تھی بے چارہ پادری یہ دیکھ دیکھ کر بہت کڑھتا تھا کہ اس کی بیوی صُبح سے شام تک اس کام میں لگی رہتی ہے چنانچہ اس نے غور کرکے ایک مشین بنائی جس سے خود بخود موزہ بُننے کا کام ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے پاس روپیہ نہیں تھا کہ وسیع پیمانے پر اس کام کو چلا سکے اتفاق سے اس ایجاد کی خبر فرانس کے بادشاہ ہنری چہارم کو ہوئی۔ اس نے پادری کو بلا بھیجا۔ لیکن اس کی بدقسمتی کہ جب یہ فرانس پہنچا اسی زمانے میں ہنری چہارم قتل کر ڈالا گیا۔ اب اس کا کوئی مددگار نہیں رہا چنانچہ نا اُمید اور دل خستہ ہوکر یہ بے چارہ پادری

انگلستان لوٹ آیا اور غربت اور کس مپرسی کی حالت میں مرگیا۔ لیکن پادری کے چند ساتھیوں کو اس مشین کا راز معلوم تھا۔ ان لوگوں نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ رفتہ رفتہ مشینوں کے ذریعے موزے بُنے جانے لگے بلکہ آج کل تو ایک ایک دن میں یہ مشینیں کئی کئی سو جوڑے موزے تیار کرلیتی ہیں۔

سینے کی مشین سب سے پہلے ایک انگریز ٹامس سینٹ نامی نے سنہ ۱۷۹۰ء میں ایجاد کی لیکن اس نے یہ مشین چمڑا سینے کے لئے ایجاد کی تھی۔ اس سے کچھ بہتر مشین کپڑا سینے کی چند سال بعد ایک فرانسیسی درزی تھموینیر نامی نے بنائی۔ اس نے ایک بہت بڑی دکان میں اتنی مشینیں ایک دم چلانا شروع کردیں۔ اب تو دوسرے فرانسیسی درزی بگڑ گئے اور لاٹھیاں لے لے کر اس کی دکان پر چڑھ گئے وہ سمجھتے تھے کہ ان مشینوں کی بدولت ان کی روزی بالکل ختم ہی ہو جائے گی۔ اس کی دکان اور اس کی تمام مشینیں ان لوگوں نے توڑ پھوڑ کے برابر کردیں۔ تھموینیر نے پھر مشینیں بنانا شروع کیں۔ لیکن درزیوں نے اس کا بالکل بائیکاٹ کردیا اس کو کام بہت تھوڑا ملنے لگا۔ آخرکار بے چارا غریب ہی مرگیا۔

سنہ ۱۸۳۴ء میں امریکہ میں ایک شخص والٹر ہنٹ نامی نے ایک سینے والی مشین بنائی۔ ایسی جیسی کہ آج کل استعمال ہوتی ہے یعنی دو تاگے اس میں ڈالے جاتے ہیں ایک باہر کی سوئی میں دوسرا اندر کی پھرکی میں۔ اس سے پہلے سینٹ اور تھموینیر نے جو مشینیں بنائی تھیں ان میں صرف ایک ہی تاگا ہوتا تھا۔ ہنٹ نے یہ مشین بنا تو لی لیکن اسے پیٹنٹ نہیں کرایا اور نہ اس سے کچھ روپیہ کمایا۔

تھوڑے دنوں بعد ایک دوسرے امریکن الیاس ہاوے نامی نے اس مشین میں اور اضافے کرکے بالکل ایسی مشین بنائی جیسی آج کل چلتی ہیں۔ لیکن امریکہ کے تمام درزی اس کے مخالف ہوگئے اس لئے ہاوے نے اپنے بھائی کو انگلستان بھیجا کہ وہاں جاکر اسے رائج کرے یہ مشین وہاں چل نکلی۔ اب خود ہاوے بھی انگلستان گیا اور وہاں اسے خوب رواج دیتا رہا۔ کچھ دنوں بعد جب امریکہ واپس ہوا تو دیکھا کہ دوسرے لوگوں نے بھی ویسی ہی سینے کی مشینیں بنالی ہیں۔ اس نے ان دوسرے لوگوں پر مقدمہ چلادیا کہ یہ تو میری ایجاد ہے۔ ان لوگوں نے میری بلا اجازت کیسے یہ مشین بنالی۔ یہ مقدمہ ہاوے جیت گیا اور ان لوگوں کو اسے تاوان دینا پڑا اور یہ بھی طے ہوگیا کہ آیندہ جتنے لوگ اس کی نقل کریں وہ سب ہاوے کو ہر مشین پر کمیشن دیا کریں۔

اچھا اب چھپائی کی مشین کے حالات سنو کہا یہ جاتا ہے کہ چھاپنے کی مشین سب سے پہلے چین میں نکالی گئی۔ کب اور کس نے نکالی یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ انگلستان میں البتہ سب سے پہلے ولیم کاکسٹن نامی ایک انگریز نے وسط پندرھویں صدی میں دستی چھاپہ خانہ بنایا۔ اس سے پیشتر دوسرے ملکوں کی طرح یہاں بھی کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں اور ان میں وقت اور روپیہ دونوں بہت خرچ ہوتا تھا۔ پھر بھی اتنی تعداد میں نہیں ہوتی تھیں کہ ملک کے سب لوگوں کے پاس پہنچ سکیں۔ بڑے بڑے امیر آدمی ہی یہ کتابیں رکھ سکتے تھے۔

کاکسٹن انگلستان کے ایک مقام کنٹ میں ۱۴۲۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی ابتدائی زندگی کے متعلق کچھ زیادہ معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ پڑھا لکھا ضرور ہوگا صرف اتنا معلوم ہے کہ سولہ برس کی عمر میں وہ کسی ریشم کے تاجر کی دکان پر ملازم تھا۔ تاجر کے مرجانے پر وہ بلجیم کے ایک شہر بروجز میں چلا گیا۔ یہاں ریشم کی بڑی منڈی تھی۔ یہیں کاکسٹن بھی ریشم کی تجارت کرنے لگا اور تھوڑے دنوں میں خوب مال دار ہو کر اپنے وطن واپس آگیا۔ بلجیم ہی میں اس نے چھاپنے کی ترکیب سیکھی تھی، اور ایک مرتبہ جرمنی گیا تھا وہاں اس نے چھاپنے والی ٹائپ کی مشین بھی دیکھی تھی یہ مشین جان گوٹنبرگ نامی ایک جرمن نے بنائی تھی۔ گویا مغرب میں سب سے پہلے اسی جرمن ہی نے چھاپنے کی ترکیب نکالی۔ کاکسٹن جب انگلستان واپس ہوا تو اس نے بھی ایک دستی چھاپہ خانہ تیار کیا اور اسی جرمنی ٹائپ والی دستی مشین کا استعمال کیا۔ اس مشین میں ترکیب یہ تھی کہ حروف لوہے کے ڈھالے جاتے تھے۔ اور اس طرح ایک ہی حرف کئی کئی دفعہ استعمال کیا جا سکتا تھا سب سے پہلے اس نے کتاب "ٹرائے کی تاریخ" چھاپی۔ یہ کتاب اس نے خود لاطینی زبان سے ترجمہ کی تھی۔ یہی سب سے پہلی کتاب تھی جو انگلستان میں چھاپی گئی اس کتاب کی طباعت میں اس کو جو کامیابی ہوئی اس سے اس کا دل بہت بڑھا اور ویسٹ منسٹر کے مقام پر ۱۴۷۶ء میں اس نے ایک بڑا چھاپہ خانہ کھولا جس میں اس نے فرانسیسی کتابوں کے بہت سے ترجمے اور بہت سے انگریز شاعروں کے دیوان چھاپے۔

تھوڑے دنوں بعد بہت سے نقل کرنے والے پیدا ہو گئے اور اس میں نئی نئی کار آمد تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ یہ فن بہت مکمل ہو گیا۔ کاکسٹن کا انتقال ۱۴۹۱ء میں ہوا +

(باقی آئندہ)

تصویریں بنائیں

تصویر بنانے کا شوق ایک تمھیں کیا سبھی بچوں کو ہوتا ہے۔ کسی تصویر کی نقل کرنا تو کوئی ایسی مشکل بات نہیں بس تھوڑے دنوں مشق کی ضرورت ہے مگر کسی خاص شخص کی تصویر کھینچنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ بہت سے بچوں کی سمجھ میں تو یہ نہیں آتا کہ اسے شروع کیسے کریں دیکھو نیچے ہم تمھیں اس کے کچھ قاعدے بتاتے ہیں۔ انھیں تم غور سے پڑھوگے اور تصویر بناتے وقت ان کا خیال رکھوگے تو تھوڑے ہی دنوں میں خوب مشاق مصور بن جاؤگے۔

مگر پہلے بھئی اپنا سامان تو ٹھیک کرلو۔ سامان ہی کیا ہے نمبر B سے نمبر 4B تک والی پنسلیں سادہ یعنی بغیر رول کئے ہوئے کاغذ کی ایک کاپی جسے اسکیچ بک کہتے ہیں۔ کاپی یا اسکیچ بک کا کاغذ زیادہ کھردرا نہ ہو۔ اور ہاں ایک پنسل معمولی تبدیلیاں کرنے کے لئے۔

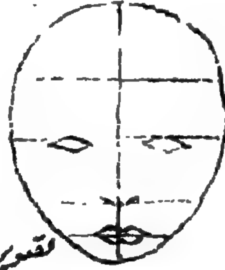
اچھا صاحب یہ سب چیزیں تو آگئیں اب تصویر کیسے بنے تو یوں کرو اپنے کسی دوست کو پکڑ لاؤ۔ کوئی بڑا تو تمھاری بات کیوں ماننے لگا اپنے ساتھی کو اپنے سامنے کچھ فاصلے پر بٹھاؤ تاکہ تمھیں اس کا چہرا صاف صاف اور آسانی کے ساتھ دکھائی دے۔ تم خود اس طرح بیٹھو کہ روشنی تمھارے بائیں طرف سے آئے۔ داہنی طرف سے آئے گی تو تمھارے ہاتھ کا سایہ تمھاری تصویر پر پڑے گا۔ اسکیچ بک کو اپنے بائیں ہاتھ میں اس طرح پکڑے رہو کہ تصویر کھنچوانے والے کا چہرا اسکیچ بک کے اوپر کے کنارے سے اچھی طرح نظر آسکے۔ اور تصویر ختم ہونے تک نظر آتا رہے اسکیچ بک اس طرح رکھنے سے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب تمھاری نظریں تصویر کھنچوانے والے کے چہرے سے اسکیچ بک پر پڑیں گی تو تمھارے سر کو جنبش نہ ہوگی۔

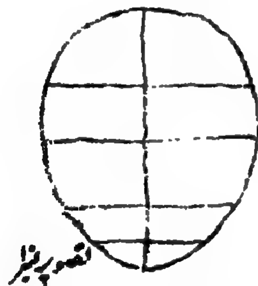
تصویر کھینچتے وقت تصویر کا اصل آدمی یعنی تصویر کھنچنے والے سے برابر مقابلہ کرتے رہو صحیح تصویر بنانے کے لئے یہ بات بہت ضروری ہے ورنہ غلطی کا امکان ہے۔

نومشق بچے ذرا جلد باز ہوتے ہیں۔ چہرے پر
ایک سرسری نظر ڈال کر ایک سانس میں تصویر بنا لینا
چاہتے ہیں۔ پھر بعد میں کہتے ہیں "تصویر ٹھیک نہیں بنی
میں تصویر بنا ہی نہیں سکتا" حالانکہ غلطی خود اُن کی
ہوتی ہے۔ جلدی میں تو کوئی کام بھی ٹھیک نہیں
ہو سکتا۔ پھر شروع شروع میں تو ہر کام ایسا ہی
ہوتا ہے۔ کامیابی تو محنت اور مشق کے بعد ہوتی
ہے۔ اصل میں تصویر بنانے والے کا اصول

اس لئے کہ ضرورت کے وقت تم انھیں آسانی سے
مٹا بھی سکو۔ (تصویر نمبر ۲) چہرے کو اور زیادہ
نمایاں طور پر ظاہر کرتی ہے۔ تیسری کوشش
میں ان لکیروں کو زیادہ صحیح اور نمایاں کرنا چاہئے
یہ بالکل آخری منزل ہے۔ اچھا تم اب ذرا ایک
کوشش تو کر ڈالو۔ دیکھو تصویر اچھی نہ بنے تو
ہمت نہ ہارنا۔ میں نے خود پہلے پہل اس طرح ایک
تصویر بنائی تھی تو دیکھ کر ہنسی آئی تھی۔ مگر میں


تصویر نمبر ۳


تصویر نمبر ۲


تصویر نمبر ۱

یہ ہونا چاہئے کہ تصویر بنانے سے پہلے بنوانے یا
کھنچوانے کا چہرا خوب غور سے دیکھ لے اور جب
تک بناتا رہے اُسے اچھی طرح دیکھتا رہے۔

چہرا بنانے کی تین منزلیں ہوتی ہیں۔ سب سے
پہلے ایک بیضوی شکل بناؤ۔ اس کے بعد اس میں کچھ
ایسی لکیریں کھینچو جن سے چہرے کے خدوخال کا کچھ
اندازہ کیا جا سکے۔ (تصویر نمبر ۱) یہ تمام لکیریں
اتنی ہلکی ہوں کہ تمھیں نظر آسکیں بس۔ یہ

برابر مشق کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ اچھی خاصی مشق
ہو گئی۔ تصویر بنانے کے بعد تم اسے میرے پاس
بھیج دو۔ جس بچے کی تصویر سب سے اچھی ہو گی
اس کا نام اور اس کی تصویر پیام تعلیم میں چھاپ
دی جائے گی اگر ممکن ہوا تو میں خط کتابت کے ذریعے
تمھیں مشورے بھی دے سکوں گا۔ اگلے پرچے میں
تصویر کھینچنے کے بارے میں اور باتیں بھی بتائی
جائیں گی +

جمال آرٹسٹ۔ معرفت ایڈیٹر پیام تعلیم
مکتبہ جامعہ۔ دہلی، قرول باغ

بچوں کی کوششیں

بادشاہ کی کہانی

مطیع اللہ خاں، تعلیمی مرکز

کسی شہر میں ایک بادشاہ رہا کرتا تھا۔ اس کی رعایا اس سے بہت خوش تھی۔ وہ ایک روز گھر میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا تو وہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک چیونٹی اپنے سے بہت زیادہ وزن اُٹھائے چلی جا رہی ہے۔ اتفاق سے دوسرے روز اس کے ملک پر ایک بادشاہ نے حملہ کیا۔ یہ بادشاہ ہار گیا اور اپنے محل میں سے نکل بھاگا۔ اُس نے اُسی جیسی چیونٹی پھر دیکھی، اُسے اس چیونٹی سے بہت بڑا سبق ملا۔ اس نے کہا "اگر چیونٹی کی طرح میں بھی محنت کروں تو بادشاہت پھر آسکتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اب کے بادشاہ نے بہت سے ملک فتح کرلئے اور چین کرنے لگا۔

ویلس کی ایک کہانی

محمد طارق صدیقی، بنارس

شہر یوزبری کے قریب ایک پہاڑ تھا، اور اس کے قریب کچھ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں بھی تھیں۔ جن میں کچھ ویلش[1] (WELSH) رہا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ پہاڑ اور پہاڑیاں ان کے ملک کے ایک دیو نے بنائی ہیں۔ اس کا قصہ وہ یوں بیان کرتے ہیں کہ اس دیو سے اور شہر یوزبری کے حاکم سے لڑائی تھی۔ اس نے سوچا کہ دریائے سورن (جس کے کنارے شہر یوزبری آباد ہے) میں ایک دیوار بنائے جب وہ دیوار پانی کو روکے گی تو پانی اِدھر اُدھر بہہ جائے گا اور شہر یوزبری کا حاکم اور سارے آدمی ڈوب جائیں گے۔

اس نے ایک بہت بڑے پھاوڑے پر بہت سی مٹی رکھ کر شہر یوزبری کا قصد کیا۔ وہ دن بھر

[1] ویلس کے رہنے والوں کو ویلش کہتے ہیں۔

چلتا رہا لیکن اتفاق سے راستہ بھول گیا آخر بہت تھک گیا اور سمجھا کہ اس کا سفر ختم ہو گیا۔

بہت دیر بعد اُسے ایک موچی ملا وہ اپنے کاندھے پر پرانے جوتوں کا تھیلا لئے ہوئے تھا۔ وہ شرپوزبری گیا تھا تاکہ جوتوں کو جمع کرکے اپنے گھر لائے اور ان کو درست کرے۔

دیو نے اس کو پکار کر کہا :۔ "میرے دوست یہاں سے شرپوزبری کتنی دور ہے؟"

موچی :۔ شرپوزبری! تم شرپوزبری کا پتہ کیوں پوچھ رہے ہو؟

دیو :۔ میں اس مٹی سے جو میرے کاندھے پر ہے دریائے سورن میں ایک دیوار بنانا چاہتا ہوں، تاکہ وہاں کا حاکم اور وہاں کے آدمی ڈوب جائیں۔

موچی نے اپنے دل میں کہا "اگر اس نے وہاں کے لوگوں کو ڈبو دیا تو میرے سارے گاہک ڈوب جائیں گے۔ اس لئے اُسے کسی طرح واپس کردوں۔" اس نے کہا "تم کبھی شرپوزبری نہیں پہنچ سکتے، نہ آج نہ کل، نہ پرسوں۔ مجھے دیکھو میں شرپوزبری سے چلا آرہا ہوں اور جب سے چلا ہوں اتنے جوتے پہن چکا ہوں جتنے میرے کاندھے پر تھیلے میں رکھے ہوئے ہیں۔"

دیو :۔ افوہ، تب تو میں اس مٹی سے بھرے ہوئے پھاوڑے کو لے کر اتنی دور نہیں جا سکتا مجھے چاہئے کہ اسے یہیں پر گرا دوں اور اپنے گھر واپس چلا جاؤں۔"

اس نے مٹی کو وہیں گرا دیا اور اپنے جوتوں کو کھینچ کھینچ کر اس کے اوپر جو مٹی جم گئی تھی اُسے جھاڑ دیا تو جہاں پر اُس نے پھاوڑے کی مٹی الٹی تھی وہاں تو پہاڑ بن گیا اور جس جگہ اُس نے اپنے جوتوں کو کھینچا تھا وہاں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں بن گئیں۔

پہیلیاں

صلاح الدین، مونگیر

۱۔ باہر سے آوے موٹی، گھر میں ہو جاوے دبلی۔ [مشک]

۲۔ ایک پرکھ کا کالا رنگ۔ مُنہ رکھے وہ نار کے سنگ ٭ تریا پاس جو وہ کے آوے آکر اپنا ہاتھ جلا دے۔ [چمٹا]

۳۔ دن بھر لٹکے رات کو اٹکے۔ [زنجیر]

۴۔ یک آبخورے میں دو رنگ کا پانی۔ [انڈا]

۵۔ چھوٹا مُنہ بڑی بات۔ [توپ]

رنگ بھرو

غفلت کی نیند

بنیان - پیلا
نیکر - ہلکا ہرا
چہرہ، ہاتھ، ٹانگیں - ہلکا چاکلیٹی
پیام تعلیم - ہلکا نیلا
سوفا - ہلکا ہرا
تکیہ - گہرا ہرا

(جمال، آرٹسٹ)



پیام برادری

پیاری بچیو اور بچو! خوش رہو اور تندرست۔

پچھلے مہینے دلّی میں اور ملک کے دوسرے حصّوں میں بہت سخت گرمی پڑی۔ ہندوستان میں سب سے گرم جگہ جیکب آباد (سندھ) ہے۔ مئی کی آخری تاریخوں میں وہاں کا پارہ ۱۲۱ تک پہنچ گیا تھا۔ گرمی کا موسم ہمارے ہاں بہت تکلیف دہ موسم ہے۔ مگر ہماری تندرستی کے لئے بہت مفید ہے۔ بیماری کے بہت سے جراثیم پسینے کے راستے جسم سے خارج ہو جاتے ہیں۔ آندھیاں اور لوہ کے جھکڑ بہت سی بیماریوں کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ غرض قدرت نے ہر بات میں کوئی نہ کوئی فائدے کا پہلو ضرور رکھا ہے۔

ٹیونسیا کی فتح کے بعد لڑائی کا میدان کچھ ٹھنڈا سا پڑ گیا ہے۔ بہت دنوں تک تو امریکہ میں آئندہ منصوبوں کے بارے میں مشورے ہی ہوتے رہے۔ یہ ابھی معلوم نہ ہو سکا کہ انگلستان کے وزیر اعظم اور امریکہ کے صدر نے آئندہ کے لئے کیا پروگرام بنایا ہے۔ یورپ کے بہت سے اخباروں میں عام طور پر یہ خبر چھپی ہے کہ عنقریب مغربی یورپ لڑائی کا میدان بننے والا ہے بعض اخباروں نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ اس کی ابتدا بھی ہو گئی ہے۔ اٹلی پر جو مسلسل ہوائی حملے ہو رہے ہیں۔ بس یہی اس کی ابتدا ہے۔ امریکہ کے بعض اخباروں کا خیال ہے کہ جون کے مہینے میں اتحادی فوجیں اٹلی اور جرمنی کے خلاف پوری سرگرمی دکھائیں گی۔

اس لڑائی میں سب سے زیادہ نقصان اٹلی کا ہوا ہے۔ حبشہ اور اس کے علاوہ افریقہ کے تمام علاقے اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اس کی فوج کے لاکھوں سپاہی قید ہو گئے یا مارے گئے اور اب وہ براہِ راست اتحادی ہوائی حملوں کی زد میں ہے۔ اس کے سپاہی بودے ہیں۔ اس کے پاس لڑائی کا سامان اتنا اچھا نہیں ہے اور کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنی حفاظت بھی اچھی طرح نہیں کر سکتا، اگر جرمنی نے اس کی پوری پوری مدد نہیں کی تو یہ سخت مشکل میں پڑ جائے گا۔

ادھر جرمنی جیسے دم سادھے بیٹھا ہے اور اس انتظار میں ہے کہ اتحادی اب کدھر کا رخ کرتے ہیں۔ اتحادی ہوائی جہاز اس کے علاقوں پر برابر بم برسا رہے ہیں اور بہت کچھ نقصان پہنچا رہے ہیں مگر یہ نقصان ایسے نہیں ہیں جو اس کی کمر توڑ سکیں۔ اس کی بہت سی فوج روس کے میدان میں مصروف ہے۔ اور وہ دو میدانوں میں ایک ساتھ لڑنا نہیں چاہتا۔ باوجود اس کے اس نے یورپ میں بھی اپنی حفاظت کا سامان کر لیا ہے۔ اتحادی اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اسی لئے باوجود روس کے اصرار کے انھوں نے ابھی تک یورپ میں اس پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کی ہے۔

روسی لڑائی بھی ان دنوں کچھ ٹھنڈی سی پڑی ہے۔ ویسے روسی فوجوں کو جہاں کہیں موقع ملتا ہے جرمنی فوجوں کا بہت سخت مقابلہ کرتی ہیں اور اکثر انھیں پیچھے ڈھکیلنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ سنا ہے دونوں فوجیں غالباً ایک بڑے حملے کی تیاری کر رہی ہیں۔ یہ ٹکر شاید اسی مہینے میں ہوگی۔ اور بہت خوفناک ہوگی۔

پچھلے دنوں امریکہ سے یہ خبر آئی تھی کہ انگریز اور امریکن روس پر زور ڈال رہے ہیں کہ وہ انھیں سائبریا میں ہوائی اڈے بنانے کی اجازت دے دے تاکہ وہ جاپان پر قریب سے ہوائی حملے کر سکیں۔ معلوم نہیں روس نے اس کا کیا جواب دیا۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بات پر راضی نہ ہوگا۔ اس وقت وہ جرمنی جیسے دشمن سے الجھا ہوا ہے اور اب وہ ایک اور اہم طاقت کو اپنا دشمن نہیں بنائے گا۔ موجودہ حالات میں ایک ہی وقت میں دو دشمنوں سے لڑنا غالباً اس کے بس کی بات نہیں ہے۔

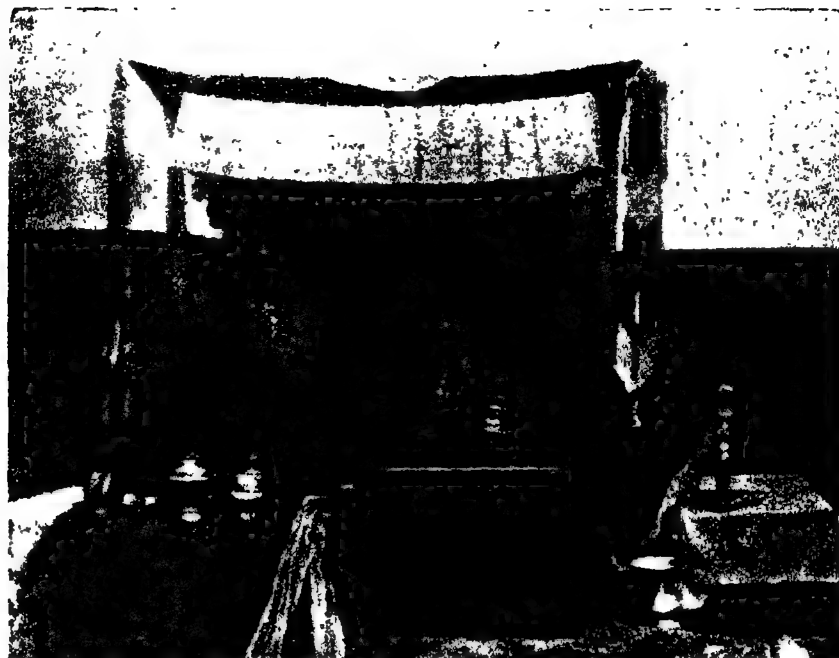
امریکہ میں ہڑتالوں کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ ان ہڑتالوں سے لڑائی کے کام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے امریکہ کے بعض دریاؤں میں سیلاب بھی آ چکا ہے۔ اس سے بہت سے آدمی گھر سے بے گھر ہو گئے ہیں۔

جاپان کی رفتار اب تک تیز ہے۔ آسٹریلیا پر ہوائی حملوں کا ذکر ہم پچھلے پرچے میں کر چکے ہیں اب وہ چین کے دارالخلافہ چنگکنگ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ کئی اہم جگہوں پر قبضہ بھی کر چکا ہے۔ ہندوستان کی سرحد پر بھی اس کے ہوائی حملے جاری ہیں سنا ہے اکتوبر تک وہ امریکہ پر حملہ کر دے گا۔

ہندوستان کی ہوائی طاقت بھی برما کی اہم جگہوں پر برابر حملے کر رہی ہے اور جاپانی ہوائی اڈوں اور لڑائی کے سامان کو بہت نقصان پہنچا رہی ہے۔ اکتوبر میں ہندوستان کے موجودہ وائسرائے کی مدت ختم ہو جائے گی۔ اب جنرل ویول جو مشرقی فوجوں کے کمانڈر تھے وائسرائے چنے گئے ہیں اور ان کی جگہ آچن لک کمانڈر ہو گئے ہیں۔

آج کل مسلم لیگی لیڈر مختلف صوبوں میں لیگی وزارتیں بنانے میں مصروف ہیں۔ بنگال، سندھ، سرحد میں انھیں کامیابی بھی ہوئی، بہار، سی پی اور مدراس میں کوششیں جاری ہیں۔ مہاتما گاندھی کے سلسلے میں مسلم لیگ کے قائد اعظم کا جو بیان شائع ہوا ہے اس کا ذکر ہم پچھلے پرچے میں کر چکے ہیں۔ مشہور کانگریسی لیڈر مسٹر راجگوپال اچاریہ نے اس بیان کے سلسلے میں لکھا ہے کہ بجائے اس بیان کے اگر مسٹر جناح ہندو مسلمان لیڈروں کی ایک کانفرنس بلاتے اور اس میں مسلمانوں کے مطالبات پیش کر دیتے تو یہ بہتر ہوتا۔

(محمد حسین حسان)



ایک چینی مہنت





گوشمال

Regd. No.L.1961



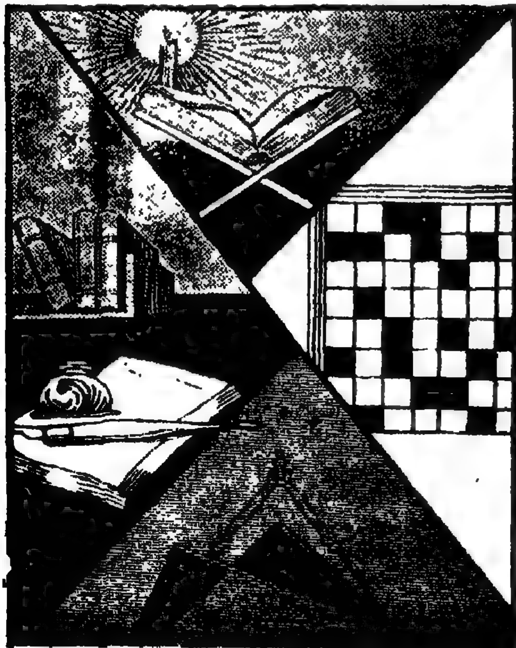
ڈاکٹر انصاری کی آخری آرامگاہ جامعہ نگر اوکھلا

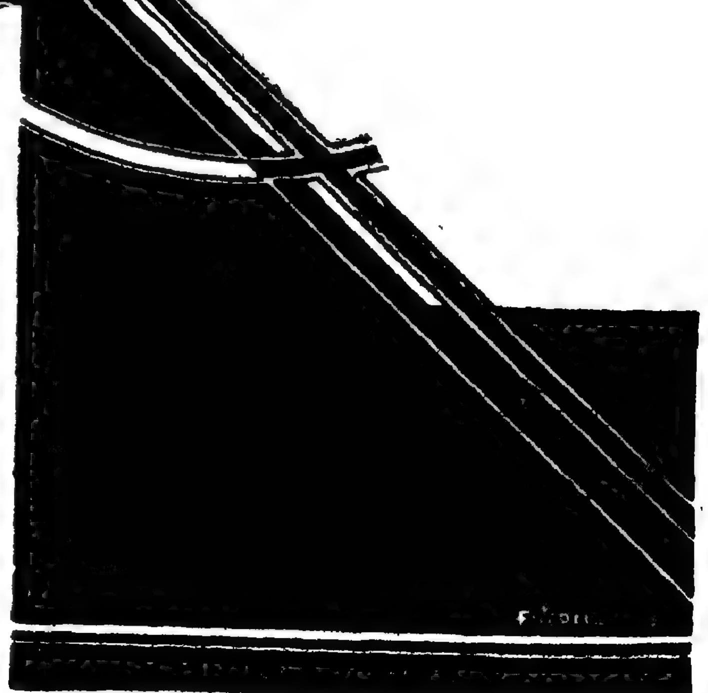
پیام تعلیم

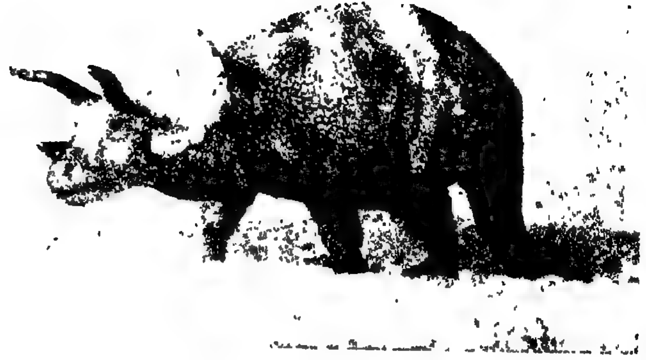
جولائی

۱۹۴۳

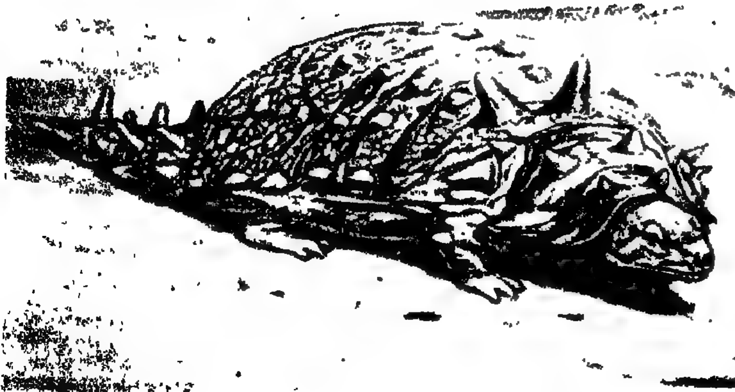








تصویر نمبر ۱ - یہ جانور **Triceratops** شمالی امریکہ میں کوئی ۹۰ ملین سال ہوئے پایا جاتا تھا یہ نباتات پر بسر کرتا تھا ۲۵ فٹ کے قریب لمبا ہوتا تھا اسکا سر ہاتھی کے سر کے برابر ہوتا تھا مگر اس میں مغز بلی کے بچہ کے مغز سے زیادہ نہ ہوتا تھا



تصویر نمبر ۲ یہ جانور **Scolosaurus** کناڈا میں کوئی ۹۰ ملین سال پہلے پایا جاتا تھا - معلوم ہوتا ہے کہ حملہ اور مدافعت دونوں کے لئے اسکا ہتھیار اسکی خار دار دم تھی



پیام تعلیم

دہلی، یوپی، سی پی، بہار، میسور، قلات، بنگال، رامپور، حیدرآباد، سندھ، کشمیر، پنجاب، بہار اور سرحد کے محکمہائے تعلیم کی طرف سے سرکاری طور پر منظور کیا گیا ہے۔

جلد ۲۶ — فہرست مضامین جولائی سنہ ۴۳ء — نمبر ۷

	مضمون	مصنف	صفحہ
۱	بچوں سے باتیں	ایڈیٹر	۱۹۴
۲	صالح کی تتلی	محمد شفیع الدین صاحب نیّر	۱۹۵
۳	کالا دیو	محمد شفیع الدین صاحب نیّر	۱۹۷
۴	بگ ڈنڈی کی کہانی	پروفیسر محمد عبد المنصور ایم اے	۲۰۲
۵	ہماری زمین	محمد حسین حسان	۲۰۶
۶	بچوں کی نظمیں	... ...	۲۱۰
۷	سائنس دانوں کی کہانی	سید نورالحسن ہاشمی	۲۱۲
۸	ہماری جائے قیام آگرہ		۲۱۵
۹	مؤجدوں کی کہانی	سید نورالحسن ہاشمی	۲۱۷
۱۰	رنگ بھرو	جمال آرٹسٹ	۲۱۹
۱۱	پیام برادری	... ...	۲۲۰
۱۲	معمّا	... ...	۲۲۲

قیمت سالانہ عہ/ فی پرچہ ۳/

ایڈیٹر: محمد حسین حسان

پرنٹر پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ محبوب المطابع پریس دہلی

بچّوں سے باتیں

پیام تعلیم کے پچھلے سالنامے کے بارے میں ہمارے پاس برابر رائیں وصول ہو رہی ہیں۔ پیامیوں کے علاوہ ملک کے اور بڑے بڑے لوگوں نے بھی اسے بہت پسند کیا ہے۔ بعض بزرگوں نے تو اس کی تعریف میں بہت مبالغہ کیا ہے۔ ہم ان سب کی حوصلہ افزائی کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

اب جولائی کا مہینہ شروع ہو گیا ہے۔ اگلے سالنامے کے لئے تجویزیں سوچی جا رہی ہیں۔ کچھ کچھ تیاری بھی شروع ہو گئی ہے، پیامی ہمیں مشورہ دیں کہ اگلے سالنامے میں وہ کیا چاہتے ہیں۔

اس پرچے میں پروفیسر محمد عبدالغفور صاحب کا ایک نیا مضمون شائع ہو رہا ہے۔ "پگڈنڈی کی کہانی" یہ اگلے پرچے میں ختم ہوگا۔ مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیّر نے "کالا دیو" والی کہانی چھوٹے پیامیوں کے لئے لکھی ہے۔ اُن کی نظم "صالح کی تتلی" بھی امید ہے کہ پیامیوں کو پسند آئے گی۔

رنگ بھرنے کی تصویریں پچھلے چند مہینوں سے پیام تعلیم میں چھپ رہی ہیں۔ پیامیوں نے اس کے بارے میں اپنی رائے نہیں لکھی۔ آؤ تصویریں بنائیں والے مضمون کے لئے اس پرچے میں گنجائش نہ نکل سکی۔ یہ اگلے پرچے میں چھپ سکے گا۔

ہماری زمین، سائنس دانوں کی کہانی، موجدوں کی کہانی کا سلسلہ کچھ دنوں اور چلے گا۔ پیامیوں نے یہ مضمون خاص طور سے پسند کئے ہیں۔

موجودہ حالات کی وجہ سے معمّے کے قاعدوں میں کچھ تبدیلیاں کر دی گئی ہیں۔ اُمید ہے کہ پیامی ان قاعدوں کو غور سے پڑھیں گے۔

اِس پرچے کا معمّا۔ معمّا بنانے والے صاحب نے بہت آسان اور دلچسپ بنایا ہے۔ اُمید ہے کہ پیامی پہلے کی طرح اب کے بھی اس سے زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیں گے اور بہت سے حل بھیجیں گے۔



صالح کی تتلی

محمد شفیع الدین صاحب نیرؔ

صالح باغ سے چل کر آئے
چھوٹے چھوٹے کیڑے لائے
رنگ برنگے کیڑے تھے سب
اچھے اچھے کیڑے تھے سب
یہ کیڑے کملے کہلاتے
بڑھ کر تتلی سب بن جاتے
صالح نے اک ڈبّا لے کر
جھنا سا اک کپڑا لے کر
ڈبّے میں کیڑوں کو رکھا
پھر اس پر وہ کپڑا باندھا
اندر کچھ پتے بھی رکھے
یہ پتے کیڑوں نے چکھے



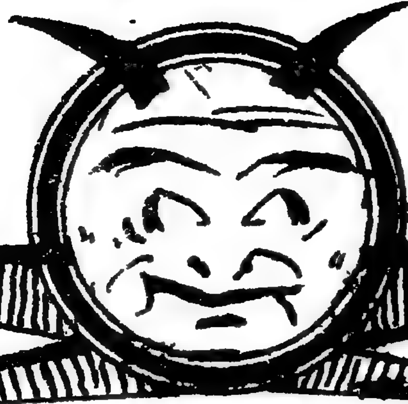


کھا کھا کر موٹے بن بن کر
تھوڑے ہی دِن میں تن تن کر
کیڑے اَور ڈبتے میں لٹکے
بن گئے کیڑے مومؔ کے مٹکے
کھانا پینا سب نے چھوڑا
چارے سے مُنہ اپنا موڑا
خول میں چُھپ کر بیٹھے ایسے
ڈھول میں کوئی لیٹے جیسے
پھر کچھ دن میں پر چمکائے
جھم جھم جھم جھم پر جھمکائے

ہر ہر خول سے نکلی تتلی
ہر ہر ڈھول سے نکلی تتلی
اس تتلی کا کیا کہنا تھا
رنگ برنگا پھول کھلا تھا
صالح نے تتلی کو پکڑا
اُلٹا پلٹا دیکھا بھالا
تتلی نے پھر پر پھیلائے
چاہا اُڑ کر باغ میں جائے
اُڑ گئی تتلی موقع پا کر
رہ گئے صالح ہاتھ بڑھا کر



کالا دیو



محمد شفیع الدین صاحب نیر

بہت دن ہوئے ایک گاؤں میں ایک لڑکی رہا کرتی تھی، اس لڑکی کا نام تارا تھا۔ تارا کی عمر ۵، ۶ سال سے زیادہ نہ تھی وہ بڑی پیاری بچی تھی۔

اس چھوٹی سی عمر میں وہ روز اپنے مدرسے جاتی، اپنی پڑھائی لکھائی کا کام بڑے شوق سے کرتی اور اپنے بڑوں کا کہا بڑی خوشی سے مانتی۔ اسی لئے وہ سب کی پیاری تھی، اس کے گھر کے صحن میں ایک پرانا پیڑ تھا، اس پیڑ پر ایک دیو رہا کرتا تھا۔ یہ دیو بہت کالا تھا، اس لئے اس کا نام کالا دیو پڑ گیا تھا۔ یہ دیو بہت برا اور شریر تھا۔ وہ بچوں کو ڈرایا کرتا تھا۔ تارا بہادر بچی تھی، وہ اس سے ذرا بھی نہ ڈرتی



تھی۔

ایک دن کیا ہوا، اُس دیو کو بھوک لگی۔ بھوک نے اُسے بے چین کر دیا۔ وہ نیم کے پیڑ سے صحن میں اُترا اور سیدھا تارا کے کمرے کی طرف چلا۔

تارا ابھی پڑھ لکھ کر اُٹھی تھی۔ اب وہ سینے پرونے کا کچھ کام کرنا چاہتی تھی کپڑا، سوئی دھاگا اور سینے پرونے کی سب چیزیں اُس کے پاس پڑی تھیں اُس نے کالے دیو کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تارا نے اس دیو کا نام تو کئی بار سنا تھا مگر اس سے پہلے کبھی دیکھا نہ تھا۔

وہ اُسے دیکھ کر پہلے تو ذرا گھبرائی، پھر ہمت کر کے آگے بڑھی اور کڑک کر بولی: "تو کون ہے۔ اور میرے کمرے میں کیوں آ رہا ہے؟"

کالا دیو بولا: "میں کالا دیو ہوں۔ میں اسی گھر کے صحن میں رہتا ہوں نیم کے پرانے درخت پر۔ آج مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے مجھے کھانا کھلا دو۔ میں تمھارا بڑا احسان مانوں گا۔"

تارا کو دیو پر ترس آ گیا۔ اُس نے کہا: "اچھا کمرے میں ایک طرف بیٹھ جا، میں تیرے لئے ابھی کھانا لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دوڑتی ہوئی باورچی خانے میں گئی اور کچھ کھانا تھالی میں لگا کر لے آئی۔ کچھ پوریاں تھیں، کچھ کچوریاں، کچھ پھلکے تھے، کچھ پراٹھے، کئی طرح کی ترکاریاں تھیں۔ آلو کی، گوبھی کی ٹماٹر کی اور مولی گاجر کی۔ کچھ اچار تھا اور کچھ چٹنی تھی۔ ایک رکابی میں کچھ مٹھائی بھی تھی۔ تھالی کے ایک طرف پانی سے بھرا ہوا ایک گلاس بھی رکھا تھا اس نے یہ سب چیزیں کالے دیو کے آگے رکھ دیں۔

تارا اتنا کھانا لائی تھی کہ ایک کیا کئی آدمی اُسے پیٹ بھر کر کھاتے، پر دیو ذرا سی دیر میں اس سارے کھانے کو چٹ کر گیا کھانے پینے کے سب برتن آن کی آن میں خالی ہو گئے، یہ دیکھ کر تارا آئی۔ وہ برتن اُٹھا کر لے جانے لگی۔ دیو بولا: "تارا میرا پیٹ ابھی تک نہیں بھرا۔ مجھے تھوڑا سا

کھانا اَور دو۔ مَیں تمھارا بڑا احسان مانوں گا۔"

تارا گئی۔ وہ اتنا ہی کھانا پھر لے آئی، جتنا پہلے لائی تھی۔ پوریاں کچوریاں پھلکے، پراٹھے، طرح طرح کی ترکاریاں

میں یہ سارا کھانا چٹ کر گیا اَور کھانے پینے کے سب برتن آن کی آن میں پھر خالی ہو گئے۔ یہ دیکھ کر تارا پھر آئی اَور برتن اُٹھا کر لے جانے لگی۔ دیو بولا: "تارا مَیں تو ابھی بھوکا ہوں، مجھے تھوڑا سا



چٹنی، اچار سبھی کچھ تھا۔ تھالی کے ایک طرف پانی سے بھرا ہوا پیتل کا ایک گلاس بھی رکھا تھا۔ اس نے یہ سارا کھانا پھر دیو کے آگے رکھ دیا۔ دیو پھر ذرا سی دیر

کھانا اَور دو؛ مَیں تمھارا بڑا احسان مانوں گا۔"

تارا بڑی اچھی بچی تھی، وہ پھر گئی گھر میں جتنا کھانا باقی رہ گیا تھا وہ بھی لے آئی

اُس نے پہلے کی طرح یہ سارا کھانا بھی دیو کے آگے رکھ دیا، دیو یہ کھانا بھی بات کی بات میں چٹ کر گیا اور کھانے پینے کے سارے برتن آن کی آن میں خالی ہوگئے کالے دیو کا پیٹ اب اچھی طرح بھر گیا۔ مگر وہ بُرا اور شریر تھا۔ اُس نے اپنے دل میں یہ بات سوچی کہ لاؤ تارا کو ذرا دِق کروں۔ تارا برتن اُٹھانے آئی تو ہنس کر بولا: "تارا میں تو اب بھی بھوکا ہوں۔"

تارا نرمی سے بولی: "بھوکے ہو تو کہیں اور جاؤ۔ یہاں تو اور کھانا نہیں ہے۔ گھر کا سارا کھانا ختم ہوگیا، کچھ بھی باقی نہیں رہا۔" تارا کی یہ بات سُن کر دیو ناحق بگڑنے لگا۔ لال پیلا ہوکر بولا: "تم نے مجھے اور کھانا نہ دیا تو میں تمھیں کھالوں گا۔"

یہ بات سن کر تو تارا کو بھی تاؤ آگیا۔ بولی: "چل دور ہو یہاں سے آیا ہے کہیں سے مجھے کھانے والا! اب تو تجھے ایک نوالہ بھی نہ دوں گی۔ اپنا رستہ لے چلتا پھرتا نظر آ۔"

تارا کی یہ بات سُن کر کالا دیو جل گیا اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ آنکھیں مارے غصے کے لال انگارا ہوگئیں۔ وہ آگے بڑھا کہ تارا کو پکڑے اور جاکر کچا کھاجائے۔

کالے دیو کو اپنی طرف آتے دیکھ کر تارا بھاگی۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں جاکھڑی ہوئی۔ اس کونے میں ایک موٹا ڈنڈا رکھا تھا، اُس نے جھٹ پٹ وہ موٹا ڈنڈا اُٹھالیا۔ دیو نے اُسے پکڑنے کے لئے اپنا سیدھا ہاتھ بڑھایا۔ تارا نے وہی موٹا ڈنڈا بڑے زور سے مارا۔ یہ ڈنڈا دیو کی کلائی پر پڑا۔ اُس کے سیدھے ہاتھ کی کلائی اُسی وقت ٹوٹ گئی۔

اب تو دیو کو اور بھی غصہ آیا اُس نے تارا کو پکڑنے کے لئے اُلٹا ہاتھ بڑھایا۔ تارا

نے پھر وہی ڈنڈا بڑے زور سے مارا - یہ ڈنڈا بھی اُس کی کلائی پر پڑا - اُس کے اُلٹے ہاتھ کی کلائی بھی اُسی وقت ٹوٹ گئی - اب تو وہ آپے سے باہر ہو گیا - اُس نے گرج گرج کر اور کڑک کڑک کر تارا کو ڈرایا مگر وہ ذرا بھی نہ ڈری وہ اپنی جگہ پر اُس کے سامنے ڈٹی کھڑی رہی دیو نے اب اپنا منہ آگے بڑھایا کہ اُسے پکڑ کر کھا جائے - تارا بھی شیرنی کی طرح غصے میں بھری ہوئی کھڑی تھی - وہ آگے بڑھی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کا زور لگا کر وہ ڈنڈا دیو کے سر پر مارا - ڈنڈے کی چوٹ سے دیو کا سر پھٹ گیا - اب تو وہ بھی چکرایا ہلے ہلے کرتا دُم دبا کر بھاگا - تارا بھی ہاتھ میں ڈنڈا لیے اُس کے پیچھے دوڑی - مگر وہ اُس کے ہاتھ نہ آیا - کالا دیو تارا کے ڈنڈے سے کچھ ایسا ڈرا کہ اُس دن سے اُس نے تارا کے گھر میں رہنا ہی چھوڑ دیا +





پگ ڈنڈی کی کہانی

پروفیسر محمد عبدالغفور ایم اے
علی گڑھ

رائے پتھورا کے قلعہ کی پگ ڈنڈی آج دوپہر کے سورج میں کچھ بے طرح جل بھن رہی تھی۔ اور غصے میں زمین پر لوٹ رہی تھی۔ اتنے میں پاس کی صاف شفاف تارکول کی سڑک پر زن سے ایک موٹر گزر گئی سڑک پر سے کچھ گرد اٹھی اور پگ ڈنڈی پر بیٹھ گئی اب یہ تو وہ اور بھی جھلا اٹھی۔ جی تو چاہا کہ بہت سی گرد اڑا کر سب کی سب سڑک پر ڈال دے مگر کیا کرتی۔ جب سے یہ سڑک بنی ہے گرد اڑانے والے کاروان ادھر کا رخ ہی نہیں کرتے۔ بے چاری مجبور ہو کر بیٹھ رہی۔ اور کچھ نہ ہو سکا۔ تو جل کر کہنے لگی "ارے کل مونہی تو کل کی چھوکری میری برابری کرنے لگی"۔ اس چھچھوری سڑک پر تو اس پرانے برگد کو بھی اکثر تاؤ آجاتا تھا جو اننگ پال کے زمانے سے پگ ڈنڈی کے کنارے اُگا ہوا تھا۔ اس وقت بھی بڑے دادا کی گھنی داڑھی میں ہوا سرسرائی۔ جیسے غصے میں ان کی داڑھی کے بال کھڑے ہونے کو ہیں۔ جھلا کے پگ ڈنڈی سے بولے "دادی اماں بھلا تم بھی اس کی باتوں کا خیال کرتی ہو اس نے تمہارے وہ دن کاہے کو دیکھے ہیں۔ جب تم پر علاء الدین خلجی کا وہ شاہی جلوس نکلا تھا جس میں سونے اور چاندی کے سکے گو بھنوں میں بھر بھر کے بادشاہ کے سر پر نچھاور کئے جا رہے تھے اور تمہاری بھربھری سطح پر مقیش کی کترنیں یوں جگ مگ کرتی تھیں، جیسے آسمان پر کہکشاں۔ ان دنوں تو میں بچہ ہی تھا۔ اور جب جلوس کے گھوڑے میرے پاس سے گزرتے تھے تو میں اپنے آپ کو کتنا چھوٹا محسوس کرتا تھا۔ مگر دادی اماں تمہارے سر کے بال تو جب بھی سفید ہو چلے تھے۔ خدا جانے تم نے کیا کیا دیکھا ہے۔" اس پر پگ ڈنڈی نے ٹھنڈی سانس لی اور کہنے لگی ؎

ان تینوں کا یہی سبکھ + وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

بیٹا تم نے مسلمانوں ہی کا عہد پایا مگر میں جنم جلی تو خدا جانے کے ہزار سال سے دلّی کا بننا اور بگڑنا دیکھتی آئی ہوں۔ اور اب تو اتنا کچھ دیکھ چکی کہ اس کے عروج و زوال سے دل گھبرا سا گیا۔ کبھی کبھی جی چاہتا

ہے کہ اس کی پرانی عظمت کی طرح میں بھی کہیں زمین کے نیچے منہ چھپا لوں۔ مگر مجھ کم بخت کو تو منہ چھپانے کے لئے بھی جگہ نہیں ملتی۔ ایک زمانہ میں نے وہ بھی دیکھا ہے جب پانڈو جنگلوں کی خاک چھانتے ہوئے آئے۔ راج پاٹ سے ٹھکرائے ہوئے بھائیوں کے نکالے ہوئے، کہیں سر چھپانے کو جگہ نہ ملتی تھی کہتے ہیں کہ انھوں نے یہیں آکر اطمینان کا سانس لیا اور ایک خوب صورت شہر اندر پرست کی بنیاد رکھی۔ اس شہر کے گن تو مہا بھارت کے کوی نے گائے ہیں۔ کہتا ہے کہ "اس کی خندق ایسی چوڑی ہے جیسے کوئی سمندر ہو۔ اس کی دیواریں آسمان کو چومتی ہیں۔ اس کے دروازے پہاڑ جیسے اونچے اور بادلوں کے سے عظیم الشان ہیں"۔ مگر یہ باتیں تو مجھ سے بھی پہلے کی ہیں۔ اس زمانے کی ہیں جب انسانی تہذیب کی کرنیں پہلے پہل اندھیرے میں سے پھوٹ نکلی تھیں۔ میرے لئے تو یہ سب سپنے کی سی باتیں ہیں۔ جب میں نے آنکھ کھولی ہے اس وقت تو اندر پرست کی جگہ ایک گاؤں تھا جس کا نام اندر پت تھا، پت کے نام پر تو کئی ایک اور شہر بھی تھے، جیسے پانی پت، سونی پت وغیرہ مگر اس کے بسنے کی جگہ میں جو بات تھی وہ دوسروں میں کہاں یہ تو قدرتی طور پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی قلعہ۔ ایک جانب تو دریائے جمنا کی خندق پانی سے

لبالب بھری ہوئی اور مغرب میں رج (RIDGE) کی قدرتی فصیل۔ یہ سچ نہیں۔ اراولی پربت شمال کی طرف اپنے بھائی ہمالیہ سے ملنے کے لئے جیسے ہمک رہا ہے۔ اور اسی ہمک سے رج بن گئی ہے۔ اور پھر دریائے جمنا یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ہندوستانی لوگ دریاؤں سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ اگر ہو سکے تو سب کے سب دریاؤں کے کنارے ہی بس جائیں ہر روز اشنان اور پوجا پاٹ کریں۔ پھر پرانے زمانے میں جمنا اتنا کاہل اور سست بھی نہ تھا کہ بس ہر وقت زمین پر پڑا اینڈتا ہے۔ اس کے رستے تجارت ہوتی تھی اور خوب ہوتی تھی، کشتیاں چلتی تھیں اور پھر دریا تو اکثر سلطنتوں کی سرحد کا کام دیتے تھے، جمنا بھی کسی زمانے میں دو ریاستوں کے درمیان حد فاصل رہا ہوگا۔ آج کل بھی پورب کے کنارے سے یو پی شروع ہو جاتا ہے اور پچھم سے پنجاب اور دہلی۔ اچھا بتاؤ؟ سرحد کی حفاظت کیسے ہوتی ہے؟ چھاؤنیاں بسائی جاتی ہیں! قلعے بنائے جاتے ہیں۔ دہلی جیسی بکرسی بہتر قلعہ یا چھاؤنی کہاں بن سکتی ہے۔ اسی لئے تو یہ شہر خوب پھلا پھولا ہوگا۔ مگر مجھے تو جب ہوش آیا تو دہلی کو اندر پرست نہیں کہتے تھے، دہلی کہتے تھے۔ اس پر بڑلو لا:- "وادی اماں! یہ پرانے لوگ بھی کیسے عجیب تھے دہلی بھی کوئی نام ہے۔ دیوتا اندر کے نام پر اندر پرست

سکھا خوب رکھا شاہجہان کے نام پر شاہجہاں آباد رکھا۔ کیسا پیارا نام ہے۔ مگر یہ دہلی کیا نام ہے۔ ڈھیلی ڈھیلی" یہ کہہ کر برگد میاں ہنسنے لگے اور مارے ہنسی کے اُن کی ٹہنیاں تڑخ تڑخ کرنے لگیں۔ بگ ڈنڈی بولی "چھی چھی اتنے بوڑھے ہوگئے پھر بھی بچے ہی رہے۔ تم اس نام کی ہنسی نہیں اُڑا رہے اپنی ہنسی اڑا رہے ہو۔ دیکھو یہ نام کسی راجہ مہاراجہ کے نام پر نہیں رکھا گیا ہے یہ نام تو تمھاری خالہ اماں کے نام پر رکھا گیا ہے اور تم ہو کہ یوں کھڑے دانت نکال رہے ہو۔ ارے اپنی خالہ اماں کو جانتے ہو۔ وہ دیکھو ادھر لوہے کی لاٹھ نظر آرہی ہے نا۔ یہی تمھاری خالہ اماں ہیں۔ ہم پرانے زمانے کی برادری کے لوگوں میں تمھی تو سب سے چھوٹے ہو تو دیکھو اسی لاٹ کی وجہ سے تو ہمارے شہر کو دہلی کہتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ سکندر اعظم سے پہلے تنوار خاندان کا ایک راجہ تھا اس کا نام دہلو تھا۔ یہ لاٹ اسی نے لگوائی تھی، لوگ کہتے تو ہیں لوہے کی لاٹ ہیں مگر یہ لوہے کی ہے نہیں بلکہ کئی ایک دھاتوں سے ملا کر بنائی گئی ہے۔ کتنی بھاری بھرکم، کتنی عظیم الشان اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے ملک میں دھات کا کام کرنے والے کتنے اچھے کاریگر تھے اور آج تو اگر ایک پیچ بھی بنانا ہو تو ٹھنڈے کسی باہر کے دیس کو سدھاریئے اور وہاں کسی کارخانے کو آرڈر دے کر بنوائیے۔ کہتے ہیں کہ جب یہ لاٹ گاڑی گئی۔ تو ایک برہمن نے راجہ سے کہا کہ اسے اچھی طرح گاڑنا۔ اگر یہ گڑ گئی تو یوں سمجھو کہ تمہارے تنوار خاندان کا جھنڈا بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گڑ گیا۔ اتنا ٹھونکو، اتنا ٹھونکو کہ سیدھی شیش ناگ پر جا کر ٹک جائے۔ وہ شیش ناگ جس کے پھن پر پوری دنیا ٹکی ہوئی ہے۔ لاٹ گڑ گئی۔ لیکن راجہ کو اطمینان نہ ہوا۔ بار بار جی میں کہتا تھا معلوم نہیں، شیش ناگ کے پھن پر جا کر ٹکی بھی ہے یا نہیں۔ راجہ کیا تھا جیسے پہلی جماعت کا بچہ تھا۔ جس نے آج تو اپنی کیاری میں ایک پودا لگایا اور کل ہی اُسے اکھاڑ کر دیکھ رہا ہے کہ اچھی طرح سے جڑا بھی ہے، یا نہیں۔ جی میں آیا کہ لاؤ ذرا برہمن کی بات کو آزما کر تو دیکھیں۔ لاٹ کو اکھڑوا دیا، تو دیکھا۔ اس کی جڑ میں شیش ناگ کا خون لگا ہوا تھا اب تو راجہ گھبرایا اور حکم دیا کہ جلدی سے اُسے جوں کا توں پھر گاڑ دو۔ مگر بھلا ایک دفعہ کی اکھڑی ہوئی چیز دوبارہ ویسے ہی کہیں جمتی ہے؟ راجہ کو بہت افسوس ہوا اور اس کے ساتھ جگ ہنسائی بھی ہوئی۔ لوگوں نے عجیب عجیب دوہے ان کے متعلق بنا ڈالے اور بات تھی بھی کم عقلی کی ان میں سے ایک دوہا مجھے یاد رہ گیا ہے

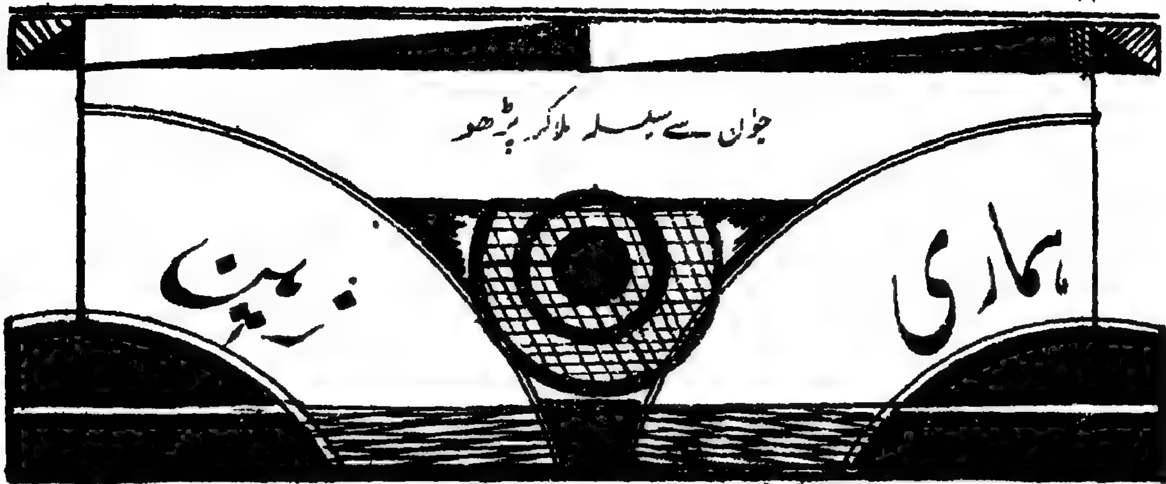
کلی تو ڈھیلی بھئی تنوار بھیا مت ہیں۔

یعنی لاٹ توڈھیلی ہوگئی ، اور تنوار خاندان کی بے وقوفی کا چرچا دنیا بھر میں ہوگیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ دہلی کا نام وہیں سے نکلا ہے"۔

اس پر پرگُز بولا " دادی اماں تم کس دلّی کے قصے سنا رہی ہو، ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا دہلی کے اور ہی نام سنے سیری، کیلوکھڑی تغلق آباد اور خدا جانے کیا کچھ۔ تم کون سی دلّی کا ذکر کر رہی ہو؟

اس پر بگ ڈونڈی بولی " بیٹا جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش تمھیں بھلا پُرانی دلی کا کیا پتہ وہ دلی جسے خلجیوں کے زمانے میں بھی لوگ پرانی دلی کہتے تھے۔ تم تو کل کے بسے ہوئے شہروں کی باتیں کر رہے ہو۔ یہ شہر تو اِس دلّی کی بنیادوں بلکہ اکثر اس کے ستونوں پر اُٹھائے گئے اس کے اینٹ اور ملبے سے نئے محل اور نئے قلعے تعمیر ہوئے۔ ابھی کل تم نے کلّو کمہار کے لونڈے کو نہیں دیکھا کیسی کیسی پُرانی زمانے کی اینٹیں اُکھاڑ کر گدھے پر لادے لئے چلا جا رہا تھا۔ جانتے ہو یہ اینٹیں کب بنیں۔ چوتھی صدی عیسوی میں! اِنہی سے تو پُرانا اندر پرست کا قلعہ بنا ہوگا۔ پُرانے قلعہ کے برابر اندر پرست گاؤں تک تو میں اکثر بھولے بھٹکے مسافروں کو پہنچا دیا کرتی ہوں۔ یہ اندر پت اندر پرست ہی کے نام پر ہے۔ اس لئے انجان لوگ پُرانے قلعے کو اکثر کوروں، پانڈوں کا قلعہ بھی کہہ دیتے ہیں بھلا اس زمانے کی کوئی عمارت آج تک کہاں رہ سکتی ہے۔ یہ قلعہ تو پُرانے زمانے میں تنوار خاندان کے راجہ اننگ پال نے بنایا تھا اصلی عمارت کا تو نام ونشان باقی نہ رہا۔ ہاں جب ہمایوں بادشاہ ہوا تو اس نے نئے سرے سے اس کی تعمیر کرائی۔ بعد میں شیر شاہ نے بھی یہیں سے پورے ہندوستان پر حکومت کی

(باقی آیندہ)



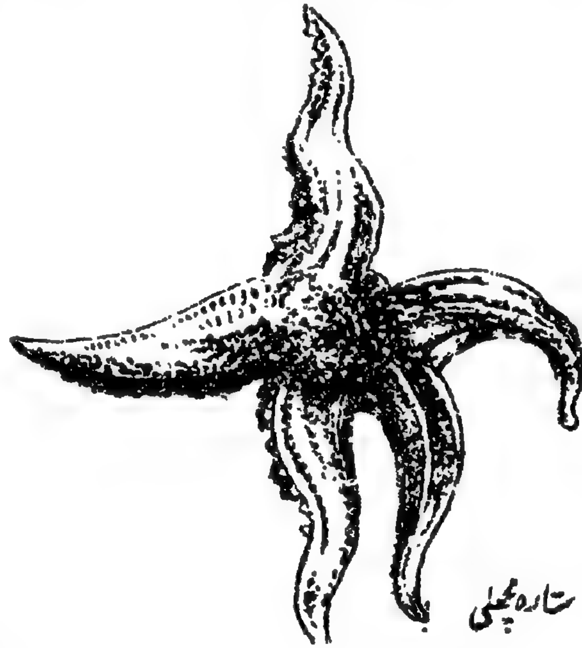
ظہر کی نماز کے بعد میں پڑھنے کے کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ پیام تعلیم کے لئے ایک مضمون لکھنا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ شروع کیسے کروں، اتنے میں واجد صاحب تشریف لے آئے۔ میں نے انھیں ٹالنے کی غرض سے کہا " بھئی اب کل ہماری تمھاری باتیں ہوں گی۔ اس وقت ایک ضروری کام کرنا ہے " واجد میاں بہت خوشامد کرنے لگے دیکھو پیارے بھائی کل تو ہم مدرسے جائیں گے۔ آج ہماری چھٹی ہے، یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ماموں صاحب بھی مسکراتے ہوئے تشریف لے آئے۔ انھوں نے واجد میاں کی باتیں سن لی تھیں، کہنے لگے " ہاں، ہاں بھئی آج ہماری بھی چھٹی ہے۔ تم اپنا کام کل کر لینا۔ اب میرے سے انکار کی کوئی صورت نہیں " واجد میاں بہت خوش ہوئے کہ پالا مار لیا کہنے لگے ہاں پیارے بھائی آپ اس وقت کیا کر رہے تھے۔ کچھ آدمی کا ذکر تھا، ماموں صاحب نے فرمایا " ہاں، ہاں میں نے پوچھا تھا کہ انسان نے دنیا کے اس ویرانے کو کب سے گلزار بنایا، یعنی انسان اس پر کب سے آباد ہوا " میں نے کہا " ایسی باتیں یقینی طور پر تو کوئی نہیں بتا سکتا، پھر بھی بہت کچھ غور و خوض اور سوچ بچار کے بعد سائنس والوں نے کچھ ایسے طریقے نکالے ہیں کہ جن سے کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جاتا ہے (کچھ سوچ کر) دیکھئے ویسے شاید آپ کی سمجھ میں نہ آئے۔ میں ایک مثال سے سمجھاتا ہوں۔ مصر میں ایک دریا ہے، دریائے نیل، شاید آپ نے بھی اس کا نام سنا ہو۔ مصر میں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ کھیتی باڑی کا دار و مدار اسی دریا پر ہے۔ اس میں سال کے سال سیلاب آتا ہے۔ اسی کا پانی روک کر کسان اپنے کھیتوں کو سینچتے ہیں۔ یہ سیلاب ہر سال ایک انچ سے بھی کچھ کم مٹی کی..... تہہ زمین پر چھوڑ جاتا ہے۔ اب اگر مصر کی زمین کو ایک فٹ کھودا جائے تو نیچے سے کوئی پانسو برس پہلے کی چیزیں نکلیں گی، اسی طرح چار فٹ کھودا جائے تو دو ہزار برس پہلے کی چیزیں دیکھنے کو ملیں

گی۔ اور ہمیں اس زمانے کی بہت سی باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ واجد میاں بولے "ارے! اُف فوہ!! کیا کیا چیزیں ہوں گی۔ پیارے بھائی ذرا بتا دیجئے" اس وقت حبیب میاں اپنے ابا جی کے پاس کھڑے ریوڑیاں کھا رہے تھے۔ اُنھیں واجد میاں کے پوچھنے کا یہ انداز ذرا دلچسپ معلوم ہوا، اور بالکل انھی کی طرح مُنھ پھیلا کے یہ کہتے ہوئے بھاگے "جلد بتا دیجئے پیارے بھائی" سب کو بے تحاشا ہنسی آگئی۔ واجد میاں لال پیلے ہوگئے۔ عائشہ بی نے ہنس کر کہا "تو تم کیوں بات بات پر پھاڑ کی طرح مُنھ پھیلاتے ہو" میں نے کہا "واجد میاں یہ سب تو یوں ہی ہیں۔ تم ہماری باتیں سُنو۔ ہاں تم چیزوں کو پوچھ رہے تھے تو بھئی چیزیں کیا بس یہی جیسے سکّے یا روپے پیسے، طرح طرح کے ہتھیار اور استعمال کے برتن وغیرہ، ان چیزوں سے ہمیں کچھ نہ کچھ تو اندازہ ہو جائے گا کہ اب سے دو ہزار برس پہلے لوگ کس طرح رہتے تھے اور کیوں کر زندگی گذارتے تھے۔

مصر کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی اسی طرح زمین کھودنے سے ہمیں بہت کچھ معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ مٹی کی تہہ ہر جگہ ایک سی نہ ہوگی، کہیں کم ہوگی، کہیں زیادہ۔ کہیں کہیں یہ تہیں اُلٹ پلٹ بھی ہو گئی ہیں۔ زلزلوں آگ پھینکنے والے پہاڑوں اور خود زمین کے اندر کی مختلف حالتوں نے انھیں توڑ پھوڑ دیا ہے۔ کہیں کہیں تو یہ صورت ہوئی ہے کہ اوپر کی تہہ نیچے چلی گئی ہے اور اوپر کی نیچے آگئی ہے۔" ماموں صاحب نے کہا "پھر تو اس سے اندازہ لگانے میں بھی بڑی دقت ہوتی ہوگی۔" میں نے کہا "جی نہیں بہت سہولت ہو گئی ہے۔ اگر یہ تہیں ترتیب سے رہتیں تو بے شک بہت دقت ہوتی۔ اور شروع بالکل شروع کی باتیں معلوم کرنے کے لئے سو میل سے بھی کہیں زیادہ نیچے کھودنا پڑتا۔" ماموں صاحب نے فرمایا "ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "اور اب تھوڑا سا کھودنے پر اکثر نیچے کی تہیں مل جاتی ہیں۔"

واجد میاں کا غصّہ کچھ اُتر گیا تھا اور ہماری باتیں دلچسپی سے سُننے لگے تھے۔ کہنے لگے "پہلے بھائی آپ ادھر ادھر کی باتیں کر رہے ہیں۔ آدمی والی بات نہیں کہتے۔" میں نے کہا "تم سُنتے تو جاؤ! زمین کا بہت کچھ حال انھی تہوں کے دیکھنے سے معلوم ہوا ہے۔ اور اسی کے ذریعے سائنس والوں نے زمین اور زمین پر رہنے بسنے والوں کی تاریخ کا پتہ چلانے کی کوشش کی ہے۔ آدمی تو خیر آدمی لاکھوں سال تک تو زمین پر کسی قسم کی ہریالی تھی نہ کوئی جان دار مخلوق۔ کیڑے مکوڑے تک نہ تھے۔ پھر آہستہ آہستہ سمندر کی تہہ میں بہت ہی باریک باریک کیڑے پیدا ہونے لگے۔ پھر لاکھوں سال بعد

بعد کیچوے اور ایک مچھلی کے پیدا ہونے کی نشانیاں ملتی ہیں۔ اس مچھلی کو ستارہ مچھلی کہتے ہیں۔ پھر لاکھوں برس بعد پودوں جیسی شکل کی مچھلیاں اور سمندری کیڑے مکوڑے پیدا ہوئے۔" واجد میاں حیران ہو کر بولے " پیارے بھائی پودوں جیسی مچھلیاں کیسی ہوتی ہوں گی؛ اور کیچوے وہی ہیں جنھیں مچھلی کے کانٹوں میں لگا کر مچھلی پکڑتے ہیں"، عائشہ بولیں " تو کیوں پیارے بھائی تو یہ آج کل کیچوے انھی پرانے کیچوؤں کی اولاد ہوں گے" میں نے کہا: " اب ان کی اصل نسل اور حسب نسب کی تحقیقات تم کرو۔ ہاں تو بھئی واجد صاحب اس کے کچھ دنوں بعد زمین پر گھاس پھوس نے اپنی صورت دکھائی اور ایک خاص پودا بھی پیدا ہوا اُسے فرن کہتے ہیں۔ ماموں صاحب نے پوچھا" اور کیوں بھئی یہ کچھ دنوں بعد کا مطلب بھی لاکھوں برس ہوگا" میں نے کہا" جی اور کیا اور جب زمین پر اس ہریالی کا فرش بچھ گیا تو اللہ میاں نے کچھ چرند بھی پیدا کیے۔ یہ اس نباتات کو کھا کر اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ ان چرندوں کے بعد درندے بھی پیدا کیے۔ یہ ان چرندوں کو اپنی خوراک بناتے تھے۔ غرض جنگل تو جیسے تیسے آباد ہوا۔



ستارہ مچھلی

اسی زمانے میں یہاں سے بہت دور (شمالی امریکہ میں) ایک بہت ہی زبردست اور ہیبتناک درندہ پایا جاتا تھا۔ واجد میاں اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں نکال کے اور نتھنے پھلا کے بہت ہی سہمے ہوئے انداز میں بولے " پیارے بھائی کیسا جانور ہوتا ہوگا وہ؟" میں نے کہا " اچھا تم نے لکھنؤ چڑیا گھر میں مگرمچھ تو دیکھا ہے کہتے ہیں اس درندے کی شکل مگرمچھ سے ملتی جلتی تھی۔

اچھا دیکھو میرے بستر میں تکیے کے نیچے ایک خوب صورت سی کتاب ہے اس پر ایک لمبا سا درخت بنا ہوا ہے اور سیدھے ہاتھ کو پیلے رنگ میں چاند کی تصویر ہے۔ ہاں ہاں یہی۔ اور ہاں یہ تو میں نے تمھیں بتایا ہی نہیں کہ زمین کی اس نئی زندگی میں پرندے بھی پیدا ہونے لگے۔ مگر کیسے بالکل

دیو کے۔ دیو تو نو گز کے تو ان کے پر ہوتے تھے۔ ہاں
دیکھو یہ تصویریں ہیں مگر یہ بس تھوڑے سے جانوروں
کی ہیں۔ دیکھو اس (۱) جانور کی شکل کیسی ہیبتناک
ہے۔ یہ کوئی تین گز اونچا اور سوا آٹھ گز لمبا ہوتا
تھا۔ اس کے تینوں سینگ کئی فٹ لمبے ہوتے
تھے۔ یہ گھاس پات کھاتا تھا اور جناب اس کی مادہ
انڈے دیتی تھی۔ بہت بڑے بڑے انڈے۔

تصویریں دیکھنے کے شوق میں سب لوگ
میرے آس پاس آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ انڈے کا
نام سن کر سب حیرت سے میرا منہ تکنے لگے۔ فہیدہ بی
ہنس کر بولیں "خدا کو دیکھا نہیں عقل سے پہچانا
ہے، بھلا چوپائے بھی انڈے دیتے ہیں! تمھیں آج
کیسی نئی نئی باتیں سوجھ رہی ہیں۔" میں نے کہا "اب
تم صحیح سمجھو یا غلط مگر اس زمانے میں ایسی ہی انہونی
باتیں ہوتی تھیں۔ اچھا واجد میاں دیکھو یہ دوسری
تصویر ہے۔ یہ جانور اس زمانے میں کنیڈا میں پایا جاتا
تھا۔ دیکھو اس کا منہ کچھوے کے منہ جیسا ہے اس
کی دم پر کتنے کانٹے ہیں۔ یہ اپنا بچاؤ اسی دم سے
کرتا تھا۔

اہا واجد میاں ذرا اس پرندے کو دیکھو (۳) کتنا
بڑا ہے، نو نو گز کے تو اس کے پر ہوتے تھے مگر
بے چارا اُڑ نہ سکتا تھا۔ واجد میاں کو اس پر بہت
بہت رحم آیا کہنے لگے "ہا ہا بے چارا بڑی مشکل میں
تھا۔" عائشہ بولیں: "تو پھر اس دکھیا کو کھانے
پینے کو کہاں سے ملتا ہوگا۔" میں نے کہا "بس یہ کرتا تھا
کہ رینگ رینگ کر پہاڑ پر چڑھتا تھا اور پھر وہاں
سے پروں کی مدد سے نیچے اترتا تھا۔ راستے میں اُسے
کوئی شکار مل جاتا تھا تو اُسے نوالہ بنا لیتا تھا
رات دن اس کا یہی مشغلہ تھا۔

میں نے ورق الٹا تو فہیدہ کی نظر ایک اور
تصویر پر پڑ گئی (۴) اور چلا کر کہنے لگیں "اے لوگو
دیکھو! کتنا بڑا جانور! اے ہے مجھے تو دیکھ کر ڈر
لگتا ہے۔" میں نے کہا "یہ دنیا کے سب سے بڑے
جانوروں میں سے تھا۔ یہ بھی اب سے لاکھوں سال پہلے
پایا جاتا تھا۔" عائشہ بولیں "یہ لاکھوں کروڑوں کا
حساب ہماری سمجھ میں نہیں آتا، آپ ناحق بتاتے
ہیں۔" واجد میاں کہنے لگے "اُف فوہ! اس کی
دم اور گردن کتنی لمبی ہے اور ذرا سر تو دیکھو کتنا
چھوٹا سا ہے۔" میں نے کہا "جناب یہ کوئی دس گز تو
اونچا ہوتا تھا کوئی تیس سوا تیس گز لمبا۔ اس کے
سر کا بھیجا بس اتنا بڑا ہوتا تھا جتنا بلّی کے بچے کا۔ اور
ہاں اس کا وزن آج کل کے کئی ہاتھیوں کے برابر ہوتا
تھا کوئی چودہ سو من۔ مگر اب یہ سب جانور مٹ مٹا
گئے۔ سائنس دانوں کو بہت تلاش کے بعد ان کے
پنجر کہیں کہیں سے مل گئے۔ بس انھی کا ڈھانچا بنا کر
کھڑا کر دیا ہے +

بچوں کی نظمیں

محمد شفیع الدین صاحب نیّر کی اصلاح کے بعد

برسات کا آغاز

سیّد محمد احمد عظیم برقی

کالی گھٹاؤں کا اک لشکر
بادل آتے پانی پی کر
ہر یا دل کی خوشیاں لے کر

چاروں طرف سے آیا گھر کر
جھومتے جیسے مست قلندر
دیکھو کیسا نو اکیسا منظر

زور سے پانی برس رہا ہے
لڑکے کس کر خوب لنگوٹی
پہنچے اک تالاب کنارے

سب ہی کا جی بہل رہا ہے
ساتھ میں لے کر اپنی ٹولی
مل کر سارے خوب ہی کھیلے

کبوتر

امام الدین انصاری گوہر

رنگ برنگے صاف کبوتر
کاسنی، کاہی سفید اور کالے
حسن ہر اک کا دل کو موہے
چونچیں ان کی چھوٹی پتلی
صبح ہم اٹھ کر کھاتے ہیں جب
ہم ہیں ان سے لطف اٹھاتے

ہم نے پالے کابک بھر کر
رنگ میں اپنے سب ہی نرالے
زرچی، موتی چور، امکو ہے
صاف اور ستھری کلیاں جیسی
ناچتے ہیں سب بولتے ہیں سب
خوب کھلاتے خوب اڑاتے

جب ہم آئیں گھر کے اندر
شوخی ان کی دیکھو گوہر

بیٹھیں اڑ کر ہاتھ اور سر پر
کتنے چنچل ہیں یہ کبوتر

کوّے کی ہوشیاری

محمد توحید چکردھر پوری

کوا اک رہتا تھا میرے گھر کے پاس
ہو رہا تھا پیاس سے بیتاب وہ
تھی صراحی ایک آنگن میں رکھی
لیک پانی تھا بہت تھوڑا وہاں
خیال میں آئی اسے اک ترکیب
کنکر لا کے سڑک سے کنکر
صراحی میں جب بھر گئے خوب کنکر
کوے نے پانی پیا پیٹ بھر

اک دن اس کو لگی زوروں کی پیاس
کرتا پھرتا تھا تلاش آب[1] وہ
اس صراحی پر نظر اس کی پڑی
چونچ کوے کی نہیں پہنچی وہاں
اک سڑک تھی وہاں سے خوب قریب
لگا ڈالنے وہ صراحی کے اندر
تو پانی بھی پہنچا صراحی کے منہ پر
کیا اس نے دل میں خدا کا شکر

خوشی سے ہوا وہ بہت باغ باغ
اڑا آسماں کی طرف پھر وہ زاغ[2]

[1] پانی کی تلاش
[2] کوا

سُنو پیارے بچّو! میں کیا کہہ رہی ہُوں

از مریم بیگم - بریلی

سُنو پیارے بچّو! میں کیا کہہ رہی ہُوں
غریبوں کی امداد ہے تم پہ واجب
پڑے گر مصیبت تو ہنس ہنس کے سہنا
بہن بھائیوں سے بھی مل جل کے رہنا
اکڑ کر نہ شیخی سے چلنا کبھی تم
کسی حال میں بھی نہ تم خوف کھانا
اگر میری باتوں کو تم مان لوگے
تو عزت تمھی سے رہے گی وطن کی

ہیں یہ چند باتیں انھیں یاد رکھنا
ضعیفوں کی خدمات تم کرتے رہنا
ملے تم کو راحت نہ مغرور ہونا
بزرگوں کا تم ماننا دل سے کہنا
بہت عجز اور خاکساری سے رہنا
شجاعت میں ٹیپو سے پیچھے نہ رہنا
اگر اچّھا بننے کی کوشش کروگے
حکومت تمھی کو ملے گی وطن کی

کتاب

علی حسن رونق استھانوی

سرور دل کی ہے ٹھنڈک ہے سب کی آنکھوں کی
غم و ملال سے دل جب کبھی بھی گھبرایا
تو اہل علم کی مونس ہے دشتِ غربت میں
کمال صنعت و حرفت کے راز تجھ میں ہیں
جو فلسفہ بھی ہے تجھ میں تو پند و حکمت بھی
کشش کچھ ایسی ہی تجھ میں کہ عقل حیراں ہے
خدا نے تجھ کو عجب حسن اور جمال دیا
جہاں میں رونقِ خستہ کی دلربا تو ہے

کتاب کیا میں کہوں وصف تجھ میں ہیں کیا کیا
تجھے اُٹھا کے جو دیکھا تو خوش تھا دل اپنا
تجھی سے عزت و دولت کو سب نے ہے پایا
تو ہی ہے معرفتِ حق کی ستر سربستہ
علوم دہر سے دل ہے بھرا ہوا تیرا
کبھی نہ دید سے تیری یہ جی بھرا میرا
تجھی میں دین بھی ہے اور تجھی میں ہے دنیا
ہے اس کے پیشِ نظر رات دن ترا جلوہ

سائنس دانوں کی کہانی

سید فوز الحسن ہاشمی ایم اے (علیگ)



جون کے پرچے سے سلسلہ ملا کر پڑھو

یہ تمام باتیں لوگوں کو بہت عجیب اور نرالی معلوم ہوئیں اس زمانے کے عقل مند لوگوں نے بھی انھیں ماننے سے انکار کر دیا۔ گلیلیو کو سخت سزائیں دی گئیں اور قطعی ممانعت کر دی گئی کہ وہ کسی کو تعلیم نہ دے پھر بھی چوری چھپے وہ اپنا کام کرتا رہا۔ ۱۶۳۲ء میں اس نے "دنیا کا نظام" ایک کتاب لکھ کر شائع کی۔ اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ مذہبی لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ روم کی مذہبی عدالتوں نے اس کی نافرمانی پر اسے پھر سزا دی۔ اس سے زبردستی اعلان کر دیا گیا کہ جو کچھ وہ بتاتا ہے سب غلط ہے کہتے ہیں اسے قسم بھی کھانا پڑی یعنی یہ کہ میں پھر کبھی نہ کہوں گا کہ زمین آفتاب کے گرد گھومتی ہے۔ مگر جب وہ قسم کھا کر اٹھا تو آہستہ سے بولا: "افسوس میرے قسم کھانے پر بھی زمین گھومتی چلی جاتی ہے۔" ۱۶۳۶ء میں گلیلیو کی آنکھیں جاتی رہیں۔ اب وہ کام نہ کر سکتا تھا۔ پھر بھی اس نے بہت سی کتابیں لکھوائیں۔ یہ کتابیں بعد میں شائع ہوئیں۔ ۱۶۴۲ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ لیکن اسی سال ایک اور بہت بڑا سائنس داں نیوٹن پیدا ہوا اس کا حال آگے آئے گا۔

ریاضی اور ہیئت کا چولی دامن کا ساتھ ہے ہیئت کے تمام اصول بہت باقاعدہ اور ریاضی کے اصولوں پر ہوتے ہیں۔ اسی لئے بہتر ہوگا کہ پہلے بڑے بڑے ریاضی دانوں اور ہیئت دانوں کا حال سن لو۔

بلیسے پیسکل (۱۶۲۳ء ۱۶۶۲ء) بہت مشہور ریاضی داں گذرا ہے۔ اس کا باپ اطیان پیسکل بھی بہت مشہور آدمی تھا۔ بلیسے سات برس کا ہوا تو اس کا باپ اپنے وطن سے پیرس چلا گیا۔ بلیسے کو وہ گھر ہی پر تعلیم دیتا رہا۔

بلیسے بچپن ہی سے اتنا ذہین تھا کہ وہ جامیٹری کے مشکل سے مشکل سوالات آسانی سے حل کر لیتا تھا۔

بارہ برس کی عمر میں اس نے آواز پر ایک رسالہ لکھ
ڈالا۔ سولہ برس کی عمر میں "مخروطی تراش" پر اتنا اچھا
رسالہ لکھا کہ اس زمانے کا مشہور فلسفی ڈیکارٹ
بھی اُسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اسی زمانے میں اُس
نے ایک شمار کرنے والی مشین بھی ایجاد کی۔ "مخروطی تراش"
کے بارے میں اُس نے اس زمانے میں جتنی معلومات
پیش کیں وہ آج تک مانی جاتی ہیں۔ دوسرے مشکل
اصولوں مثلاً مسئلہ ریہ، صفاری احصاء کے
بھی نئے نئے اصول اُس نے دریافت کئے۔ یہ اصول
اتنے مشکل ہیں، اتنے مشکل ہیں کہ ہوشیار سے
ہوشیار ریاضی داں بھی انہیں مشکل سے سمجھ پاتے
ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے ہوا کے دباؤ، سیال
چیزوں کے توازن وغیرہ پر بہت سی نئی نئی باتیں
دریافت کیں۔ ریاضی کے علاوہ ادب اور مذہب
سے بھی اُسے دلچسپی تھی۔ ان مضامین پر بھی اس
نے اچھی اچھی کتابیں لکھیں۔

بلیسے بچپن ہی سے بہت کم زور تھا اس پر
اتنی سخت محنت! اس لئے اس کی تندرستی کبھی
اچھی نہیں رہی۔ اس نے اپنی صحت اور تندرستی
کی طرف کبھی توجہ بھی نہیں کی۔ ایک دفعہ سیال
چیزوں کے بارے میں کوئی تجربہ کر رہا تھا کہ کوئی
حادثہ ہوگیا اور اُس کے سخت چوٹ آئی۔ اس سے
اس کی تندرستی پر اور بھی خراب اثر پڑا۔ نتیجہ یہ
ہوا کہ انتالیس برس کی عمر میں اس دُنیا سے چل بسا۔

اِسحٰق نیوٹن انگلستان کا مشہور
ریاضی داں ہیئت داں تھا یہ ۱۶۴۲ء میں
اولستھارپ لنکن شائر میں پیدا ہوا۔ اپنے درجے
میں یہ سب سے پھسڈی لڑکا تھا لیکن ایک ذراسی
بات نے اس میں انقلاب پیدا کر دیا۔ درجے میں
اس کی طرح کے دو ایک لڑکے اور بھی تھے۔ ان
میں سے ایک لڑکے سے اس کی مارپیٹ ہوگئی۔
اس لڑائی میں اُسے فتح ہوئی۔ نیوٹن نے سوچا
کیوں نہ لکھنے پڑھنے میں بھی اس سے جیت جاؤں
اس خیال کے آتے ہی پڑھنے لکھنے کی طرف اس نے
خوب توجہ کی پھر تو ایک اسی لڑکے سے کیا درجے کے
سارے لڑکوں سے پڑھنے لکھنے میں اوّل رہنے لگا۔

کبھی کبھی محض معمولی معمولی باتوں پر دھیان
دینے سے بھی بڑے بڑے نتیجے نکل آتے ہیں۔ ایک
ایسی ہی معمولی سی بات نیوٹن کے ساتھ بھی پیش آئی
ایک دن وہ اپنی ماں کے باغ میں بیٹھا حرکت کے
اصولوں پر غور کر رہا تھا، اتفاقاً ایک سیب کے درخت
سے سیب گرا۔ کتنی معمولی سی بات تھی مگر اسی وقت
بجلی کی طرح اس کے دماغ میں خیال آیا کہ جس طرح زمین
کی کشش کے سبب یہ سیب زمین پر گرا ہے بہت
ممکن ہے اسی کشش کے سبب چاند بھی اس کے گرد
گھومتا ہو۔ اب اس خیال کو بنیاد بنا کر اس نے حساب

لگانا شروع کیا اس وقت وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تو یہ کام کسی دوسرے وقت کے لئے ملتوی کر دیا۔ کئی سال کے بعد اُسے اس مسئلے پر غور کرنے کا پھر موقع ملا۔ اب کے زمین کے گرد چاند کی گردش کا حساب لگانے میں اُسے کامیابی ہوئی کہتے ہیں جب اُسے اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا تو اتنا خوش ہوا کہ آخری جوڑ بھی پورا نہ کر سکا۔

غرض وہی پسڈی لڑکا جو بچپن میں کھیلنے کی بجائے ہوائی چکیاں بناتا رہتا تھا، اپنی ہمت، شوق، محنت اور غور و خوض کی بدولت اتنی اونچی جگہ پہنچ گیا کہ اس سے پہلے کوئی بھی اس اونچائی تک نہ پہنچ سکا تھا، الجبرے میں مسئلہ ثنائی بھی اسی نے دریافت کیا۔ یہ بھی اُسی نے معلوم کیا کہ روشنی اصل میں سات رنگوں سے مل کر بنتی ہے یہ سات رنگ ہمیں دھنک یا قوس قزح میں نظر آتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی ایجاد نیوٹن کی تختی کہلاتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مختلف رنگ کس طرح ملتے جلتے ہیں۔

باوجود اتنی علمی فضیلت اور شہرت کے نیوٹن کے مزاج میں خاکساری بہت تھی۔ وہ کہا کرتا تھا "میں تو علم کے سمندر کے کنارے ایک بچّے کی طرح بس کنکریوں سے کھیل رہا ہوں۔ میری تحقیقاتیں قدرت کے عجائبات کے سامنے ایک ذرّے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں"

اس کے صبر و استقلال کی مثال ہم کہیں پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ایک دفعہ کسی نے اس سے پوچھا "ابھی تم ایسی ایسی عجیب و غریب باتیں دماغ سے کیسے نکال لیتے ہو۔ نیوٹن نے اس کا یہ مختصر سا جواب دیا۔ "محض مسلسل غور و خوض اور سوچ بچار کی بدولت"

اس نے ایک مشہور کتاب قوانین (PRINCIPIA) کے نام سے لکھی۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ کئی سال تک وہ انگلستان کی ٹکسال کا سب سے بڑا افسر رہا۔

غرض نیوٹن اپنے زمانے میں یورپ کا سب سے بڑا آدمی تھا۔ انگلستان کو اپنے سپوت پر بجا طور پر فخر تھا اس نے ۱۷۲۷ء میں انتقال کیا۔ انگلستان والوں نے اس کی اتنی عزت افزائی کی کہ اسے ویسٹ منسٹر کے گرجا میں دفن کیا یہاں قوم کے بڑے بڑے لوگ اور بادشاہ دفن ہوتے ہیں انگلستان کے چھ بڑے لارڈ اس کے تابوت کو اٹھائے ہوئے تھے۔

ہماری جائے قیام

آگرہ

ہماری گاڑی کوئی ۲ بجے راجہ منڈی کے اسٹیشن پر پہنچی۔ سب لڑکوں کو اسٹیشن سے باہر ایک صاف سی جگہ بٹھا کر اکرام صاحب نے مجھے اور عثمان کو ساتھ لیا اور جائے قیام کی تلاش میں نکلے پہلے شیعیہ ہائی اسکول گئے اور یہاں سے یکے میں بیٹھ کر پھر کچہری پہنچے، وہاں جاکر معلوم ہوا کہ سٹی مجسٹریٹ صاحب جن کے ہم مہمان بننا چاہتے تھے اپنی کوٹھی پر جاچکے تھے، اب نہر والے ڈپٹی صاحب کا پتہ معلوم کیا۔ ہم نے چاہا کہ کوئی تانگہ مل جائے لیکن کرایہ سن کر چپ سادھ لی۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ تانگے والے آپس میں لڑ پڑے۔ ایک دوسرے سے کہنے لگا۔

"ابے یہ تو جہر (زہر) کے دفتر جارہے ہیں" یہ دوسرا بولا۔ "نہیں تو یہ تو نک کے دفتر جارہے ہیں"۔ ہم نے ہمت کی اور پیدل ہی روانہ ہوگئے نہر کے دفتر پہنچے تو سخت پیاس لگی تھی۔ اکرام صاحب اندر گئے۔ سٹی مجسٹریٹ اور نہر کے ڈپٹی صاحب کی کوٹھی کا پتہ معلوم کیا۔ اس وقت سٹی مجسٹریٹ صاحب کی کوٹھی جانا سہل سمجھا، کیونکہ وہ قریب معلوم ہوتی تھی۔ لیکن جب چل پڑے تو بہت دور نکلی۔ جس سے پوچھا .... اس نے یہی کہا کہ یہ رہی وہ رہی، ہم کافی تھک چکے تھے لیکن طے کرچکے تھے کہ پتہ لگا کر چھوڑیں گے۔ چلتے چلتے ایک سقہ ملا اس نے صاحب موصوف کی کوٹھی کا صحیح پتہ بتا دیا۔ ہم چند منٹ چلنے کے بعد کوٹھی پر پہنچ گئے کوٹھی شاندار تھی۔ مجھے اور عثمان کو تو اکرام صاحب نے باہر بٹھا دیا اور خود اس سے ملنے گئے، وہاں جاکر معلوم ہوا کہ وہ آرام کر رہے ہیں۔ دو تین گھنٹے وہاں انتظار کیا۔ انتظار کرتے کرتے سوکھے تو نہیں البتہ سو ضرور گئے۔ اسی درمیان میں ہماری حالت دیکھ کر ایک صاحب نے پوچھا "کیا آپ کسی یتیم خانے سے آئے ہیں؟ چندہ لینا ہوگا!" اکرام صاحب نے کہا "نہیں بھئی، چندہ تو نہیں لینا لیکن کچھ ایسا ہی کام ہے۔ اس وقت ہمارا حلیہ بھی عجیب تھا۔ ان بے چارے کو اس قسم کا دھوکا ہوا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔

تقریباً دو بجے سٹی مجسٹریٹ صاحب اٹھے۔ ان کے اٹھنے سے ذرا دیر پہلے ان کے چیف ریڈر جناب شفیق صاحب تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ آپ لوگ جامعہ سے آئے ہیں؟ میں نے کہا "جی ہاں"۔ فرمانے لگے کہ آپ اختر عادل صاحب سے مل لیجئے وہ انتظام کریں گے۔ انھوں نے ان کو ٹیلیفون بھی کیا۔ سٹی مجسٹریٹ صاحب بھی ملے اور ہم لوگوں کو اختر عادل صاحب کی کوٹھی کا پتہ بتا کر چلتا کیا۔

ہم یہاں سے پیدل چلے تھوڑی دور چل کر تانگا مل گیا، اس میں بیٹھ کر خان بہادر اختر عادل صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ ماسٹر صاحب ان سے ملنے گئے، وہاں ہمارے ٹھیرنے کا انتظام تھا ہی دیکھ کر فوراً خوش خوش واپس آئے۔ اور اسٹیشن کی طرف پیدل چل دئے۔ ہمارے اسٹیشن پہنچتے ہی سب لوگوں کی جان میں جان آئی۔ ہم نے اپنی سرگذشت سنائی اور انھوں نے اپنی دن بھر کی دلچسپیاں کچھ لڑکے پریشان تھے۔ ماسٹر صاحب نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا "بھئی جلنے دو اب یکے اور تانگے لاتے ہیں، ان میں سامان لاد کر جائے قیام پر چلیں گے۔ تھوڑی دیر بعد دو یکے آگئے، ان میں سامان لادا اور عثمان کو ساتھ کر دیا تاکہ مکان بتلائیں ان کے جانے کے بعد سید احمد علی صاحب نے ایک اور تانگا کیا۔ اس میں باقی سامان اور میں تھا۔ راستے میں دیکھا عثمان صاحب بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ ہمارے تانگے کو دیکھ کر واپس آئے۔

کوٹھی کے پچھلے حصے میں ایک بڑا سا کمرہ ہم لوگوں کے لئے خالی کر دیا گیا تھا۔ اس میں ہم نے اپنا سامان ترتیب سے رکھا اور کھانا کھا کر سو گئے۔

خان بہادر اختر عادل صاحب کے ہاں سچ تو یہ ہے کہ ہمیں ہر طرح کا آرام ملا۔ کھیلنے کے لئے کوٹھی کے آگے اور پیچھے کورٹ بنے تھے۔ یوں میدان بھی کافی تھا۔ خوب دل کھول کر دوڑتے تھے اس کے علاوہ ہمارے میزبان صاحب ہم پر بہت مہربان تھے۔ ہر وقت اور ہر طرح سے ہماری دیکھ بھال کرتے رہتے تھے۔ شہر میں اُن کی وجہ سے کافی کام بن جاتے تھے۔ انھی کی وجہ سے حضرت سجادہ نشین صاحب کی طرف سے فتح پور سیکری میں مفت میں گائڈ اور ٹھنڈا پانی ملا تھا۔ انھی کی وجہ سے نان خطائیوں کا تبرک نصیب ہوا۔

شہر کا ہر شخص خان بہادر صاحب کو مانتا تھا بس مچھر ہی کچھ نہ سمجھتے تھے اتنا ضرور تھا کہ مچھر بھی اُن کے ڈر سے بہت کم کاٹتے تھے۔ اسی وجہ سے سید احمد علی صاحب نے ایک مرتبہ بہت جلد ۲۰۰ مچھروں کو گن لیا تھا۔ خان بہادر صاحب نے ہمیں ٹین کھیل سکھائے اور ایک وقت کھلنے میں بھی شریک کیا۔ وہ غالباً ہمارے جامعی ہونے کی وجہ سے ہم سے اس قدر محبت کرتے تھے اُن کی ٭

٭ اس مہربانی، محبت اور شفقت کی یاد اب بھی ہمارے دلوں میں تازہ ہے۔

موجدوں کی کہانی

جون کے پرچے سے سلسلہ ملا کر پڑھو۔

(سید نور الحسن ہاشمی)

مدتوں کتابیں ابھی دستی مشینوں سے چھپتی رہیں۔ آخرکار ایک شخص فریڈرک کوئنگ (۱۷۷۴ء–۱۸۳۳ء) نامی نے سوچا کہ اگر دستی مشینوں کی بجائے کُل کام مشین ہی سے ہوا کرے تو کتنی جلد کام ہو جائے۔ اس خیال کو عمل میں لانے کے لئے اس نے بہت سے تجربے کئے۔ شروع شروع میں تو اُسے ناکامیاں ہوئیں، لیکن ان ناکامیوں سے وہ بددل نہیں ہوا اور تجربے کرتا رہا۔ اور ہمیشہ یہ سوچتا رہا کہ کبھی نہ کبھی اس کو کامیابی ضرور ہوگی۔ آخرکار اس کو کامیابی ہوئی اور ایک انگریز ٹامس بینسلے کی شرکت میں سنہ ۱۸۱۰ء میں اُس نے ایک مشین کا چھاپہ خانہ کھولا۔ یہ چھاپہ خانہ ایک بھاپ والے انجن کی مدد سے چلتا تھا۔ مختلف کتابیں چھپنے لگیں۔ آخرکار سنہ ۱۸۱۴ء میں انگلستان کا مشہور اخبار ٹائمس بھی اسی میں چھپنے لگا۔

آج کل اس بھاپ والے انجن کی جگہ بجلی سے کام لینے لگے ہیں، اور کتابیں اور اخبار اور رسالے سب مشین کے ذریعے چھپتے ہیں۔ بڑے بڑے چھاپہ خانوں میں تو ایسی مشینیں ہیں کہ ایک گھنٹے میں سینکڑوں اخبار اور کتابیں چھاپ دیتی ہیں۔ فریڈرک کوئنگ آج بھی یاد کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اسی نے مشینوں کے ذریعے چھاپنے کی ترکیب نکالی تھی۔

چھاپے خانوں، بننے، سینے کی مشینوں کا حال تو ختم ہو گیا مگر ابھی بہت سی اچھی اچھی چیزوں کا حال باقی ہے۔ گھبرا نہ گئے ہو تو سُنو۔

ٹیلیفون، گراموفون:—

ٹیلیفون کے مکمل کرنے میں یوں تو کئی لوگوں نے حصہ لیا لیکن سب سے پہلے جس شخص نے ٹیلیفون نکالا اس کا نام گراہم بیل (پیدائش ۱۸۴۷ء) تھا۔ اس کا باپ اسکاٹ لینڈ میں بمقام اڈنبرا رہا کرتا تھا اور گونگے، بہرے لوگوں کو بولنا سکھایا کرتا

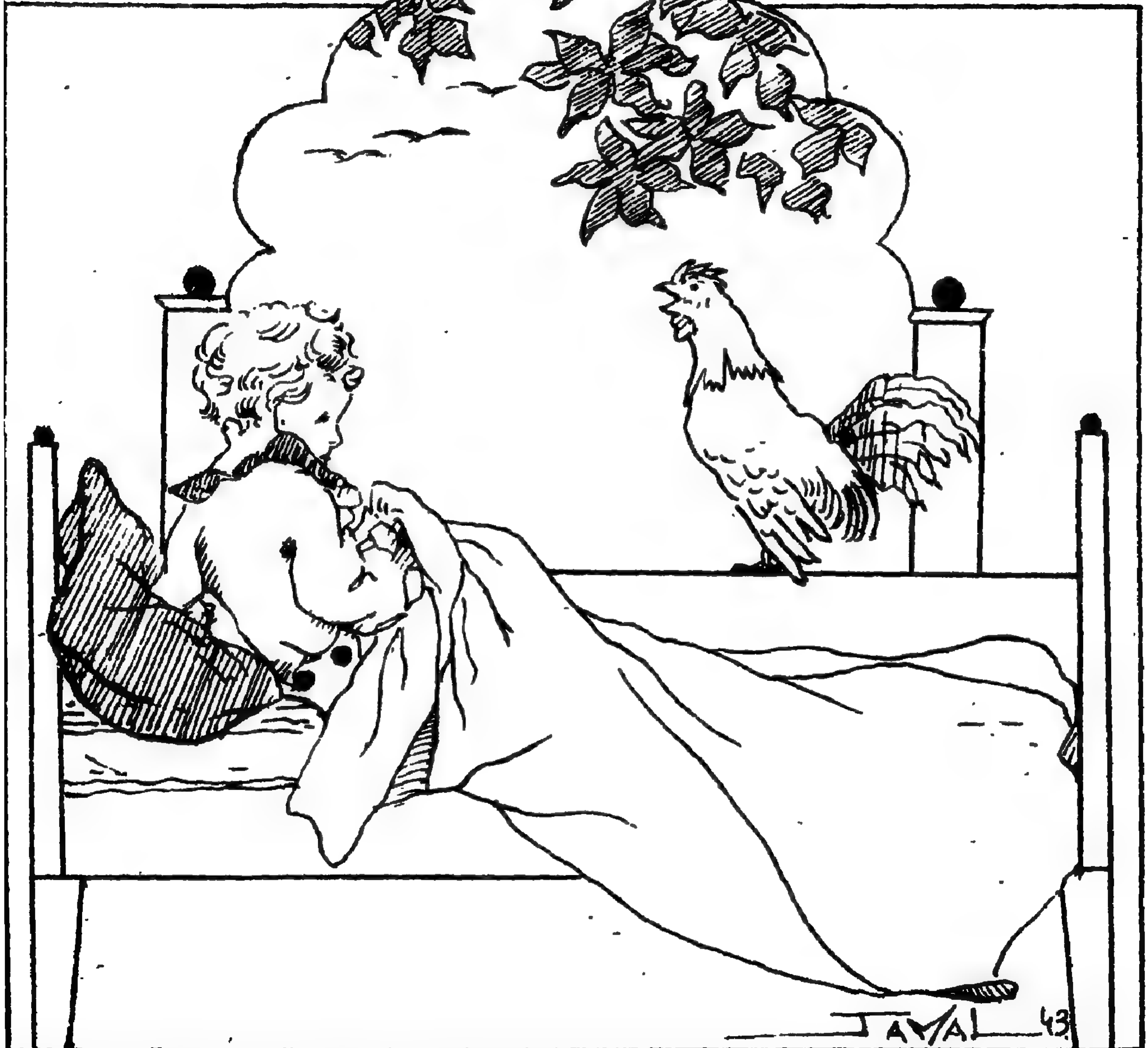
تھا۔ گراہم بیل جب بڑا ہوا تو یہ بھی باپ کی طرح گونگے بہرے لوگوں کو بولنا سکھانے لگا۔ ۱۸۷۰ء میں باپ کے ساتھ کناڈا چلا گیا، وہاں بھی یہی پیشہ کرتا رہا۔ اس دوران میں وہ اس کی بھی کوشش کرتا رہا کہ کوئی ایسی تدبیر نکل آئے جس سے وہ آواز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا سکے۔ آخرکار ۱۸۷۶ء میں اس نے ٹیلیفون بنایا اور اپنی اس ایجاد کا اعلان کیا۔ اسی سال بوسٹن نامی شہر میں ایک بڑی نمائش ہوئی اس میں اس ایجاد کو بھی پیش کیا۔ دنیا کے بڑے بڑے سائنس دان اس ایجاد کو دیکھنے کے لئے آئے اور دنگ رہ گئے۔ کچھ دنوں بعد جب اس نے اس ایجاد کو اور بھی مکمل کر لیا تو ایک کمپنی قائم ہو گئی جس نے ٹیلیفون کو لاکھوں کی تعداد میں بنا کر امریکہ بھر میں رائج کر دیا اس سے گراہم خوب مال دار ہو گیا۔ ۱۸۷۷ء میں گراموفون بھی اسی نے ایجاد کیا جو آج کل ہر جگہ رائج ہے۔

فولاد

تم کو معلوم ہے لوہے کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو کچا لوہا، برآمدے، سڑک کی لالٹینوں کے کھمبے وغیرہ اسی کے بنتے ہیں۔ یہ کھردرا اور بھدا ہوتا ہے۔ دوسری قسم ہے نرم لوہا۔ اس کی کیلیں، گھوڑے کے نال وغیرہ بنتے ہیں۔ لوہے کی تیسری قسم کو فولاد کہتے ہیں یہ سب سے زیادہ مضبوط، صاف اور سخت ہوتا ہے۔ ریل کی پٹریاں اسی کی بنتی ہیں۔ فولاد نرم لوہے کو پگھلا کر اُسے خوب صاف کر کے اور کچھ دوائیں ملا کر بناتے ہیں۔ پہلے فولاد بڑی مشکل سے اور بڑی دیر میں بن پاتا تھا لیکن سر ہنری بسیمر (۱۸۱۳ء-۱۸۹۸ء) نے ۱۸۵۶ء میں ایسی ترکیبیں نکالیں جن سے فولاد جلد اور کم خرچ میں بن سکتا تھا۔ ہنری بسیمر ایک فرانسیسی آرٹسٹ کا لڑکا تھا لیکن پیدا انگلستان میں ہوا اور یہیں تمام عمر رہا۔ شروع ہی سے اس کو دھاتوں کو پگھلانے ان کے پاؤڈر بنانے میں دلچسپی تھی چنانچہ اُس نے سونا، پیتل وغیرہ بہت سی دھاتوں کو پگھلانے اور پاؤڈر بنانے کی نئی نئی ترکیبیں نکالیں لیکن سب سے زیادہ مشہور اس کا فولاد بنانے کا طریقہ ہوا۔ اس کا یہی طریقہ آج کل بھی برتا جاتا ہے اور اسی کی ایجاد کی بدولت ۱۸۵۶ء سے انگلستان فولاد بنانے کا اتنا بڑا مرکز ہو گیا ۱۸۷۹ء اس کو سر کا خطاب دیا گیا۔

(باقی آئندہ)

رنگ بھرو



صبح کا وقت ہے۔ مرغ نے اذان دی اور یہ بچہ جھٹ اُٹھ بیٹھا۔ کیسا اچھا بچہ ہے۔ اس مرتبہ اِس تصویر میں تم خود ہی اپنی پسند کے رنگ بھرو۔

پیام برادری

پیاری بچیو اور بچو! خوش رہو اور تندرست۔

خدا کا شکر ہے کہ گرمیوں کا موسم ختم ہوا۔ یو۔پی کے بعض علاقوں میں تو ۱۴۔۱۵۔۱۶ جون کو خوب بارش ہوئی دہلی کا موسم بھی اب بہت خوش گوار ہو گیا ہے۔ ہندوستان میں یہ بہار کا موسم کہلاتا ہے اور ہے بھی ٹھیک۔ جون کی انتہائی گرمی لوہ اور سورج کی جھلس دینے والی تپش کے بعد یکایک رُت بدل جانا۔ بادلوں کا آسمان پر چھا جانا۔ ٹھنڈی ہواؤں کا چلنا اور پھر مینھ کا برسنا کیسا بھلا لگتا ہے جیسے سچ مچ جنت میں پہنچ گئے۔ درخت دُھل کے کیسے صاف صاف ہو جاتے ہیں۔ خشک زمین ہر چہار طرف جیسے ہریالی اگلنے لگتی ہے۔ لوگ اس موسم میں خوب خوشیاں مناتے ہیں۔ پکوان چڑھتے ہیں۔ باغوں میں جھولے پڑتے ہیں، اور ساون کے گیت گائے جاتے ہیں۔ لڑکے دریاؤں اور تالابوں میں نہاتے ہیں۔ چھوٹے بچے کاغذ کی ننھی کشتیاں بنا کر تیراتے ہیں ہماری دلّی کے لوگ تو بڑے سیلانی ہیں جہاں ذرا پانی برسا اور انھوں نے اوکھلے یا قطب صاحب کا رُخ کیا۔ پھول والوں کا میلا اس موسم کی خاص چیز ہے یہ قطب صاحب یا مہرولی میں ہوتا ہے۔ کیا ہندو کیا مسلمان سبھی اس میلے میں شریک ہوتے ہیں۔ غدر سے پہلے دہلی کے بادشاہ سلامت بھی تشریف لاتے تھے۔

مگر ان باتوں کے ساتھ ساتھ تندرستی کے لئے یہ موسم زیادہ اچھا نہیں ہے، مکھی، مچھر، کھٹمل، پسّو برسات کا خاص تحفہ ہیں ملیریا بخار مچھروں کے کاٹنے سے آتا ہے۔ اس لئے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ گھروں کو خوب صاف ستھرا رکھنا چاہیے۔ رات کو سوتے وقت مچھر دانی لگا لینی چاہیے یا ہاتھ پیروں میں کڑوا تیل مل لینا چاہیے۔ کھانے پینے میں بھی احتیاط کرنا چاہیے۔ آج کل چائے خصوصاً لیمو کی چائے اور لیمو کا شربت بہت مفید ہے۔

ٹیونشیا کی فتح کے بعد سوائے ہوائی حملوں کے لڑائی کے میدان میں زیادہ سرگرمی دکھائی نہیں دیتی۔ اتحادیوں نے اٹلی کے ایک اور جزیرے پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس کا نام پنتیرا لیا ہے۔ اتحادی ہوائی جہاز اٹلی کے اہم مقامات پر بہت شدت سے حملے کر رہے ہیں سنا ہے اب اٹلی اور جرمنی نے بھی اسی شدت سے اُن کا جواب دینا شروع کر دیا ہے۔

فرانس کے دو جنرل، جنرل جیرو اور ڈی گال، فرانس کی موجودہ حکومت کے خلاف ہیں اور اتحادیوں سے ملے ہوئے ہیں جنرل جیرو کی فرانسیسی فوج نے ٹیونشیا کی لڑائی میں اتحادیوں کو بہت مدد دی۔ ان دونوں جنرلوں میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ فرانسیسی فوج کے

بہت سے افسر ہیں (فرانس کی موجودہ حکومت کے حمایتی) جن میں کچھ فاشسٹ ذہنیت بھی رکھتے ہیں۔ جنرل ڈیگال کہتے ہیں ان سب کو فوج سے نکال دو۔ جنرل جیرو اس پر راضی نہیں ہیں۔ پچھلے دنوں الجیریا میں ان دونوں کی ملاقات بھی ہوئی۔ مگر یہ اختلاف کسی طرح دور نہ ہوا۔ آخر اتحادیوں نے بیچ میں پڑ کر ان میں سمجھوتہ کرا دیا۔ جانے کیا بات ہے آج کل روس کے میدان کی خبریں کم کم آ رہی ہیں ان خبروں سے کم سے کم اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ روس بہت بہادری کے ساتھ جرمنی کا مقابلہ کر رہا ہے اور جہاں کہیں موقع ملتا ہے پیچھے بھی ڈھکیل دیتا ہے۔ ترکی میں ایک مرتبہ پھر بہت زبردست زلزلہ آیا۔ استنبول سے کوئی ۹۰ میل پورب کو ایک شہر تھا وہ تو بالکل تباہ ہو گیا۔ وہاں کوئی ۲۰ ہزار کی آبادی تھی ان میں سے کوئی ۵ ہزار زلزلے کی نذر ہو گئے۔ دوسری جگہوں کے نقصانات کی ابھی تفصیل نہیں معلوم ہو سکی ہے ترکی اس لڑائی کے زمانے میں کئی بار اس مصیبت سے دوچار ہو چکا ہے۔

امریکہ میں ہڑتالوں کی گڑبڑ ابھی تک جاری ہے خود حکومت اس قضیے کو نپٹانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مگر اسے پوری کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ وہاں کے ایک شہر میں نیگرو یعنی حبشی لوگوں اور سفید امریکنوں میں لڑائی ہو گئی۔ ان حبشیوں کا اصلی وطن افریقہ ہے یورپ کے لوگ انھیں افریقہ سے پکڑ کر لاتے تھے۔ اور امریکہ میں لا کر بیچ دیتے تھے۔ یہاں ان سے کھیتی باڑی اور محنت اور مزدوری کا کام لیا جاتا تھا۔ امریکہ کے سفید لوگ ان پر خوب خوب ظلم کرتے تھے۔ آخر انھی سفید امریکنوں میں کچھ رحم دل لوگ پیدا ہوئے۔ انھوں نے کوشش کر کے ان بے چاروں کو آزاد کرایا۔ مگر جو نفرت و حقارت ان لوگوں کی طرف سے سفید امریکنوں کے دل میں پیدا ہو گئی تھی اس کی جڑیں بہت مضبوط ہیں اس لڑائی کا نقشہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہندوستان کے کسی شہر میں ہندو مسلمانوں کی لڑائی کا۔ سڑکوں پر بازاروں میں، محلوں میں خوب کشت و خون ہوا۔ آخر فوج نے آ کر امن قائم کیا۔

چینی جاپانی لڑائی کو اب ساتواں برس شروع ہو رہا ہے۔ اس عرصے میں چین کو کیا کیا نقصان نہ پہنچے اس کے بہت سے اچھے اچھے صوبے ہاتھ سے نکل گئے۔ ہزاروں، لاکھوں آدمی لڑائی میں مارے گئے۔ قحط اور سیلاب کی آفتیں اس کے علاوہ تھیں مگر بہادر چین کا سر ابھی تک اونچا ہے وہ اپنے دشمن کی بے پناہ طاقت کا مقابلہ کر رہا ہے۔ چین کا سپاہی اس لئے نہیں لڑ رہا ہے کہ اس کے گھر کھانے کو نہیں ہے لڑائی میں شریک ہو کر اسے اور اس کے کنبے کو پیٹ بھر روٹی نصیب ہونے لگے گی۔ وہ اپنے وطن کی خاطر لڑ رہا ہے اپنے عزیز وطن کو غلامی کی ذلت سے بچانے کے لئے لڑ رہا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو قوم سچے دل سے آزاد رہنے کا فیصلہ کرے اسے کوئی طاقت غلام نہیں بنا سکتی۔

بحر الکاہل میں امریکہ اور جاپان کے ہوائی دور کہیں کہیں میدانی مقابلے برابر ہو رہے ہیں۔ آسٹریلیا پر جاپانی حملے کا خطرہ پھر کم ہو گیا ہے۔ آسٹریلیا کے وزیر اعظم اپنی تقریروں میں یہ بات ظاہر بھی کر چکے ہیں۔ پچھلے دنوں آسٹریلیا کی پارلیمنٹ میں موجودہ وزارت کے خلاف بے اعتمادی کی تجویز پیش ہوئی تھی۔ مگر کامیاب نہ ہو سکی۔

ہندوستان میں مہنگائی کا وہی حال ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کی ہر جگہ کمی ہے۔ بنگال اور آسام کے بعض سرحدی علاقوں میں تو کھانے غلے کی حالت اور بھی خراب ہے۔ کچھ دنوں پہلے کی خبر ہے کہ وہاں مسلسل فاقوں کی وجہ سے بہت سے لوگ مر گئے۔ سنا ہے اسٹینڈرڈ کلاتھ اب بازار میں آ گیا ہے۔ اور اس کی وجہ سے دوسرے کپڑوں کا بھاؤ کم ہو گیا ہے۔ مگر چھوٹے شہروں اور قصبوں میں ابھی تک وہی حال ہے۔

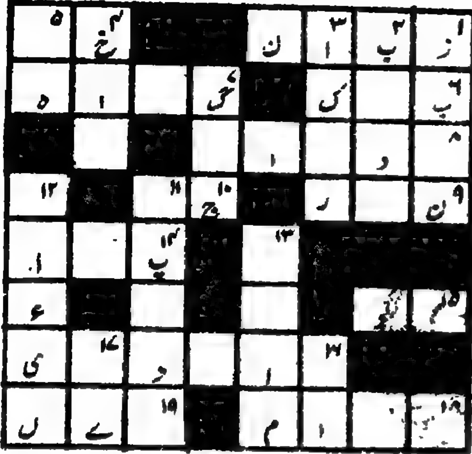
محمد حسین حسان - ۲۵ جون

معمّا نمبر ۳۵

اوّل اِنعام .... ۶ سے

دُوسرا اِنعام .... للعہ

(انعام میں کتابیں بھیجی جائیں گی)



دائیں سے بائیں

۱۔ مادری زبان کی تکمیل کے بغیر کوئی ــــــ سود مند ثابت نہیں ہوتی
۲۔ ... بمعنی عادت۔
۶۔ دہلی میں ریزرو ... سے ایک شخص کو ایک دن میں پانچ روپے کی ریزگاری مل سکتی ہے۔
۷۔ بعض اوقات معمولی یہ موت کی سزا کا باعث ہو سکتا ہے۔
۸۔ لفظ بمعنی بدنصیبی بدقسمتی۔
۹۔ انبار کا واحد۔
۱۰۔ اچھا پانی وہی ہے .. بہتا رہتا ہے۔
۱۴۔ لفظ بمعنی گھوڑا۔ (الٹا)
۱۵۔ آزادی کا درخت۔ ہمیشہ خونِ شہیداں ہی میں پرورش حاصل کرتا ہے۔
۱۶۔ گائے کا تو کچھ ٹھکانا بھائی ...... نے کہا شیخ جی کا اونٹ کس کل بیٹھتا ہے دیکھئے
۱۸۔ پردیسی دوست یا عزیز کو دیکھ کر پوچھتے ہیں کہ .... کہاں کیا ہے۔
۱۹۔ طوطے کی آواز۔

اوپر سے نیچے

۱۔ یہ جسم ہے اور خیالات اس کی روح ہیں۔
۲۔ یہ لفظ معمّا نمبر ۳۳ کے صحیح حل میں ملے گا۔
۳۔ شعرائے متوسطین میں ایک شاعر کا تخلص
۴۔ خانم کا مذکر۔
۵۔ ضمیر غائب
۷۔ بادل کی آواز۔
۱۱۔ دو پٹہ کے بے ترتیب حروف۔
۱۲۔ سانپ پر اس طرف سے حملہ کرنا چاہیے۔
۱۳۔ کسی معتبر آدمی کے ہاتھ ہی یہ کہلا کر بھیجنا چاہیے
۱۶۔ سا، دے، ..، ما، پا، دھا، نی
۱۷۔ ہے۔

قواعد

۱۔ حل کے ساتھ ایک آنے کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔
۲۔ ایک سے زیادہ حل بھی بھیجے جا سکتے ہیں۔ چار حلوں کی رعایتی فیس ۳ر۔ ۸ حلوں کی ۶ر ہے۔
۳۔ دونوں انعام تقسیم کر دیے جائیں گے، قرعہ اندازی نہ ہوگی۔
۴۔ ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔
۵۔ پیام تعلیم میں چھپے ہوئے کوپن کے علاوہ اور کوئی کوپن نہیں لیا جائے گا۔
۶۔ کسی کوپن میں کوئی حرف کٹا یا مٹا ہوا ہوگا یا پنسل سے بھرا ہوا ہوگا تو مقابلے میں شامل نہ لیا جائے گا۔
۷۔ ایک لفافے میں ایک نام سے حل آنے چاہئیں۔
۸۔ چھوٹی اور بڑی ے کا فرق لازمی ہے (ی ے)
۹۔ پتہ:- سب ایڈیٹر پیام تعلیم مکتبہ جامعہ دہلی۔ قرول باغ
۱۰۔ تمام حل ۱۵ اگست تک دفتر پیام دہلی پہنچ جائیں۔

صحیح حل معما نمبر ۳۴

		ق	ا	ج	ا	پ	آ
	ب	ا	ج	ن	پ		ع
ع	ا	د	و		ر	و	ا
	ن	ا	د	ز	ے		
خ	ی	ن		ی	ل	ع	ج
ی	ہ		ب	ن			و
ن		ن	و		ش	ث	ا
د	گ		ی	گ	د	ن	ز

انعام اول فی کس ۳ ؏

۱۔ زین العابدین محمد خالد ۔ میرٹھ
۲۔ حبیب انصاری ۔ لکھنؤ
۳۔ غلام جیلانی ۔ دہلی۔
۴۔ فرحت حسین ۔ دہرہ دون
۵۔ خورشید مصطفےٰ زبیری ۔ دہلی

ایک غلطی[۱] فی کس ۳ر

۱۔ محمد شفیع الدین دانشمندی ۔ بدایوں
۲۔ حسن اختر ۔ علی گڑھ
۳۔ انور کمال ۔ میرٹھ
۴۔ محمد ہاشم خاں ۔ امرتسر
۵۔ محمد رسا ۔ ایبٹ آباد
۶۔ علی حسین ۔ بھروہ۔
۷۔ محمد سعید اختر کانپور
۸۔ صاحبزادہ سید عتیق جہاں رامپور
۹۔ سید مصطفےٰ علی ۔ رڑکی
۱۰۔ سید مرتضےٰ علی ۔ "
۱۱۔ سید اخلاق حسین جیلانی ۔ ٹانڈہ
۱۲۔ رفیع الدین احمد ۔ لاہور
۱۳۔ عبد الجمیل ۔ کوئٹہ ۔
۱۴۔ محمد مصطفےٰ زبیری دہلی ۔
۱۵۔ محمود حسین زبیری ۔ دہلی
۱۶۔ روح الامین ۔ نارھال
۱۷۔ شبیر احمد مالیگاؤں
۱۸۔ خواجہ جمیل اختر ۔ میانوالی
۱۹۔ محمد سخا الرب ۔ کانپور
۲۰۔ سید نسیم طاہر ۔ بھوپال

[۱] اگلے معمے میں چار کو نہیں بھیج سکتے ہیں۔

معمّا نمبر کوپن نمبر

نام ....

پتہ ....

ٹکٹ ....

معمّا نمبر کوپن نمبر

معمّا نمبر کوپن نمبر

نام ....

پتہ ....

ٹکٹ ....

معمّا نمبر کوپن نمبر

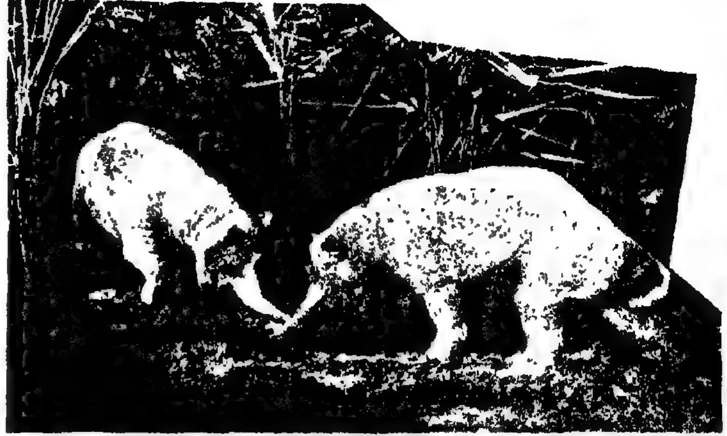


سمو سر
occidentalis n ۳ - یہ جانور
والے حشرات الارض ۲۱۵ أن اڑنے
شمالی امریکہ مبن کوئی جو
سال پہلے ملتے تھے اسکے آر
بارو پھیل کر کوئی ۱۸ فٹ بے
ہوتے تھے بارو کی پانچویں انگلی
سے پیچھے کے پیرون تک چمڑے
کا ایک پتلا سا جال تنا ہوتا تھا۔



سمو نر نمبر ۴ - یہ جانور Diplodocus
بھی شمالی امریکہ میں ۹۰ ملین
قبل پایا جاتا تھا۔ یہ کوئی ۹۰ فٹ
لمبا ہوتا تھا لیکن اس طول کا بڑا
حصہ اسکی لمبی گردن اور بہت ہی
لمبی کوڑے کی سی دم کے حصہ
میں آجاتا تھا۔

Regd. No.L.1961



تصویر نمبر ۵ . یہ جانور Arsinoitherium کوئی ۲۵ ملین سال پہلے مصر میں پایا جاتا تھا شکل تو کچھ ہاتھی سے ملتی جلتی ہی مگر اور اکثر حیثیتوں سے گینڈے سے زیادہ مشابہ تھا۔



تصویر نمبر ٦ . خنجر نما دانتوں والا شیر Machaerodus بلی کا دور کا عزیز تو تھا مگر کسی طرح شیر نہ تھا



تصویر نمبر ۷. یہ جانور Megatherium نباتات پر گزر کرتا تھا۔ کوئی ۲۰ فٹ لمبا ہوتا تھا اور جب پچھلے پیروں پر بیٹھتا تھا تو ۱۲ فٹ اونچا ہوتا تھا اور اسطرح درختوں کی اونچی شاخوں تک پہنچتا تھا۔

اگست
۱۹۸۲





انگلستان مین نوجوان لڑکون اور لڑکیون کا ایک قومی ادارہ ھے۔ اس ادارے نے لڑکون اور لڑکیون کے تمام کلب اور انجمنون کو ایک ھی نظام کے ماتحت کردیا ھے یہ ادارہ انھین مفید مشورے اور ھدایتین دیتا رھتا ھے۔

یہ تصویر لندن کے ایک کلب کی پارلیمینٹ کی ھی۔ جمناسٹک کا صدر لوگون کے سامنے تقریر کررھا ھے۔ کلب مین ھر شعبے کا صدر الگ الگ ھے۔

پیامِ تعلیم

دہلی، یو۔پی، سی۔پی، برار، رام پور، قلات
بنگال، میسور، حیدرآباد، سندھ، کشمیر، پنجاب، بہار اور
سرحد کے محکمہائے تعلیم کی طرف سے سرکاری طور پر منظور کیا گیا ہے۔
(دہلی)

جلد ۲۶ — نمبر ۸

فہرست مضامین اگست ۱۹۴۳ء

نمبر	مضمون	مصنف	صفحہ
۱	بچوں سے باتیں	ایڈیٹر	۲۲۶
۲	چاند کا بچہ	افسر میرٹھی	۲۲۷
۳	نیلا پرندہ	سعید بھوپالی	۲۲۸
۴	میاں چھٹو کا بھیا	محمد شفیع الدین نیر	۲۳۱
۵	پگ ڈنڈی کی کہانی	پروفیسر محمد عبدالغفور	۲۳۲
۶	ایک قطرا	جلال الدین احمد	۲۳۵
۷	ہماری زمین	محمد حسین حسان	۲۳۷
۸	آگرے کی سیر	مجیب الرحمٰن۔ ابتدائی ششم	۲۴۱
۹	تندرست لڑکے کا لباس	خان الیاس احمد مجیبی	۲۴۳
۱۰	بچوں کی کوششیں	......	۲۴۷
۱۱	کشتی	مشتاق احمد اعظمی بی اے	۲۴۹
۱۲	آؤ تصویر بنائیں۔ رنگ بھرو	جمال آرٹسٹ	۲۵۲ ۲۵۴
۱۳	پیام برادری	ایڈیٹر	۲۵۵

قیمت سالانہ عہ
فی پرچہ ۳ر

ایڈیٹر
محمد حسین حسان



پرنٹر پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی۔ محبوب المطابع پریس دہلی

بچوں سے باتیں

ابھی آپا جان مرحومہ کی موت کا غم تازہ تھا کہ ہماری جامعہ کی برادری کو ایک اور صدمے سے دو چار ہونا پڑا۔ ابھی پچھلی جولائی کو ہمارے محترم بھائی چودھری اکبر علی صاحب نے اس دنیا سے منہ موڑا۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ط

چودھری اکبر علی صاحب ہماری جامعہ کے سب سے پرانے طالب علم اور جامعہ کی تربیت کا صحیح نمونہ تھے۔ طالب علمی کے زمانے سے لے کر اب تک ہر شخص اُن کے گُن گاتا تھا۔ تندرست و توانا، خوش اخلاق اور زندہ دل۔ جامعہ سے بی اے کرنے کے بعد کچھ دنوں مکتبہ جامعہ کے مہتمم رہے اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان اور وہاں سے امریکہ گئے۔ امریکہ سے واپسی پر جامعہ میں آئے تو پہلے تعلیمی مرکز قرول باغ اور پھر مدرسہ ابتدائی جامعہ نگر (اوکھلا) کے نگراں بنائے گئے۔ ایک عرصے تک یہاں کام کرنے کے بعد رام پور کے محکمہ تعلیم میں سکریٹری ہوگئے اور نہایت کامیابی سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ یہیں درد سر کی شکایت پیدا ہوئی۔ ڈاکٹروں نے سر میں پھوڑا تشخیص کیا۔ یونانی، ڈاکٹری، ہومیوپیتھک سبھی طرح کے علاج ہوئے مگر موت کا کوئی علاج نہیں۔ ساری جامعہ اپنے اس بھائی کی بے وقت جدائی سے غمگین ہے۔ خدا سب کو صبر کی توفیق دے۔ آمین۔

پچھلے مہینے دو اور بڑے آدمی اس دنیا سے اُٹھ گئے۔ منشی دین محمد صاحب خوش نویس۔ اور حضرت مولانا اشرف علی۔ منشی دین محمد صاحب ہندوستان کے مشہور خوش نویس تھے۔ عربی خط خصوصاً بہت اچھا تھا۔ ۹۳ برس کی عمر پائی۔ بہت وضعدار اور خوش اخلاق بزرگ تھے اپنے فن سے سچی لگن رکھنے والے۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب ہندوستان کے مشہور عالم اور صوفی تھے۔ ساری عمر علم اور مذہب کی خدمت میں گذار دی اور ہزاروں، لاکھوں کو اپنے علم و عمل سے فیض پہنچایا۔

پیام تعلیم میں ایک عرصے سے سائنس کے مضمون زیادہ چھپ رہے ہیں۔ ہمارے مضمون نگار اور ہم خود ہمیشہ یہی کوشش کرتے ہیں کہ یہ مضمون زیادہ سے زیادہ دلچسپ انداز میں لکھے جائیں پھر بھی ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ پیامیوں کو یہ مضمون پسند بھی آتے ہیں؟ ہم نے کچھ عرصے سے رنگ بھرنے کی تصویروں کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے۔ پیامی ہمیں بتائیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں، تاکہ پرچے کی ترتیب میں ہم اُن کی خواہشوں کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھیں +



چاند کا بچہ

(از پروفیسر حامد اللہ افسر)

وہ دیکھو، وہ نکلا چاند ۔ اماں تم نے دیکھا چاند
یہ بھی کیا بچہ ہے اماں ۔ چھوٹا سا مُنّا سا چاند
اِتنا دُبلا اِتنا پتلا ۔ کب ہوتا ہے ایسا چاند

اماں اُس دن جو نکلا تھا ۔ وہ تھا گول بڑا سا چاند
بادل سے ہنس ہنس کر اُس دن ۔ کیسا کھیل رہا تھا چاند
چھپ جاتا تھا نکل آتا تھا ۔ کرتا تھا یہ تماشا چاند

اپنے بچے کو بھیجا ہے ۔ گھر میں بیٹھا ہوگا چاند
یہ بھی اِک دن بن جائے گا ۔ اچھا گول بڑا سا چاند
اچھا! اماں کل کیوں تم نے ۔ مجھ کو کہا تھا "میرا چاند"









نیلا پرندہ

سعید بھوپالی



کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا۔ اس کے ہاں ایک خوب صورت نوجوان شکاری ملازم تھا۔ اس کا نام شہباز تھا۔ شہباز روزانہ صبح سویرے شکار کی تلاش میں خوفناک جنگلوں میں نکل جاتا اور شام کو شکار لے کر واپس آتا۔ ایک دن شہباز نے ہرن کے شکار کا ارادہ کیا۔ لیکن کوئی ہرن دکھائی نہ دیا۔ اس سے اُسے بہت مایوسی ہوئی۔ اور سوچنے لگا کہ اب میں بادشاہ کو کیا جواب دوں گا۔ کوئی بھی شکار ہاتھ نہیں آیا۔ آخر شہباز ایک پہاڑ کے دامن میں ایک درخت کے نیچے نااُمید ہو کر بیٹھ گیا۔ اچانک اس کے پاس سے ایک بڑا سا نیلا پرندہ اُڑتا ہوا نکلا۔ شہباز نے جھٹ سے کمان سنبھال نشانہ لگایا۔ مگر تیر پرندے کے پر کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ یہ پر نیچے گر پڑا۔ وہ اس پر کو لے کر بادشاہ کے پاس گیا۔ ملکہ نے اس پر کو دیکھ کر کہا۔ "یہ نیلا اور خوب صورت پر تم کو کہاں سے ملا؟" شہباز نے سارا قصہ بیان کیا۔ ملکہ نے کہا۔ "اس پرندے کو تلاش کر کے لاؤ، ورنہ تمھاری خیر نہیں۔" شہباز نے کہا۔ "حضور اس کے لئے کافی مدت چاہیئے۔" ملکہ نے کہا۔ "جاؤ ہم تم کو ایک سال اور ایک دن کی مہلت دیتے ہیں۔"

دوسرے دن شہباز سویرے سے اس پرندے کی تلاش میں نکل پڑا، دیس دیس مارا مارا پھرا، مگر پرندہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ آخر کار جب شہباز بالکل ہی ناکام رہا تو ایک دیو کے مکان پر گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ دیو کے ایک نوکر نے دروازہ کھولا اور گرج کر پوچھا "کیا چاہتے ہو؟" شہباز نے کہا نیلے پرندے کی تلاش میں پھر رہا ہوں۔ ملکہ عالم کی خواہش ہے کہ وہ پرندہ ان کے حضور میں پیش کیا جائے۔"

اُس دیو نے کہا "وہ پرندہ لال دیو کا ہے۔ جسے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ اگر تم اس سے مانگو گے تو بہت غصہ ہوگا۔" جیسے ہی دیو نے یہ کہا لال دیو آگیا۔ خوفناک گرجتی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیا چاہتے ہو؟" شہباز نے کہا۔

جناب کے ہاں ملازم ہونا چاہتا ہوں۔" لال دیو نے لال لال آنکھیں نکالتے ہوئے کہا "تم کیا کام کر سکتے ہو؟" شہباز نے جواب دیا۔ "میں گلہ بانی اور شکار کر سکتا ہوں۔" دیو نے خوش ہو کر کہا۔ "ٹھیک بہت ٹھیک ہمیں بھی ایسے ہی نوکر کی تلاش تھی۔"

دوسرے دن سے شہباز اس کے ہاں باقاعدہ کام کرنے لگا، بطخوں، مرغیوں اور دوسرے جانوروں کی دیکھ بھال کا انتظام بھی شہباز کے سپرد کر دیا گیا۔ جب سات ہفتے گذر گئے، تو ایک روز لال دیو نے اپنے دل میں کہا۔ "یہ شخص بہت محنت سے کام کرتا ہے کیوں نہ اپنے عزیز پرندے کی دیکھ بھال اس کے سپرد کر دوں۔" شہباز روزانہ صبح شکار کر کے لاتا اور نیلے پرندے کو کھلاتا، جس سے لال دیو بہت ہی خوش ہوتا۔ ایک دن دیو ضروری کام سے باہر گیا۔ شہباز نے سوچا اب موقع اچھا ہے۔ میں اس پرندے کو کیوں نہ لے جاؤں۔ جیسے ہی وہ اس کو لے کر دروازے سے نکلا۔ اس کا پر دروازے سے چھو گیا اور ایک خوفناک آواز آئی۔ دیو فوراً اس آواز کو سن کر گھر آیا اور شہباز سے پرندہ چھین لیا۔ اور کہا۔ "جب تک میں یہ پرندہ تم کو نہیں دے سکتا جب تک تم مجھے سفید روشنی کی تلوار نہ لا کے دو گے۔" اور یہ کہہ کر شہباز کو گھر سے نکال دیا۔ راستے میں شہباز کو ایک بالشتیا ملا۔ اس نے بالشتیے کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ بالشتیے نے کہا۔ "میں اپنے کو ایک کشتی میں تبدیل کر لیتا ہوں تم اس میں بیٹھ کر سورج کے ملک میں چلو۔ یہاں سات دیونیاں ہیں وہ تلوار انھی کے پاس ہے۔ جب وہ سورج کے ملک میں پہنچے، تو شہباز کشتی سے اتر کر ان دیونیوں کے مکان پر گیا اور جا کر آواز دی۔ ایک خوفناک دیونی باہر آئی اور پوچھا "تم کیا چاہتے ہو؟" شہباز نے کہا "میں ملازم ہونا چاہتا ہوں۔" "تم کیا کام جانتے ہو؟" دیونی نے گرج کر سوال کیا۔ شہباز نے جواب دیا کہ میں تانبے، پیتل اور لوہے کو چمکا سکتا ہوں۔" دیونی یہ سن کر بہت خوش ہوئی، اور اسے ملازم رکھ لیا۔ تلواروں کی دیکھ بھال بھی اسی کے سپرد ہوئی۔ ایک دن ساتوں دیونیاں باہر سفر پر گئی ہوئی تھیں۔ شہباز نے تلوار لے کر بھاگنا چاہا۔ لیکن اچانک تلوار کی نوک دروازے سے چھو گئی اور ایک ڈراؤنی اور خوفناک آواز پیدا ہوئی اور ایک دم ساتوں کی ساتوں دیونیاں آموجود ہوئیں۔ اور شہباز سے تلوار لیتے ہوئے کہا "جب تک لال بچھڑا جو بادشاہ سبز ملک کے پاس ہے نہ لا دو۔ یہ تلوار نہیں لے جا سکتے۔" اور شہباز کو نکال دیا۔ شہباز واپس ساحل پر آ گیا۔ جب بالشتیے نے سارا ماجرا سنا تو اس نے شہباز سے کہا "اب میں ایک جہاز میں تبدیل ہوتا ہوں اور تم اس میں بیٹھ کر سبز ملک چلو۔ جب وہ سبز ملک پہنچے تو شہباز جہاز سے اتر کر بادشاہ کے محل پر گیا۔ بادشاہ نے پوچھا "کیا چاہتے ہو؟"

شہباز نے جواب دیا "میں ایک سائیس ہوں" چنانچہ بادشاہ نے شہباز کو بچھڑے کا محافظ بنا دیا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ بادشاہ اپنے محل سے سیر کرنے سبز پہاڑ پر گیا ہوا تھا۔ شہباز نے بچھڑے کو سے جانا چاہا۔ لیکن جوں ہی وہ دروازے کے پاس سے گذرا، بچھڑے کی دُم دروازے سے چھو گئی اور ایک گرجتی ہوئی آواز نکلی اور بادشاہ آموجود ہوا۔ اور کہا۔ "تم اس بچھڑے کو اس وقت تک نہیں لے سکتے جب تک میری شہزادی کو واپس نہ لادو۔ اس شہزادی کو ڈاکو لے گئے ہیں۔ شہباز پریشان بالشتیے کے پاس گیا۔ بالشتیے نے کہا "تم فکر نہ کرو، ہم شہزادی کو ضرور بلا سکتے ہیں" بالشتیا پھر سے جہاز بن گیا اور شہباز اس میں بیٹھ گیا۔ جہاز ساؤتھ لینڈ کی طرف چلنے لگا۔ جب جہاز ساؤتھ لینڈ کے ساحل پر پہنچا تو شہباز جہاز سے اتر کر ڈاکوؤں کے قلعے پر گیا اور دروازے پر دستک دی۔ ڈاکوؤں کا سردار باہر آیا۔ شہباز نے کہا "آپ میرا جہاز چل کر دیکھ لیجیے۔ میں اسے فروخت کرنا چاہتا ہوں، تھوڑی دیر میں شہزادی بھی آگئی

اور جب وہ جہاز کے تختے پر پہنچے تو جہاز کے ایک کمرے سے گانے کی آواز آنے لگی۔ یہ آواز بالشتیے نے جادو کے زور سے پیدا کی تھی۔ گانا اتنا اچھا تھا کہ اس کو سن کر ڈاکو، اس کی بیوی اور شہزادی فوراً سو گئے۔ اور جہاز سبز ملک روانہ ہوا، بادشاہ سبز ملک شہزادی کو دیکھ کر بہت خوش ہوا، اور اس نے ڈاکو اور اس کی بیوی کو قید کر دیا اور لال بچھڑا شہباز کو دے دیا جہاز پھر سورج کے ملک گیا اور ساتوں دیونیوں کو لال بچھڑا دے کر تلوار لے لی۔ جہاز پھر واپس اپنے ملک آگیا۔ اور شہباز نے لال دیو کو سفید روشنی کی چمکتی ہوئی تلوار دے کر نیلا پرندہ لے لیا۔ بالشتیا پھر اپنی اصلی حالت میں آگیا شہباز نے اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور ملکہ کے پاس گیا۔ ملکہ اس پرندے کو دیکھ کر بہت ہی خوش ہوئی۔ شہباز کو بہت دولت ملی اور بادشاہ نے اپنی لڑکی کی شادی شہباز کے ساتھ کر دی۔ بادشاہ کے مرنے کے بعد شہباز اس ملک کا بادشاہ بنا اور شہباز اور اس کی ملکہ ہنسی خوشی رہنے لگے

(انگریزی سے)

میاں چھبو کا بھیا

(محمد شفیع الدین نیّر)

خدا نے یہ دکھایا دن — بہت دن میں یہ آیا دن
میاں چھبو کے اک بھیا — ہوا ننھا سا منّا سا
بہت اچھا بہت پیارا — سبھی کی آنکھ کا تارا
یہ بچہ جب بڑا ہوگا — تو گھر بھر کا بھلا ہوگا
یہ جس دم مسکرائے گا — یہ جب باتیں بنائے گا
تو دل سب کا لبھائے گا — کلی دل کی کھلائے گا
کبھی گھوڑا بنائے گا — اسے سرپٹ بھگائے گا
کھلونے اپنے لیں گے — یہ دونوں مل کے کھیلیں گے

خدایا یہ دعا میری — کر اپنے فضل سے پوری
بڑھے ہر آن یہ بچہ — چڑھے پروان یہ بچہ
یہ پودا بارآور ہو — نصیبہ اس کا یاور ہو

رہے ماں باپ کا سایہ
سدا اس پر خداوندا



پگ ڈنڈی کی کہانی

(۲)

پروفیسر محمد عبدالغفور ایم اے

یہ عمارتیں تو پُرانی دلی کے دروازے سے باہر بنی ہیں مگر ان کا دل کہاں ہے۔ ان کا دل تو یہی لوہے کی لاٹ ہے جو یہاں سے نظر آرہی ہے یہ لاٹ تو یوں سمجھو گویا پُرانی دلی کا گھنٹہ گھر ہے۔ اسے مرکز مان کر ایک بڑا دائرہ کھینچو تو اس میں پُرانی دلی کی مشہور عمارتیں بھی آجائیں گی۔ رائے پتھورا کا قلعہ، قطب مینار، لال کوٹ وغیرہ۔

رائے پتھورا کا قلعہ وہی رومانی عمارت ہے جہاں ہندوستانی تاریخ کا وہ رنگین باب لکھا گیا ہے جسے پرتھوی راج اور سنجوگتا کا سچا افسانہ کہا جاتا ہے۔ اسی کے دروازوں نے اس جانباز گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنی ہو گی جو سنجوگتا کو سوئمبر کے جشن سے یوں اُڑا کرلے آیا تھا جیسے کوئی رنگین تتلی ہوا کے بازوؤں پر پرواز کر جائے۔ اس قلعے کی برجیوں نے ان الوداعی گیتوں کی صدا سنی ہوگی جو سنجوگتا اپنے بہادر پتی کے رخصت ہونے پر اکثر گایا کرتی تھی۔ اور پھر ڈھلتے ہوئے سایوں کے دھندلکے میں وہ آخری گیت جب اس نے پرتھوی راج کے آخری کارنامے کی خبر سُنی اور وہ ایک پتی پرتا بیوی کی طرح جوہر کے لپکتے ہوئے شعلوں میں کود پڑی تھی۔ اب بھی اس قلعے کے کھنڈر اپنی پرانی عظمت کی یاد دلاتے ہیں۔ قلعہ تو گر گیا ہے۔ فصیل کہیں کہیں ٹوٹی پھوٹی سی باقی رہ گئی ہے۔ اس کے نشانات ایک آدھ میل نہیں بلکہ دو دو تین تین کوس تک دکھائی دیتے ہیں۔

ویسے قلعہ تو تم جانتے ہی ہو کسی محفوظ جگہ ہی بنایا جاتا ہے۔ اس قلعہ کے بنانے والوں نے بھی ایک چھوٹی سی پہاڑی کا انتخاب کیا اور قلعے کی تعمیر کے بعد اس کے گرد خندق بنائی۔ اِدھر تو ہمارے دیس میں بارشیں کم ہونے لگی ہیں۔ اس زمانے میں خوب ہوتی تھیں۔ ہوتی تو اب بھی ہیں لیکن جو کچھ پانی برستا ہے وہ دیکھتے دیکھتے ندی نالوں کے راستے خدا جانے کہاں چلا جاتا ہے۔ اس زمانے میں دلی کے گرد بڑے گھنے جنگل تھے اور درخت تو

تم جانتے ہی ہو، زمین کو پانی جذب کرنے کے لئے ایسا بنا دیتے ہیں جیسے اسفنج، برسات کا سارا پانی زمین میں جذب ہو جاتا تھا اور پھر مہینوں چشموں اور تالاب کی سوتوں کی شکل میں رِستا رہتا تھا۔ اس قلعے کی خندق کے لئے بھی تمام جنگل کا پانی اِدھر اُدھر بند لگا کر گھیر لیا تھا اور بارہ مہینے لبالب پانی سے بھری رہتی تھی۔ پانی کی اس افراط کو کچھ ایسا زمانہ نہیں گذرا۔ غدر کے زمانے میں بھی یہ خندق اسی طرح لبریز رہتی تھی۔

جب قطب الدین ایبک ہندوستان کا بادشاہ بنا تو اُس نے رائے پتھورا کے قلعے کو ہی رہنے کے لئے انتخاب کیا۔ قطب الدین کے سر پر کام کا بڑا بھاری بوجھ آ پڑا تھا اُسے ایک پورے ملک کا سنبھالنا اور اس کا انتظام کرنا تھا اُسے اتنی فرصت کہاں تھی کہ بڑی بڑی عمارتیں بنانے پر توجہ صرف کرے۔ شروع شروع میں تو اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ پُرانے قلعے میں ضروری تبدیلیاں کرکے اپنے کام میں لے آئے۔ بہت لوگوں کو نئی چیزیں بنانے کا شوق ہوتا ہے لیکن پُرانی کام آنے والی چیزوں کو بلا وجہ رد کر دینا بھی کہاں کی عقل مندی ہے۔ اسی لئے اس قلعے کی عمارتوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا فنِ تعمیر آپس میں یوں مل گئے جیسے سنگم پر گنگا اور جمنا۔ دونوں دریا مل تو جاتے ہیں لیکن کافی دور تک دونوں کے دھارے صاف طور پر علیحدہ علیحدہ نظر آتے ہیں۔

چودھویں صدی کے مشہور سیاح ابن بطوطہ نے یہ گنگا جمنی طرزِ تعمیر اپنی آنکھ سے دیکھا تھا وہ لکھتا ہے کہ فصیل کے نیچے کا حصہ پتھر کا اور اوپر کا اینٹوں سے بنا تھا۔ اس فصیل کے اندر غلّے کے بڑے بڑے سرکاری گودام بنے تھے جو ضرورت کے وقت کام آتے تھے۔ حکومت بازار کے بھاؤ کو سختی سے کنٹرول کرتی تھی۔ اگر بازار میں بھاؤ تیز ہونے لگتا تو سرکاری ذخیرے کھول دئے جاتے تھے، اس سے بھاؤ پھر گر جاتا تھا۔ ان گوداموں میں غلّہ دو چار مہینے نہیں سالوں پڑا رہتا تھا، اور خراب نہ ہوتا تھا ابن بطوطہ کو نوّے سال کا رکھا ہوا چاول دکھایا گیا تھا لکھتا ہے کہ اس کا رنگ تو کچھ سیاہ پڑ گیا تھا مگر مزے میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

رائے پتھورا کے قلعے کے دس یا بارہ دروازے تھے۔ دروازے نہیں یوں سمجھو کہ اُن میں سے ہر ایک تاریخِ ہند کا تازہ باب تھا۔ ہر دروازے سے کوئی تاریخی جگہ یا واقعہ وابستہ ہے۔ مگر اب تو نہ در رہے نہ دروازے۔ محض فصیل کہیں کہیں سے رہ گئی یا پھر مسجد قوت الاسلام کی دیواریں اور ستون ہیں جو ہندو مسلم آرٹ کے امتزاج کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ان اسلامی عمارتوں

کے بنانے والے ہندو کاری گر تھے۔ انھی کی کاری گری کو جب تیمور نے دیکھا تھا تو حیران رہ گیا تھا۔ دولت سمیٹنے کا خیال تو دم بھر کے لئے بھلا دیا اور یہاں سے کاری گر اور سنگ تراش اکٹھا کرنا شروع کئے۔ انھی نے دارالسلطنت سمرقند کو مرکزی ایشیا کی دلھن بنایا تھا۔ ان کاری گروں کے کام میں ہندو مسلم اثرات کا امتزاج صاف جھلکتا تھا۔

اور پانی کی تو برگد میاں تم جانتے ہو ہمارے یہاں ضرورت رہتی ہے۔ جب تم ننھے سے تھے تو میں دیکھا کرتی تھی کہ تمھاری سبز کونپلیں دوپہر کو مارے گرمی کے کیسے ہانپا کرتی تھیں۔ اسی لئے تو کسی راہ چلتے دولت مند مسافر نے رحم کھا کر تمھارے پاؤں کے نیچے یہ تالاب بنایا تھا۔ پرانی دلّی میں بھی کئی ایک تالاب بنائے گئے ان میں سے اننگ پال نے انگ تال بنوایا تھا۔ یہ بھی کسی زمانے میں بڑی تفریح گاہ رہا ہوگا۔ علاءالدین کے زمانے تک تو اچھی خاصی حالت میں تھا۔ جب بادشاہ اپنی ادھوری لاٹ بنوانے لگا تو بڑی مشکل ہوئی۔ لاٹ کا بنانا ایسا آسان کام تو ہے نہیں کہ بھشتی نے ایک مشک چھوڑی اور تعمیر کے لئے جل تھل کر دیا اس کے لئے تو بہت پانی چاہئے تھا۔ اسی لئے اس تالاب سے پانی کی نالیاں نکالی گئیں، جن سے پانی ہوتا ہوا لاٹ تک پہنچتا تھا۔ ان نالیوں کے نشان اب بھی کہیں کہیں ملتے ہیں۔

پرانی دلی میں دریا کے کنارے گھاٹ تو ہوتے ہی ہوں گے۔ بعض تفریح گاہیں بھی تھیں۔ انھی میں سے سلیم گڑھ کے نیچے والی نیلی چھتری ہے۔ کس قدر رومان انگیز اور پر لطف جگہ ہے۔ اسی لئے تو ایک دوسرے کے بعد کئی ایک مغل بادشاہ یہاں آکر جمنا کا لطف اٹھاتے رہے ہیں۔ ہمایوں نے یہیں پر عمارت بنائی تھی اور فطری مناظر کے دلدادہ جہانگیر نے بعد میں اس کی مرمت کرا کے اس پر ایک شعر بھی کھدوایا تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جگہ بڑے لطف اور مزے کی ہے اسی لئے بادشاہ ہمایوں کی تفریح گاہ رہی ہے۔ عام لوگ ہمایوں کو تو بھول گئے اور اسے جہانگیر کا بنگلہ کہتے ہیں۔

ہاں برگد بیٹا پرانی دلّی میں بڑی تفریح گاہیں تھیں۔ دلّی والے تفریح کے بڑے دلدادہ تھے۔ ایک زمانے میں پھولوں کی سیر بڑی دھوم دھام سے ہوتی تھی۔ مگر اب وہ دن کہاں۔ اب تو حوض شمسی اور حوض خاص تک خشک ہوگئے اور (تارکول کی سڑک کی طرف اشارہ کرکے) سڑکیں بھی اب ایسی رہ گئی ہیں جن پر نہ ٹھیرنے کو سرائے نہ پینے کو پانی"



ایک قطرا

جلال الدین احمد - لکھنؤ

شبنم جیسا اک قطرا ۔ بادل بادل پھرتا تھا
تنہا ہوں میں تنہا ہوں ۔ من ہی من میں کہتا تھا
میں تو چھوٹا قطرا ہوں
کیوں کر برسوں آخر میں
"دُنیا اتنی ہے چوڑی ۔ اتنی چکلی اور لمبی !!"
"میں ہوں چھوٹا اک قطرا ۔ دُنیا پیاسی ہے اتنی"
قطرا ہوں میں شبنم کا
کیوں کر برسوں آخر میں
بادل گھر کر پھر آئے ۔ باغ و گلشن پر چھائے
چھوٹا قطرا حیراں تھا ۔ جانے باری کب آئے

من[1] میں قطرا کہتا تھا
کیوں کر برسوں آخر میں؟

پہلا جھونکا جو آیا! — جاگا دل اس قطرے کا
پیچھے جیون ساتھی تھے — آگے آگے تھا قطرا

پیچھے جیون ساتھی ہیں!
کیوں کر ٹھہروں آخر میں؟

کھل کر برسے وہ بادل — دھرتی پیاری ہوئی جل تھل
ڈالا برکھا نے ہر سو! — سُندر سپنوں کا آنچل

"میری طاقت اتنی ہے!"
کیوں کر ٹھہروں آخر میں؟

سب سے مل کر وہ قطرا — دریا دریا پھرتا تھا
موتی بن کے زینت دی — تاج شاہی میں چمکا!

سب سے کہتا پھرتا ہے
کیوں کر ٹھہروں آخر میں؟

[1] ان مصرعوں میں "من" کے بجائے "دِل" کا لفظ بھی استعمال ہو سکتا ہے۔

ہماری زمین

(جولائی سے سلسلہ ملا کر پڑھو)

واجد میاں بولے: "آخر یہ ختم کیسے ہو گئے؟" میں نے کہا "شاید یہ بات ہوئی کہ اُن کے بعد جو جانور پیدا ہوئے وہ اُن سے ہلکے پھلکے اور عقل میں اُن سے تیز تھے۔ اُنھوں نے اِن بھاری بھرکم بودے اور کم عقل جانوروں کا مقابلہ کرکے اُنھیں ختم کر دیا۔

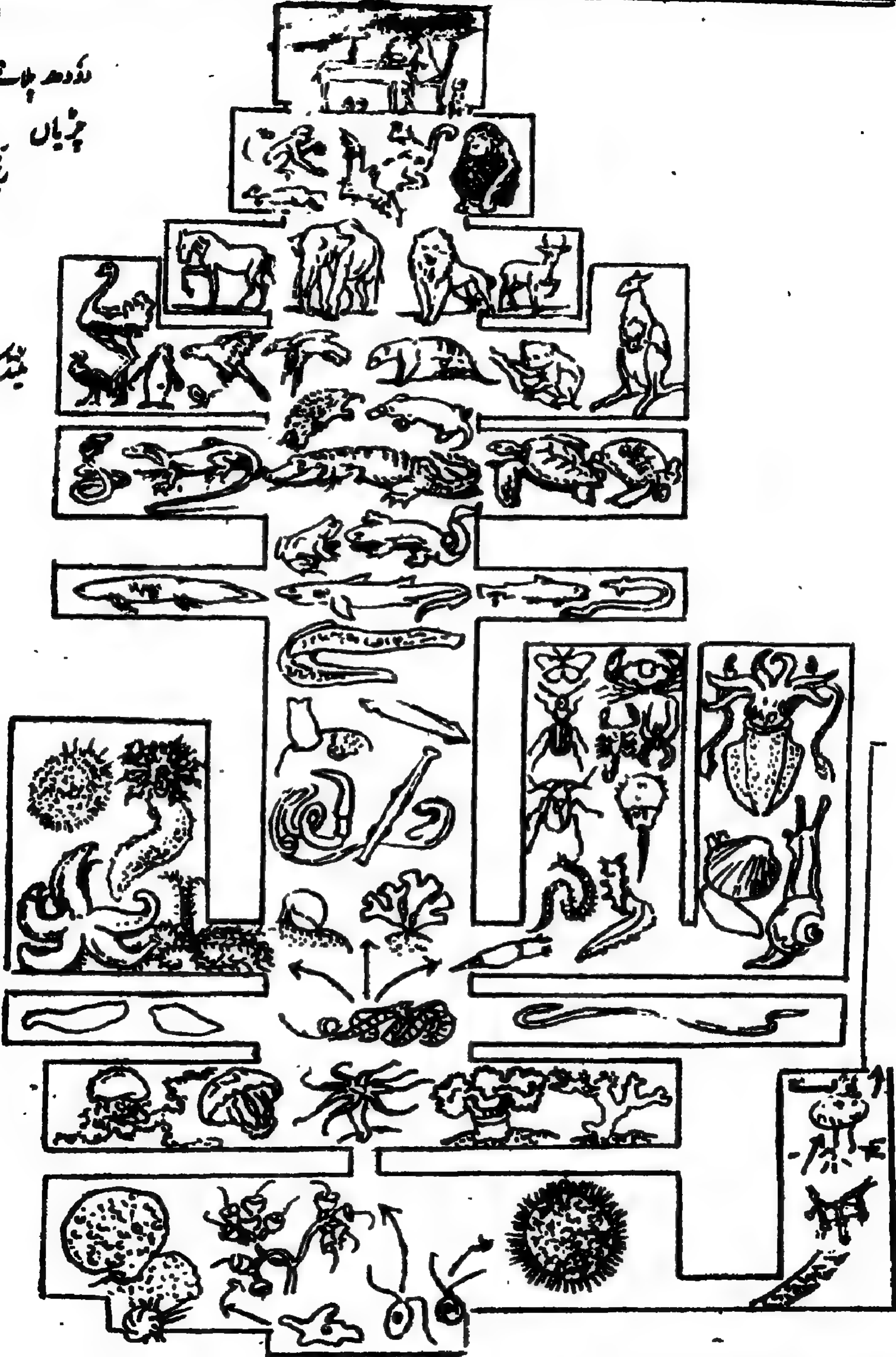
یہ جانور دودھ پلانے والے جانور تھے اور اِن پہلے جانوروں سے لاکھوں سال بعد پیدا ہوئے اچھا دیکھو یہ تصویر دیکھو۔ اُسی زمانے کے ایک جانور کی ہے" واجد میاں بولے "یہ تو کچھ کچھ ہاتھی کی طرح معلوم ہوتا ہے" میں نے کہا "واہ جناب یہی تو آپ غلط سمجھے۔ یہ اُس کی سونڈ نہیں، دو نوک دار سینگ ہیں جو ٹھیک اُس کی ناک پر ہوتے تھے۔ یہ جانور آج کل کے گینڈے کے برابر ہوتا تھا۔

اچھا یہ تصویر دیکھو۔۔۔۔۔۔ یہ جانور کتنا خطرناک معلوم ہوتا ہے" واجد میاں نے کہا "پیارے بھائی اس کی شکل تو کچھ کچھ شیر سے ملتی جلتی ہے"

اور اس کے اگلے دو دانت تو دیکھئے بالکل جیسے خنجر۔ میں نے کہا "ہاں اسی لئے اسے خنجر کی طرح دانت رکھنے والا شیر کہتے ہیں۔ عائشہ ایک اور تصویر دیکھ کر بولیں: "اُف نوہ کتنا بڑا ریچھ!" میں نے کہا "ہاں اس کی لمبائی کوئی پونے سات گز تھی۔ اور جب پچھلے پیروں پر بیٹھتا تھا تو چار گز اونچا ہوتا تھا۔ گھاس پات کھاتا تھا اور سیدھا جانور تھا اب سے کوئی دس لاکھ سال پہلے پایا جاتا تھا۔ کوئی عجب نہیں جو لوگ اسے پالتے بھی ہوں۔ اس کا پنجر ایک انسانی ڈھانچے کے ساتھ پایا گیا ہے"

ماموں صاحب اب تک بہت غور سے تصویریں دیکھ رہے تھے۔ میری بات سُن کر ایک دم چونک پڑے اور کہنے لگے "ارے بھئی یہ بیچ میں آدمی کہاں سے کود پڑا۔ میں نے کہا "اِس زمانے میں حضرت انسان پیدا ہو چکے تھے" واجد میاں بولے "دس لاکھ سال پہلے!! اُف نوہ!!!" میں نے کہا:

ف۔ اس مضمون کی سب تصویریں جولائی کے پرچے میں چھپ چکی ہیں۔


انسان
دودھ پلانے والے جانور
چڑیاں
رینگنے والے جانور
مینڈک کی قسم کے جانور
مچھلیاں
بے ریڑھ کے جانور
دنیا کی پہلی مخلوق۔

"جی ہاں جناب اِس سے بھی پہلے سے تمھیں یہ مدّت بہت معلوم ہوتی ہے مگر زمین کی عمر کے مقابلے میں بہت کم ہے بہت ہی کم۔ اچھا دیکھو الماری میں وہ موٹی سی سُرخ جلد کی کتاب رکھی ہے۔ اُسے اُٹھا لاؤ۔ ہاں یہی۔ اس میں کل کتنے صفحے ہیں؟ بالکل ٹھیک پان سو ہیں۔ اچھا اَور ہر صفحے میں کوئی ۳۳۰ لفظ ہوں گے اَور ہر لفظ میں کوئی چھ حرفوں کا اوسط رکھ لو۔ تو میرے بھائی انسان کی زندگی جب سے اُس نے آدمیت اَور انسانیت کا جامہ پہنا اس کتاب کے ایک لفظ کے برابر ہے اَور اگر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے وقت سے شمار کرو تو بس ایک حرف کے برابر۔" واجد میاں اِس مثال کو سُن کر کچھ چکرا سے گئے۔ معلوم ہوتا تھا یہ بات اُن کے دماغ میں بیٹھی نہیں۔ میں نے کہا اچھا ایک اَور مثال سے میں تمھیں سمجھاتا ہوں۔ دیکھو کسی ستر فٹ اُونچے مینار پر ایک پیسہ رکھو دو۔ اس پیسے پر ایک پیسہ والا ٹکٹ رکھ دو فرض کرو دُنیا کی عمر بس اتنی ہے اچھا اب آدمی کی عمر کتنی ہے اس پیسے اَور ٹکٹ کے برابر یعنی پیسے اَور ٹکٹ کی موٹائی اس کی اس عمر کو ظاہر کرتی ہے جب سے اُس نے آہستہ آہستہ تہذیب و شائستگی سیکھی دیکھا! کتنا فرق ہے!"

اچھا اب یہ نقشہ دیکھو اس سے تمھیں اندازہ ہوگا کہ زمین پر زندگی کی نمود کس طرح شروع ہوئی اَور کس طرح اُس نے آہستہ آہستہ ترقی پائی۔

تمھیں ایک دلچسپ بات اَور بتائیں، سائنس والوں کا خیال ہے کہ اللہ میاں نے انسانوں کو یونہی نہیں پیدا کر دیا۔ اُس نے آہستہ آہستہ ترقی کر کے یہ شکل و صورت پائی ہے۔ بلکہ بعض سائنس والوں کا تو خیال ہے کہ انسان پہلے بندر تھا۔" اس بات پر سب کو ہنسی آ گئی۔ واجد میاں بولے:۔ "دیکھو عائشہ آپا تم بندروں کو بہت بُرا بھلا کہتی تھیں۔ اب اُن کی عزت کیا کرو یہ تمھارے بزرگ ہیں۔" عائشہ بولیں۔ "میرے کیوں بزرگ ہوتے۔ بزرگ ہوں گے تمھارے۔ ایسی بے عقلی کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔" ماموں صاحب نے فرمایا "یہ تو تم نے بہت دلچسپ بات کہی مگر سائنس والوں کے پاس اس کا کچھ ثبوت تو ہوگا۔" میں نے کہا "وہ تو بہت سے ثبوت پیش کرتے ہیں مثلاً وہی تہوں والی بات۔" ماموں صاحب نے کہا "وہ کیسے؟" میں نے جواب دیا مثلاً ایک تہہ کھودی گئی تو اب سے کوئی پانچ سو برس پہلے کی باتیں معلوم ہوئیں۔ اَور کھودا گیا تو چار پانچ ہزار برس پہلے کے ہتھیار وغیرہ ملے اَور اُن سے اس زمانے کے حالات معلوم ہوئے۔ اس سے نیچے

کی تہہ میں پتھر کے ہتھیار ملے۔ گویا اس زمانے میں لوگ پتھر کی چیزیں استعمال کرتے تھے آخر ایک تہہ ایسی آئی جس میں بندروں کے ڈھانچے ملے۔" ماموں صاحب نے لقمہ دیا" تو اس سے یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ انسان بندر سے پیدا ہوا ہے ؟" میں نے کہا" یہ تو ابھی میں نے ایک ہی بات کہی تھی اچھا دیکھئے بندر کے دُم ہوتی ہے ؟" واجد میاں ہنس کر بولے " واہ پیارے بھائی یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ؟" میں نے کہا تو جناب انسان کے بھی دم ہوتی ہے ! اس پر سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ فہمیدہ بی بولیں :۔" لے ہے آج یہ بہت بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ نہ جانے کچھ کھا پی لیا ہے یا کیا بات ہے۔" واجد میاں بولے :۔" تو وہ دم پھر کہاں چلی گئی پیارے بھائی ؟" میں نے کہا :۔ بات یہ ہے کہ جب کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی تو قدرت اُسے آہستہ آہستہ خود ختم کر دیتی ہے۔ اسی طرح یہ دم بھی ختم ہو گئی۔ مگر پیچھے کی ہڈی میں اس کا نشان ابھی باقی ہے۔ علاوہ اِس کے سائنس والوں نے مرے ہوئے آدمی اور مرے ہوئے بندر کے ڈھانچوں کو ملا کر دیکھا دونوں میں بہت سی ہڈیاں ایک سی نکلیں۔ عائشہ خاتون بولیں :۔ واہ پیارے بھائی آدمی ہو تو آپ جیسا اچھے خاصے آدمی کو بندر بنا دیا ؟" واجد میاں جھٹ بول اُٹھے :۔ تو اُنھوں نے یونہی خالی مولی تھوڑی بنا دیا۔ اُسے ثابت بھی تو کر دیا تم تو یونہی بیچ بیچ میں بول اُٹھتی ہو۔"



مجیب الرحمٰن۔ ابتدائی ششم
تعلیمی مرکز نمبر ۱ جامعہ۔

دوسرے دن صبح کو جلدی جلدی ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر سیدھے تاج محل کی طرف چلے۔ ہم میں سے ہر ایک کے دل میں کچھ عجیب خوشی اور بے چینی تھی۔ بس یہ جی چاہتا تھا کہ پر لگ جائیں اور ہم تاج محل پہنچ جائیں۔ آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ہمارا قافلہ تاج محل کے سامنے تھا۔ سبحان اللہ کیا شاندار عمارت ہے۔ کیسی خوب صورت، کتنی خوش نما کہ بس دیکھے جاؤ، سارا مقبرہ سنگ مرمر کا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی بن کر تیار ہوا ہے اندر اور باہر سنگ مرمر کی کھدائی اور نقش و نگار کی خوب صورتی کا اندازہ دیکھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ ہم سب تو کچھ عجیب حیرانی کے عالم میں تھے دنیا کی اس خوب صورت اور شاندار عمارت میں دو خوش قسمت میاں بیوی دفن ہیں۔ شاہ جہاں اور اس کی چہیتی بیوی ارجمند بانو یا ممتاز محل۔ شاہ جہاں کو اپنی اس بیوی یعنی ممتاز محل سے بہت محبت تھی۔ جب اس کا انتقال ہوا تو کروڑوں روپئے صرف کرکے اس کے لئے عالی شان مقبرہ بنایا، کوئی بیس سال میں تو عمارت مکمل ہوئی۔ بعد میں خود شاہ جہاں بھی اپنی چہیتی بیگم کے پہلو میں دفن ہوا۔

اس عمارت کو لوگ دور دور سے دیکھنے آتے ہیں۔ لکھنے والوں نے اس کی تعریف میں اردو، انگریزی اور جانے کن کن زبانوں میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ عمارت ہی ایسی ہے کہ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

عمارت کا صدر دروازہ بہت خوب صورت اور عالی شان ہے۔ اس پر ایک چھوٹا سا عجائب خانہ ہے۔ عجائب خانے میں مغلیہ عہد کی بہت نادر نادر چیزیں رکھی ہیں۔ تاج اس دروازے کی بالکل سیدھ میں ہے۔ دروازے سے نکل کر

فوراً ہی حوض نما نالیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ ان نالیوں کے دونوں طرف ہری ہری گھاس پھلواری اور سرو کے درخت ہیں جو تاج کی شان کو دو بالا کر رہے ہیں۔ تاج اور سروزار کے درمیان سنگ مرمر کا ایک چبوترہ ہے۔ اس پر بیٹھ کر دیکھنے سے تاج کچھ اور شان سے نظر آتا ہے۔ چبوترے سے آگے تھوڑی دور تک پھر نالیاں ہیں۔ اس کے بعد تاج کا وہ چبوترا ہے جس پر تاج بنا ہوا ہے۔ چبوترے کے چاروں کونوں پر چار مینار ہیں۔ اسی طرح تاج کے چاروں کونوں پر چار چھوٹی چھوٹی برجیاں ہیں۔ ان کے بیچ میں سنگ مرمر کا دودھیا باسٹھ فٹ بلند گنبد ہے۔ اس کا کلس ۲۵ فٹ کا ہے۔ نیچے تہ خانہ ہے۔ اس کے اندر کافی اندھیرا ہے۔ یہیں شاہ جہاں اور ارجمند بانو دونوں برابر برابر لیٹے ہوئے آنے والوں کو آٹھ آٹھ آنسو رلانے پر مجبور کرتے ہیں اور خدا کی قدرت یاد دلا کر صبر و شکر کی تلقین کرتے ہیں۔

تاج محل کے مشرق و مغرب میں ایک نقشے کی دو عمارتیں سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک مسجد ہے اور دوسری تلاوت گاہ۔ اس تلاوت گاہ اور مسجد نے تاج کی خوب صورتی کو اور بھی چمکا دیا ہے۔ اس عمارت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے دیکھنے سے جی نہیں بھرتا۔ دن میں دیکھئے تو رات میں دیکھنے کی حسرت رہتی ہے۔ رات میں دیکھئے تو دن میں دیکھنے کی آرزو چٹکیاں لیتی ہے۔ کبھی شام اور کبھی دن کی حسرت باقی رہتی ہے اسے جس وقت دیکھئے اپنی نرالی شان میں نظر آتا ہے۔ اور کبھی اس کے دیکھنے سے جی نہیں بھرتا۔ ہم نے تو اسے دن میں پو پھٹنے سے پہلے دیکھا تھا اور ہمارے خیال میں یہ سب سے اچھا وقت ہے ✢

تندرست لڑکے کا لباس

خان الیاس احمد صاحب مجتبیٰ

بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی

جناب خان الیاس احمد صاحب مجتبیٰ نے یہ مفید مضمون بہت دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ لباس کی یکسانیت پر سوائے چند قومی درسگاہوں اور چند یتیم خانوں کے ابھی تک کسی نے توجہ نہیں کی ہے مجتبیٰ صاحب کے مضمون سے اس بات کی اہمیت اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔ اسی لئے ہم آل انڈیا ریڈیو دہلی کی اجازت سے آج یہاں شائع کر رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ ہمارے پیامی دوست اُن کے سرپرست دونوں اسے دلچسپی سے پڑھیں گے۔

(ایڈیٹر)

مشہور کہاوت ہے۔ کھائے من بھاتا، پہنے جگ بھاتا؛ بات بڑی "باون تولے پاؤ رتی" ہے مگر یہاں بس پہننے کی بات ہے، کھانے کی نہیں۔ یہ اور بات ہے آج کل بھلے مانس غریبوں کو دونوں کے لالے پڑے ہیں۔

مشکل یہ ہے ہمارے دیس میں تو کوئی لباس ابھی تک خود بڑوں نے اپنے لئے طے نہیں کیا بلکہ اس سے پہلے شاید اس بات کو سوچا بھی نہ تھا۔ کیا عجب کہ آل انڈیا ریڈیو دہلی کی توجہ سے اب دوسرے بھی توجہ کریں۔ لڑکے تو لڑکے ٹھیرے، بڑوں کے بس میں۔ ماں باپ جو بھی پہنا دیں یا پہنا سکیں بڑوں کا حال یہ ہے کوئی سر سے پاؤں تک شُدھ کھادی میں لپٹا ہے تو کوئی خاص لنکا شائر کی آدھی ململ، ڈھاکا کا چکن شریف کا لفافہ بنا ہوا ہے؛ کوئی بس کرتے تہبند پر اڑ بیٹھا ہے تو کوئی ٹائی کالر، سوٹ بوٹ، جرسی نیکر سے کم پر راضی نہیں! علیٰ ہذا القیاس۔ جب چاہے دیکھ لیں کسی جگہ ۱۰، ۵ ہی سہی، پر خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ۱۰، ۵ ہی وضع کا لباس نظر آئے گا۔ بعض تو بس کارٹون سمجھئے۔ اس سے بھی زیادہ مزے دار بات ہے۔ بعض وہ ہیں کہ آج دیکھا چکن کا کرتا، ادھی کا انگرکھا۔ چوڑی دار آڑا پاجامہ دوپلی ٹوپی، دلی کی جوتی ہے تو کل وہی صاحب خانی کرتے میں! کرتے پر جواہر کٹ صدری، سر پہ

حامد کیپ اور پاجامہ علی گڑھ کاٹ کا! پرسوں جو دیکھا تو آٹھوں گانٹھ کمیت پورے صاحب بہادر۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ اس سے صاف صاف یہ پتہ چلتا ہے کہ لوگ معمولی باتوں میں بھی ایک خیال اور ایک رائے نہیں رکھتے اور نہ غور کر کے کسی ایک بات پر قائم رہتے ہیں آج یہ تو کل وہ۔ ہماری ان بچکانہ باتوں کو دیکھ دیکھ دوسرے ہم پر ہنستے ہی ہوں گے۔ بہت سی بے تکی باتوں کی طرح وضع قطع کا لباس بھی ہمارے دیس کی ایک خاص بات ہے جو اور کہیں نہیں۔

لباس کیسا ہو، کیا ہو...... یہ تو جب کبھی اپنی ریاست بنے تبھی ہمارے دیس کو ہمارا دیس بنانے والے طے کریں گے۔ اب تو بس یہ ہے کہ پہناوا کوئی بھی اور کچھ بھی سہی پر ہو صاف ستھرا؛ ایسا جس سے تمیز اور سلیقہ پایا جائے۔ بتائیے یہ بھی کوئی بات ہے کہ آپ کے ننھے میاں شیروانی تو پوتھ کی ڈانٹے ہیں مگر دامن پر سالن کے دھبے لگے ہیں! اس سے تو بس گاڑھے کا ایک اُجلا اُجلا کرتا ہی بھلا۔ یا پھر یہ بھی کوئی تک ہے کہ جامہ وار کا انگرکھا اس پر پیلینٹ۔ سر پر زری کی ٹوپی، پاؤں میں سلیپر ہی! ڈھنگ سر تو ہر بات میں لازم ہے۔ ان مل بے جوڑ بات نہیں بھاتی۔

ہندوستانی لباس طے کرتے وقت یہاں کے معاشی حالات اور یہاں کی آب و ہوا کا خیال بھی رکھنا ہو گا۔ یکسانیت اور صفائی ستھرائی رہے تو ہر وضع کا پہناوا بھلا ہی لگتا ہے۔ ہر حال میں لباس ایسا ہو جو صحت کے لئے مضر نہیں بلکہ مفید ہی ہو۔

آئے دن سنتے ہیں۔ "صاحب کپڑا تو میل خورا ہونا چاہیئے، خاص کر لڑکے بالوں کے لئے تو اور بھی" کیا خوب! اس کا مطلب یہی تو کہ میل ہو پر میل پہچان میں نہ آئے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ اس دھوکے سے بچوں کی تندرستی کو گھن لگ جائے گا۔ صحت نہیں تو کچھ نہیں۔

آدمی کے ہاتھ پاؤں وغیرہ اور دماغ ٹھیک ٹھیک اپنا کام کرے؛ بس یہی تندرستی ہے، یہی زندگی ہے اور اسی میں زندگی کا مزا ـــــ دنیا میں جہاں بے شمار نعمتیں ہیں انسان کے پیچھے بہت سی آفتیں بھی لگی ہوئی ہیں۔ جن سے تندرستی میں خلل پڑتا ہے۔ بہتیری ایسی ہیں کہ اُن کا بچاؤ ممکن ہے۔ ہاں مگر سمجھ بوجھ درکار ہے۔ بعض وہ چیزیں اور کام ہیں کہ اُن کے وسیلے سے تندرستی قائم رہ سکتی ہے؛ ایک اُن میں سے لباس ہے۔

باہر کی سردی گرمی سے بدن کو بچانا ضروری ہے تاکہ اُس کی اندرونی حرارت اس طرح قائم رہے

کہ نہ زیادہ ہو نہ کم۔ یہ بات بہت کچھ تو بدن کی جلد سے بھی آپ ہی آپ حاصل ہوتی ہے مگر پوری پوری نہیں۔ جانوروں کی کھال کو اون اور پروں سے مدد ملتی ہے۔ انسان کے دماغ اور اس کی اُپج نے لباس ایجاد کر ڈالا۔

لباس ایسا ہو کہ سردی میں اندر کی حرارت کو روکے رہے اور گرمی میں باہر کی لو لپٹ سے بچائے رکھے۔ تیسری چیز ہے سجاؤ اور سجاوٹ۔ وہی "جگ بھاتا" والی بات! اچھا تو اب یہ بات نکلی کہ اچھا لباس وہ جو سب سے پہلے تو صحت کو اچھا رکھے پھر کچھ اور۔

اس لئے پہناوا ہلکا پھلکا ہو، ڈھیلا ڈھالا۔ بچوں کے لئے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں کی ضرورت خاص کر ہے؛ بڑھتے بدن اور بڑھتے خون کے لئے کوئی روک ٹوک ہرگز نہ ہونی چاہئے۔ بھاری لباس تکلیف بھی دیتا ہے اور کام کاج، چلنے پھرنے میں اس سے اُلجھن بھی ہوتی ہے۔ چست کپڑے تو ہمیشہ نقصان ہی پہنچاتے ہیں۔ مثلاً ٹوپی اگر تنگ ہو تو خون کی رگوں کو بھینچتی ہے، اس سے کیا ہوتا ہے؟ اچھا خاصا آدمی لگن سر سے گنجا! تنگ کالر سے بھی خون کی رو سست پڑ جاتی ہے جس سے سر درد کرنے لگتا ہے۔ گھٹنوں اور پنڈلیوں پر تنگ موزے اور ان پر تنگ الاسٹک (بند) چڑھانے سے پاؤں کی نسوں پر دباؤ پڑ کر تکلیف ہوتی ہے اور بعض جلدی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ نیچلے یا تیلی ٹو کے جوتے سے پیروں میں گھٹے پڑ جاتے ہیں۔ بہت گف کپڑے بھی ٹھیک نہیں۔ کچھ نہ کچھ چھیدرے مثلاً کھدر کے، پسینہ خوب کھینچتے اور بدن کو بُرے اثر سے بچاتے ہیں۔

بھاری کام یا ورزش کے وقت بہت ہلکے پھلکے اور ڈھیلے ڈھالے کپڑے ہوں۔ کام بنڑ جائے تو فوراً بدل ڈالیں یا ان ہی پر کچھ گرم لباس پہن لیں۔ —— تر کپڑوں سے بدن کی قدرتی گرمی خارج ہونے لگتی ہے۔ اس سے طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

رات کا لباس خاص کر خوب ڈھیلا ڈھالا ہو تاکہ سانس لینے اور کروٹ بدلنے میں رکاوٹ نہ ہو۔ سونے سے پہلے دن کے کپڑے بدل ڈالیں۔ پہنے ہوئے کپڑوں کو ہوا اور دھوپ دکھالیں اور اچھی طرح جھاڑ جھٹک کر دوبارا پہنیں۔ —— سر اور گدی کو دھوپ سے بچائے رکھیں۔ یہاں دماغ اور بعض بہت نازک رگیں ایسی ہیں کہ بہت جلد انھیں نقصان پہنچ جانے کا ڈر ہے۔ اس کے لئے ہیٹ (HAT) خوب چیز ہے۔

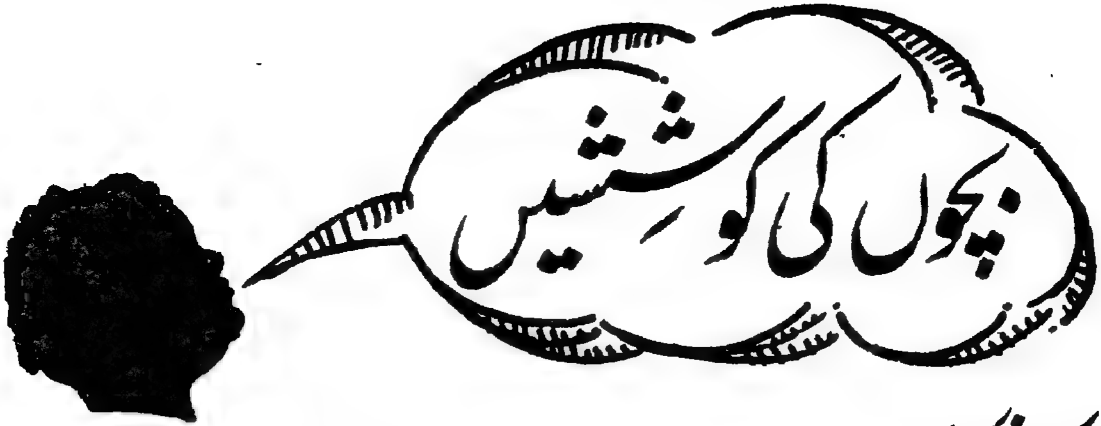
رنگین کپڑے بدن سے الگ رہیں تو اچھا ہے۔ کیونکہ بعض رنگوں میں زہر ہوتا ہے اور پسینے سے چھوٹ کر برا اثر کر سکتا ہے ———

کالا رنگ سورج کی کرنوں کو کھینچتا ہے، وہ گرم ہوتا ہے۔ سفید گرمی کو باہر پھینکتا ہے۔ اسی لئے گرمی میں سفید کپڑے ٹھنڈے ہوتے ہیں، نظر کو بھاتے ہیں۔ آرام بھی پہنچاتے ہیں۔

زندگی اور رہن سہن کی بہت سی چیزیں ایسی ملی جلی ہیں کہ ایک کو دوسری سے الگ نہیں کر سکتے۔ مثلاً عام طور پر سنا کرتے ہیں کہ "صاحب خوب صورت آدمی پر ٹاٹ بھی بھلا لگتا ہے" معلوم ہوا پہناوے سے اچھی صحت کا درجہ اونچا ہے یا دونوں کا زبردست رشتہ ہے۔ پھر کیوں نہ شروع ہی سے ایسا کچھ ہو کہ بچوں کے لباس میں اس بات کا دھیان رکھا جائے۔ یہاں یہ بات بھی بھولنے کی نہیں کہ خوب صورتی کا مطلب اچھا رنگ روپ نہیں؛ خوب صورتی نام ہے اچھی صحت کا مضبوط اور سڈول بدن کا۔

بچوں کی تربیت کے بہت سے اور مختلف شعبے ہیں؛ اچھی عادت خصلت ہو تو اچھی نظر بھی، اچھا ذوق بھی۔ شروع سے لال پیلے کپڑے شوخ رنگ کا لباس بچوں کو بدمذاق بناتا ہے آگے چل کر وہ ستھرے مذاق کی چیزیں نہ پسند کرتے ہیں نہ اس کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بڑوں کے مقابلے میں بے شک شوخ رنگ کے کپڑے بچے پسند کرتے ہیں مگر ان میں بھی سلیقہ اور جوڑ میل رنگ اور تمیز سکھانی بڑوں کا کام ہے۔ اسے کوئی بس آرٹ ہی آرٹ نہ سمجھے۔ آرٹ ہی سہی۔ تب بھی آرٹ بغیر کہاں بچ سکتے ہیں۔ ہندوستانی کرتا ترکی قمیص، پارسی کوٹ، حیدرآبادی شیروانی وغیرہ وغیرہ سب آرٹ ہی کے تو کرشمے ہیں۔ نہیں تو تن ڈھانکنے کو ایک لمبی سپاٹ کفنی بھی کافی ہے۔

لباس کی وضع قطع اور گنتی، ادب تمیز اور حیا شرم کے برخلاف نہ ہونی چاہیے۔ لے دے کر حیا اور شرم ہی ہمارے دیس کا وہ خاص نشان ہے جس پر ہمارا ناز بے جا نہ تھا مگر افسوس! اب تو یہ جوہر بھی ہمارے ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے ——— لباس میں ملکی رسم و رواج اور قومیت کا لحاظ بھی رہے تو کچھ برا نہیں اچھا ہے ——— ایسا مہین کپڑا پہننا جس سے نہ تن ڈھکے نہ بدن کی حفاظت ہو۔ بدتمیزی اور سراسر نادانی کی بات ہے +



مچھلی کا شکار

ابوالخیر کشفی، حلیم کالج، کانپور

پچھلے بڑے دن کی چھٹیوں میں، سلیم اور جمیل ایک گاؤں "مہمان" گئے اور وہاں کے زمیندار کی کوٹھی میں ٹھیرے ایک دن بیٹھے بیٹھے ہم لوگوں کو خیال آیا کہ مچھلی کے شکار کو چلنا چاہیئے۔ طے ہوا کہ پرسوں چلیں۔ مگر سب انتظام ابھی سے کرلیں۔ شام کو ہم تینوں تالاب کے کنارے پہنچے اور نیم کی خید ٹہنیاں پتھر کے نیچے دبا دیں کہ ان سے جونکیں لپٹ جائیں پھر گھر آکر بنسی وغیرہ کا انتظام کیا۔

خدا خدا کرکے شکار والی رات آئی۔ نوکر نے ہمیں چار بجے اٹھا دیا۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہوکر کوئی پانچ بجے ہم تالاب کی طرف روانہ ہوگئے۔ نوکر کو ہدایت کردی کہ دس بجے پانچ آدمیوں کا کھانا تالاب پہنچا دے۔ دو میل کا فاصلہ تھا ایک گھنٹے میں پہنچ گئے۔ یہاں آکر نیم کی ٹہنیاں نکالیں ان میں بہت سی جونکیں لپٹی ہوئی تھیں۔ ہم نے انھیں بنسی کے کانٹوں میں پرو لیا اور دس دس گز کے فاصلے پر اطمینان سے بیٹھ گئے۔ کوئی آدھ گھنٹہ گذر گیا۔ ایک مچھلی بھی نہ پھنسی۔ بیٹھے بیٹھے طبیعت اکتا گئی۔ اتنے میں ایک چرواہا اپنی گائے بھینسوں کو لے کر ادھر آنکلا۔ ہم لوگوں کو گویا ایک تفریح کا مشغلہ ہاتھ آیا۔ سلیم صاحب فوراً بول اٹھے، آپ کا اسم مبارک کیا ہے۔ جمیل صاحب بھی خاموش نہ رہ سکے۔ کہنے لگے مزاج پلید کیسا ہے۔ میں نے چپ رہنے میں اپنی حاضر دماغی کی ذلت سمجھی اور کہا "کہو بھئی بھیڑیئے کے بھاڑے سے کب نکلے؟"

بے چارا چرواہا کچھ نہ سمجھ سکا۔ اور بولا "بھیّا" کوئی مچھلی ملی کرناہیں"۔ (کوئی مچھلی ملی یا نہیں) سلیم صاحب بولے تمھیں علم تاریخ سے بھی کچھ واقفیت ہے۔ چرواہے نے سادگی سے جواب دیا۔ بھیّا جانت کاہے نہیں۔ آج اساڑھ کی چار تاریکھ ہے (جانتے کیوں نہیں، اساڑھ کی چار تاریخ ہے) جمیل نے پوچھا جغرافیہ جانتے ہو؟ چرواہا

بولا۔ بھیا جگرا بھیہ ہمرے گاؤں ماں نہیں رہت ہیں۔" (بھائی جغرافیہ ہمارے گاؤں میں نہیں رہتے ہیں۔) میں نے کہا:۔" اقبال کی شعرو شاعری کے متعلق کچھ جانتے ہو؟" چرواہا بولا" حجوز اکبال ہمرا تین برس کا لونڈا ہئے بہت سیطانی کرت ہے اس تے سہر کبھو ناہیں دیکھا ہے۔ (حضور اقبال میرا تین برس کا بچہ ہے بہت شیطانی کرتا ہے اس نے شہر کبھی نہیں دیکھا ہے) اب تو آپ خود ہی اندازہ کر لیجئے، چرواہے کی ان باتوں سے ہماری کیا حالت ہوئی ہوگی۔ باتیں کرتے کرتے چرواہے کی نظر سلیم کی بنسی پر پڑی۔ چلاّ کر کہنے لگا" بھیا کی بنسی ہلت ہئے (بھیا کی بنسی ہلتی ہے۔) ہمارے سلیم صاحب نرے گاؤدی واقع ہوئے ہیں۔ وہ چرواہے کی باتوں میں اس قدر محو تھے کہ شکار کا خیال فراموش کر چکے تھے۔ اب انھیں ہوش آیا بنسی کھینچی تو ایک آدمی چھٹانک مچھلی خشکی پر آگری۔

اب دس بج چکے تھے۔ نوکر بھی کھانا لے آیا تھا۔ ہم لوگوں نے نہا کر کھانا کھایا اور سلیم کا کمبل درخت کے نیچے بچھا کر بیٹھ گئے۔ جمیل صاحب پھر شکار کے لئے تالاب پر تشریف لے گئے اور دو گھنٹے کے بعد خالی ہاتھ واپس آئے۔ ہم لوگوں نے اُن کا خوب مذاق اُڑایا۔

تب خوب آرام کر چکے تو واپسی کی ٹھہری اور سامان اُٹھا کر گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابھی ایک ہی فرلانگ چلے تھے کہ بارش نے آگھیرا۔ بارش بھی موسلا دھار، کنکر ونکر مُنہ پر اس طرح لگ رہے تھے جیسے بندوق کے چھرّے سب کے سب بھیگ کے چوہا ہو گئے۔ خدا خدا کر کے جیسے تیسے کوٹھی پر پہنچے۔ کپڑے بدلے چائے پی تو اوسان کچھ ٹھیک ہوئے۔ سامان پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ جناب سلیم صاحب بہت سا سامان وہیں درخت کے نیچے چھوڑ آئے ہیں جمیل بہت بھیگ گئے تھے۔ انھیں بخار آگیا۔ میرے اور سلیم کے سر میں بھی درد ہونے لگا۔ اب ہم نے عہد کر لیا ہے کہ کبھی مچھلی کے شکار کا نام نہ لیں گے۔ سلیم تو شکار کا نام آتے ہی لاحول پڑھنے لگتے ہیں۔

پہیلیاں

۱۔ ادھر بھی کاٹ اُدھر بھی کاٹ
بیچ میں بیٹھا درگا داس (بادام)

۲۔ اتنی سی بٹیا۔ گز بھر چٹیا (سوئی)

۳۔ اتنی سی ڈبیا میں دو رنگ کا پانی (انڈا)

(محمد صغیر۔ باوی)

۴۔ سفید مرغی سبز پر۔ جو نہ بوجھے سو جائے گھر (مولی)

۵۔ لکڑی کا گھوڑا چمڑے کی لگام
جو نہ بوجھے سو حجام (کھڑاؤں)

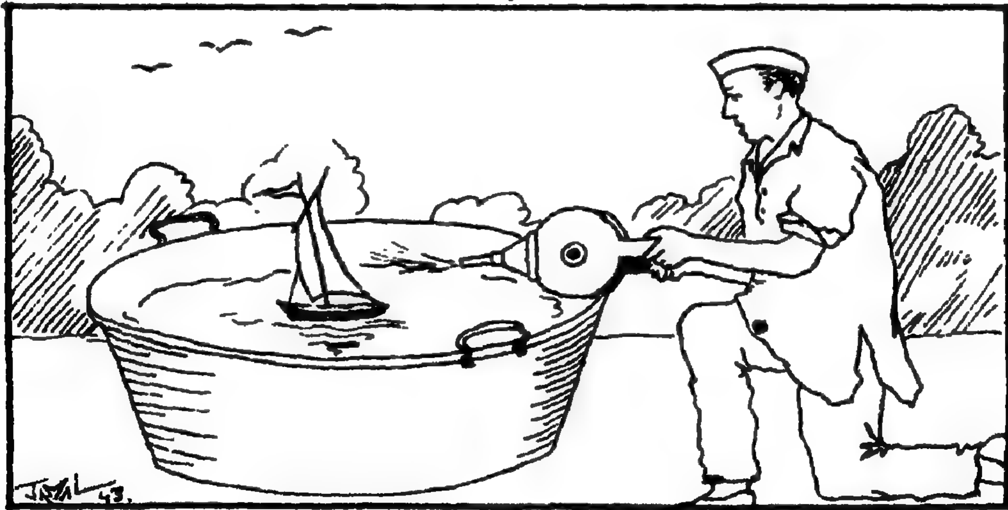
۶۔ اتنی سی فلتی۔ کام کرے کتنی (سوئی)

(رؤف رشید اعلیٰ)



مشتاق احمد اعظمی، بی اے

آج ہم تمھیں ایک کھیل کھلائیں بڑے
مزے کا۔ دیکھو ایک ٹب میں پانی بھرو۔ اس میں
ایک چھوٹی سی بادبانی کشتی ڈالو، اور پھر
اپنے مُنہ یا کسی اور چیز سے اس کے بادبانوں



میں ہوا پہنچاؤ۔ کشتی حرکت کرنے لگے گی۔ کیوں؟
اس لئے کہ بادبانوں پر ہوا کا دباؤ پڑا اور
اُس نے دُھکا دے کر کشتی کو آگے
بڑھا دیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہم
ہاتھ سے دھکا دے کر کشتی کو آگے بڑھا دیتے
ہیں۔ سمندروں میں جو کشتیاں اور جہاز چلتے
ہیں وہ اِسی طرح تو چلتے ہیں۔ سطح سمندر پر جو
ہوا چلتی ہے وہ بادبانوں پر اپنا دباؤ ڈالتی
ہے۔ یہ دباؤ اتنا زبردست ہوتا ہے کہ پوری
کشتی کو دھکا دے کر آگے بڑھا دیتا ہے"
اچھا اب ایک اور بات بتائیں دیکھو

تصویر دیکھو۔ ایک بڑی سی کشتی سمندر میں ٹھیری ہوئی ہے۔ اس کشتی میں ایک مشین بھی لگی ہے۔ مشین میں سے ہوا کی ایک بہت ہی تیز اور زور دار رَو برابر نکل رہی ہے اس کا رُخ بالکل بادبان کی سیدھ میں ہے ارے! یہ کیا بات! بادبان ہوا سے بھر گیا

ضرور ہوتی ہے جو پہلی حرکت کی ضد یا مخالف اور زور میں اس کے بالکل برابر ہوتی ہے تم اپنے ابا سے کہو کہ اپنی سائکل کو اوپر اٹھا کر ذرا اس کا پہیا گھمائیں۔ یہ پہیا گھومتے گھومتے جونہی رُکے گا فوراً دوسرے رُخ گھومنے لگے گا۔ سمجھ گئے نا؟ شاباش! اب کشتی والی



ہے مگر کشتی ذرا جگہ سے ہلی تک نہیں۔ پہلی کشتی کی طرح اسے بھی ہچکولے کھاتا اور پانی پر دوڑتا جانا تھا۔ کوئی بات ضرور ہے۔ ہم تم دونوں اسے سمجھنے کی کوشش کریں اچھا پہلے ایک عام قاعدہ سمجھ لو۔ شاید تمھیں پہلے سے معلوم بھی ہو، دیکھو ہر حرکت کے بعد ایک ایسی حرکت

بات اچھی طرح تمھاری سمجھ میں آجائے گی۔ دیکھو یہ جو کشتی ٹھیری ہوئی نا! تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مشین سے نکلنے والی ہوا نے کشتی کے بادبانوں پر دباؤ تو ڈالا اور چاہیے یہ تھا کہ یہ دباؤ کشتی کو آگے ڈھکیلتا لیکن اسی وقت بادبانوں پر اس دباؤ کے بالکل خلاف ایک دوسرا برابر

کا دباؤ بھی پڑا۔ یہ دباؤ اس ہوا کا تھا جو سطحِ سمندر پر چل رہی تھی۔ بس اسی لئے پہلا دباؤ کشتی کو آگے نہ ڈھکیل سکا۔ پہلی کشتی کی بات دوسری تھی۔ یہاں دباؤ ایسی چیز سے پڑ رہا تھا جو کشتی سے باہر تھی۔ اس لئے مخالف دباؤ کا کوئی زور نہ چل سکا اور کشتی چلنے لگی۔ دوسری کشتی میں دباؤ ڈالنے والی دونوں قوتیں خود کشتی کے اندر تھیں اسے ایک اور مثال سے سمجھو۔ فرض کرو تم کسی ناؤ سائکل یا گاڑی پر سوار ہو۔ اب تم ان چیزوں کو آگے ڈھکیلنے کے لئے کتنا ہی زور لگاؤ یہ چیزیں جوں کی توں رہیں گی ذرا بھی آگے نہ بڑھیں گی۔ اس کا سبب بھی وہی ہے۔ تمھارے زور کے بالکل خلاف ایک اور حرکت ساتھ ہی ساتھ پیدا ہوئی۔ یہ طاقت بھی تمھارے زور کے بالکل برابر تھی۔ تم خود اور وہ حرکت دونوں ایک ہی چیز پر سوار ہیں۔ اس لئے تمھارے زور کا قابو اس حرکت پر چلے گا نہ اس حرکت کا قابو تمھارے زور پر۔ دونوں زور بالکل برابر ہوں گے۔ لیکن تم زمین پر اُتر کر اسی کشتی، سائکل یا گاڑی کو آگے ڈھکیلنے کے لئے زور لگاؤ گے تو فوراً کامیاب ہو جاؤ گے، کیوں؟ تمھاری حرکت باہر سے ہو رہی ہے۔ اس لئے مخالف حرکت کا تمھارے اُوپر قابو نہ چل سکے گا +

آؤ تصویریں بنائیں

جمال آرٹسٹ



جون کے پرچے میں تصویریں بنانے کے متعلق چند باتیں بتائی گئی تھیں۔ اس پرچے میں کچھ اور کام کی باتیں سن لو:۔

تم میں سے بہت سے بچوں نے تو تصویر بنانے کی مشق بھی شروع کر دی ہوگی۔ لیکن تصویر کا خاکا بنانے کے بعد تم نے دیکھا ہوگا کہ تصویر کے کچھ حصے پر روشنی آ رہی ہے اور کچھ پر نہیں۔ یہ دونوں حصے کچھ اُبھرے اُبھرے دکھائی دے رہے ہیں۔ اب ہم تمھیں بتاتے ہیں کہ خاکہ بنانے کے بعد چہرے کو کس طرح ٹھیک کیا جاتا ہے۔

تصویر بنانے کے سلسلے میں شیڈ (سایہ) کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ چہرے کے اُبھرے ہوئے اور ڈھلے ہوئے حصے اسی سے دکھائی دیتے ہیں۔ چہرے کے جن حصوں پر سب سے زیادہ روشنی پڑ رہی ہو اُن پر نہایت ہلکا رنگ

اُور جن حصّوں پر روشنی کم پڑ رہی ہو اُن پر ذرا گہرا رنگ لگانا چاہیئے۔ اگر تصویر صرف پنسل سے بنانی ہے تو شیڈ بھی لکیروں سے ڈالے جائیں گے دیکھو خاکہ نمبر ا۔ جیسے جیسے شیڈ گہرے ہوتے جائیں ویسے ویسے گہری پنسلیں استعمال کرنی چاہئیں۔

تم کہوگے کہ بالوں کا رنگ تو بالکل سیاہ ہوتا ہے تو کیا ہم سارے بالوں کو بالکل کالا ہی بنا دیں؟ سُنو! بالوں کا رنگ تو کالا ہی ہوتا ہے۔ لیکن بالوں کے جن حصّوں پر روشنی سے چمک پیدا ہوگی وہ حصّے سفید ہی دکھائی دیں گے اس لئے وہ سفید ہی بنیں گے۔ بالکل اسی طرح فرض کرو قمیص کا رنگ بالکل سفید ہے لیکن قمیص کے جن حصّوں پر روشنی کم آئے گی وہ حصّے یقیناً بالکل سفید نہ دکھائی دیں گے اس لئے ہم بھی اِسے اصلی رنگ میں بنائیں گے۔



اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیئے کہ ربڑ زیادہ استعمال نہ ہو۔ زیادہ ربڑ لگانے سے کاغذ کھُردرا ہوجاتا ہے اُور تصویر ٹھیک نہیں بنتی۔ ڈرائنگ کا غذ ہمیشہ ایک طرف سے چکنا اُور ایک طرف سے کھردرا ہوتا ہے۔ تصویر ہمیشہ چکنی طرف بنانی چاہیئے۔

رنگ بھرو



"یہ ایک مصری لڑکا ہے۔ دیکھو کیسے مزے میں گدھے پر چڑھا ہوا ہے۔ ہنسنے کی کیا بات ہے۔ مصر میں گد
کی سواری کا عام رواج ہے۔ اچھا اب اِس میں رنگ بھرو۔ مگر اس کا خیال رکھنا کہ گدھا بالکل گدھا معلوم ہو اور
سوار؟ ...."

(جمال)

پیامِ برادری

پیاری بچیو اور بچو خوش رہو اور تندرست اب تو یو۔پی کے علاوہ دوسری جگہوں کے اسکول بھی کھل گئے ہوں گے اور جب پیامی اپنے سالانہ امتحانوں میں کامیاب ہو چکے ہیں انھوں نے نئے جوش اور تازہ ولولوں کے ساتھ اپنے نئے درجوں میں پڑھنا شروع کر دیا ہوگا۔ اس مرتبہ بھی برسات تو اچھی ہو رہی ہے۔ دلی میں تو پچھلے سال کی طرح اب کے بھی خوب بارشیں ہو رہی ہیں۔

پچھلے چند مہینوں سے اتحادی فوجوں کو افریقہ کے علاقے میں خوب کامیابی ہو رہی ہے۔ ٹیونشیا پر قبضہ کرنے کے بعد انھوں نے اٹلی کے چند اور اہم جزیروں پر قبضہ کیا پھر ان کا رخ سسلی کی طرف ہو گیا۔ یہاں بھی انھیں برابر کامیابی ہو رہی ہے اور اب تک اتحادی فوجیں سسلی کے دو تہائی علاقے پر قبضہ کر چکی ہیں۔ کٹانیا کے مقام پر انھیں کچھ مشکلیں پیش آ رہی ہیں۔ اس لئے کہ یہاں جرمن فوجیں آٹھویں فوج کا بہت شدت سے مقابلہ کر رہی ہیں۔ بعض خبروں سے معلوم ہوا ہے کہ جرمنوں کو ہوائی جہازوں کے ذریعے اور دوسرے ذریعوں سے امداد بھی پہنچ رہی ہے۔

اور لیجئے جولائی کی پچھلی تاریخوں میں ایک حادثہ اور ہوا بہت زبردست حادثہ یعنی مسولینی صاحب چاروں خانے چت ہو گئے یعنی انھوں نے اپنی وزارت اور ڈکٹیٹری سے استعفیٰ دے دیا۔ اُن کے ساتھ ان کا نیا مذہب یعنی فاشزم بھی یوں سمجھو کہ ختم ہو گیا۔ انھوں نے بیس سال تک اٹلی پر بہت شاندار حکومت کی۔ ۱۹۳۵-۳۶ء میں تو یہ خاص طور پر بہت زوروں پر تھے۔ انگریز بھی ان سے ڈرنے لگے تھے۔ حبشہ اور البانیہ پر قبضہ کرنے کے بعد انھیں اپنی طاقت کے بارے میں اور بھی مغالطہ ہو گیا۔ موجودہ لڑائی میں کچھ دنوں تو یہ خاموش رہے۔ مگر فرانس کی شکست کے بعد ان سے ضبط نہ ہو سکا اور آخر کار لڑائی میں کود ہی پڑے اور افریقہ کے میدان میں لڑائی ٹھن گئی۔ اس وقت انگریزوں کے پاس نہ تو فوج کافی تھی نہ لڑائی کا سامان پھر بھی اٹلی کی فوج ایسی بودی اور نکمی نکلی کہ انہیں حبشہ سے بے دخل کرنے میں انگریزی فوجوں کو کچھ زیادہ وقت نہیں ہوئی بس اس وقت سے انگریزوں کو اٹلی کی طاقت کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا اور صحیح معنوں میں اسی وقت مسولینی کی طاقت کو گھن لگ گیا۔ اس عرصے میں تھوڑی فوجوں کو کچھ کامیابی بھی ہوئی تو جنرل رومیل اور اس کی جرمن فوجوں کی وجہ سے اٹلی کی فوج تنہا ہوتی تو اب تک کبھی کی شکست کھا گئی ہوتی۔

ان پے در پے شکستوں سے مسولینی اور اس کی پارٹی کا وقار بالکل اُٹھ گیا اور مجبوراً اسے ملک کے انتظام سے الگ ہونا پڑا۔ اس میں شک نہیں کہ مسولینی کی قوم بہت پست حالت میں تھی اس نے اسے آگے بڑھانے اور ترقی دینے کی بہت کوشش کی اور اس میں کامیابی بھی ہو رہی تھی مگر ابھی اٹلی کو وہ جرمنی کی طرح طاقتور نہ بنا سکا تھا۔ اس لڑائی میں کود کر اس نے غلطی کی اور ساری کوششیں خاک میں مل گئیں۔

مسولینی کی جگہ اب مارشل بدیو وزیر اعظم ہوئے ہیں ان کے جو حالات اخباروں میں چھپے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شروع سے مسولینی کے مخالف تھے مگر جب حبشہ کی لڑائی میں اٹلی کی فوج کو شکستیں ہونے لگیں تو کمان انھی بڑے میاں کے ہاتھ میں دی گئی تھی اور انھی نے زہریلی گیس کی مدد سے حبشیوں کو قابو میں کیا تھا۔ اب مسولینی کے بارے میں مختلف خبریں آرہی ہیں ایک خبر یہ تھی کہ وہ ہوائی جہاز کے ذریعے اسپین چلا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اپنے مکان میں نظر بندی کی حالت میں ہے۔ دوسرے فاشسٹ لیڈروں کے بارے میں بھی خبر آتی ہے کہ گرفتار کر لئے گئے۔ روسی حکومت نے غیر جانبدار ملکوں سے درخواست کی ہے کہ مسولینی کو پناہ نہ دی جائے۔

سسلی میں لڑائی اب بھی جاری ہے اور اتحادی فوجیں برابر آگے بڑھ رہی ہیں۔ اتحادی فوج نے صلح کی اپیل کی تھی مگر مارشل بدو لیو نے اس خبر کی اشاعت اٹلی میں ممنوع کر دی پھر بھی خبروں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مارشل کا میلان صلح کی طرف ہے۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ اٹلی کے پوپ بیچ میں پڑ کر صلح کرانا چاہتے ہیں۔

روس میں اوریل کے پاس بہت سخت لڑائی ہو رہی ہے روس ایک طرف تو جرمنی کے حملوں کو بہت کامیابی سے روک رہا ہے۔ دوسری طرف جرمنی پر خود بھی حملے کر رہا ہے۔ جرمنی کو اس وقت لڑائی میں بہت دقت پیش آرہی ہے۔ اتحادی فوجیں جرمنی اور اس کے فتح کئے ہوئے علاقوں پر برابر ہوائی حملے کر رہی ہیں اور بہت نقصان پہنچا رہی ہیں۔

بحر الکاہل میں امریکہ اور جاپان کا مقابلہ اکثر جزیروں پر ہو رہا ہے۔ امریکہ نے نیو گنی میں موبو نام کا مشہور ہوائی اڈا جاپانیوں سے چھین لیا ہے اور اب وہ منڈا جزیروں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ چین جاپان کے مقابلے میں اسی دم خم اور اسی ہمت استقلال سے ڈٹا ہوا ہے۔

ہندوستان میں جاپانیوں سے برطانی علاقے لینے کی برابر تیاری ہو رہی ہے ان تیاریوں کی اہمیت اس بات سے ظاہر ہو سکتی ہے کہ اس مرتبہ وائسرائے بھی ایک فوجی جنرل کو بنایا گیا ہے۔ سرویول پہلے ہندوستان کے کمانڈر انچیف تھے۔ موجودہ وائسرائے کی مدت پوری ہونے کے بعد یہ وائسرائے بنیں گے اور کمانڈر انچیف کا عہدہ لارڈ ڈمکنگ سنبھال لیں گے۔

جولائی کی آخری تاریخوں میں ایک بڑا حادثہ ہو گیا، یوں کہو کہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ایک پنجابی مسلمان نے مسلم لیگ کے صدر مسٹر جناح پر قاتلانہ حملہ کر دیا، خوش قسمتی سے مسٹر جناح بال بال بچ گئے۔ صرف معمولی سے زخم آئے حملہ آور گرفتار ہو گیا ہے۔ مسٹر جناح کی سلامتی پر تمام ہندوستان میں خوشی منائی جا رہی ہے۔ اسمبلی میں بھی مبارک باد کی تجویز پاس ہو چکی ہے۔

ہندوستان میں اناج اور ریزگاری کی پریشانی کا اب بھی وہی حال ہے۔ ضرورت کی اور چیزیں مثلاً ایندھن، تیل وغیرہ مشکل سے ملتی ہیں۔ دلی میں البتہ کچھ امن ہے۔ دو چار روز سے یہاں بھی غلے کا بھاؤ بڑھنے لگا ہے۔

پیامیوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام کی حکومت نے جامعہ کی امداد ایک ہزار سے بڑھا کر ڈھائی ہزار ماہوار کر دی ہے ۵۰۰ روپے لڑائی کے زمانے تک بطور مہنگائی الاونس کے ملیں گے

(محمد حسین حسان)



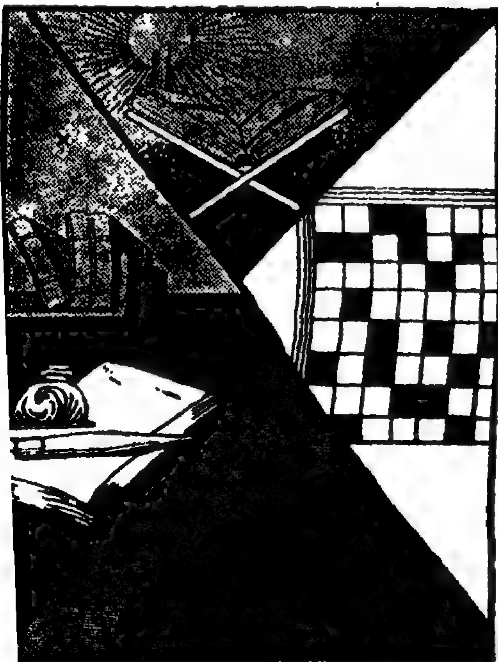
مسولینی اٹلی کے ڈکٹیٹر اور وزیر اعظم۔ انھون نے پچھلے مہینے استعفے دے دیا اور اب سنا ھے حراست مین ھین۔

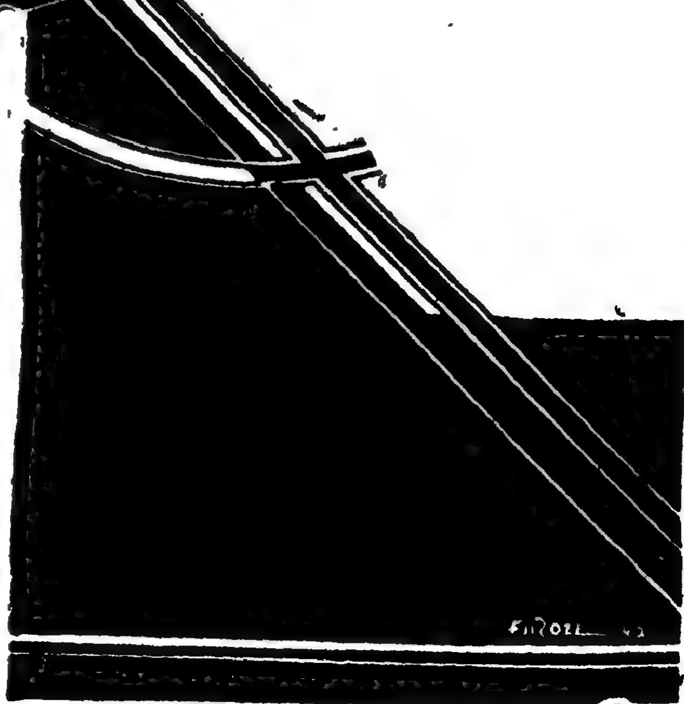


ستمبر

۱۹۸۳









اب سے کوئی اکیس سال پہلے انگلستان میں ایک
بہت مفید تحریک چلی تھی۔ اس کا منشا یہ تھا کہ گیارہ
سے تیرہ سال تک کے بچون کو تیمارداری اور بیمارون
اور زخمیون کی دیکھبھال کا کام سکھایا جائے ۔ آج کل
لڑائی میں یہ تربیت پائے ہوئے بچے بہت مفید خدمت
انجام دے رہے ہین - اور بہت سے انعام اور تمغے حاصل
کرچکے ہین۔ اوپر کی تصویر اسی طرح کے چند بچون کی ہے

پیامِ تعلیم

ایڈیٹر:- محمد حسین حسّان

دہلی ، یوپی ، سی پی ، برار ، میسور ، قلات ، بنگال ، رام پور ، حیدرآباد سندھ ، کشمیر ، پنجاب ، بہار اور سرحد کے محکمہائے تعلیم کی طرف سے سرکاری طور پر منظور کیا گیا ہے۔
"مینجر"

جلد ۲۶ | فہرست مضامین ستمبر ۴۳ سنہ ۶ | نمبر ۹

	مضمون	مصنف	صفحہ
۱	بچوں سے باتیں	ایڈیٹر	۲۵۸
۲	چھٹی نے خوب منائی	محمد شفیع الدین صاحب نیر	۲۵۹
۳	طاہر میاں کا ریڈیو	" " "	۲۶۰
۴	گاؤں کی برسات	خلیل الرحمٰن مستقیمی	۲۶۳
۵	برسات (نظم)	انور شاہ آبادی (عثمانیہ)	۲۶۶
۶	سائنس کی کتابیں	م ، ش ، ن	۲۶۷
۷	املی کی کھٹائی	عبداللہ ناصر	۲۷۰
۸	ہماری زمین	محمد حسین حسّان	۲۷۲
۹	بچوں کی نظمیں	.. ..	۷۵
۱۰	پہیلی	محمد عبدالرشید مہاجر	۷۷
۱۱	بجلی کے کھیل	مشتاق احمد اعظمی	۷۹
۱۲	پیام برادری	... ...	۸۳
۱۳	معما	... ...	۸۵
۱۴	رنگ بھرنے کی تصویر	... ...	۸۸

قیمت سالانہ عہ | فی پرچہ ۳؍

پرنٹر پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی - محبوب المطابع پریس دہلی



اس پرچے میں بچّوں کی چند کتابوں پر رائیں چھپ رہی ہیں یہ کتابیں پچھلے سال یعنی سنہ ۱۹۴۲ء میں چھپی تھیں۔ یہ تبصرہ سال کے شروع میں چھپنا چاہیے تھا۔ مگر اوّل تو کتابیں ہمارے پاس بہت دیر سے پہنچیں۔ دوسرے جن صاحب کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا وہ اب تک برابر پریشانیوں میں مبتلا رہے اس تبصرے کا دوسرا حصّہ اگلے پرچے میں چھپے گا۔

اس مہینے مکتبہ جامعہ بچّوں اور بڑے لڑکوں کے لئے بہت اچھی اچھی کتابیں شائع کر رہا ہے۔ ایک تو وہی سونے کی چڑیا جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے اس کے علاوہ مولوی محمد شفیع الدین صاحب کی کتاب نئی کہانیاں۔ یہ ان کی چند نظموں کا مجموعہ ہے چھوٹی چھوٹی ننھی مُنّی نظمیں ہیں، بہت ہی دلچسپ اور مزے دار۔ نیّر صاحب کی دو تین کتابیں اور تیار ہیں شاید دوسرے مہینے تک چھپ سکیں۔ چند اور بہت مفید اور دلچسپ کتابیں ہیں جن کا اشتہار اسی پرچے میں چھپ رہا ہے۔

ان کے علاوہ عبدالغفور صاحب کی ایک اور کتاب شائع ہو رہی ہے "بڑدادا کی کہانی" انھوں نے آل انڈیا ریڈیو دہلی میں تاریخ کے عنوان پر کہانیوں کے انداز میں چند تقریریں کی تھیں۔ یہ کتاب انھی تقریروں کا مجموعہ ہے اور آل انڈیا ریڈیو دہلی کی اجازت سے چھپ رہا ہے۔

ہماری زمین کا سلسلہ اس پرچے میں ختم ہو جائے گا۔ پیامیوں نے اسے اُمید سے زیادہ پسند کیا۔ اب یہ بھی اس مہینے کے آخر تک کتابی شکل میں چھپ جائے گا۔

اس پرچے میں مشتاق احمد صاحب اعظمی کا ایک مضمون چھپ رہا ہے بجلی کے کھیل۔ یہ کھیل بہت آسان اور دلچسپ ہیں اور اُمید ہے کہ پیامی انھیں بہت پسند کریں گے۔ اگلے پرچے میں اُن کا ایک اور دلچسپ مضمون چھپے گا۔



چھٹی میں نے خوب منائی

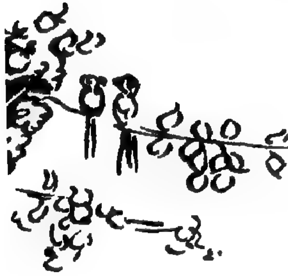


مولوی محمد شفیع الدین نیّر

پیر کے دن میں جلدی جاگا
بستہ لے کر مکتب بھاگا

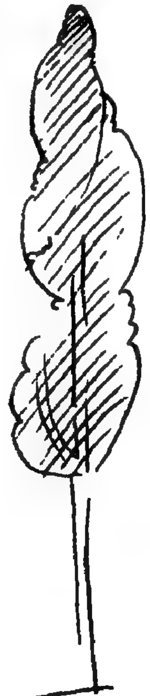
منگل کے دن دنگل دیکھا
دنگل دیکھا جنگل دیکھا

بدھ کے دن یہ دل میں آئی
میں نے کھائی خوب مٹھائی



جمعرات کو دیکھا بندر
منہ تھا اس کا لال چقندر

جمعہ کے دن دلی دیکھی
دلی میں اک بلی دیکھی



ہفتے کے دن ہاکی کھیلا
پھر میں نے دیکھا اک میلا



چھٹی تھی اتوار کی بھائی
چھٹی میں نے خوب منائی



طاہر میاں کا — ریڈیو

محمد شفیع الدین صاحب نیّر

ریڈیو گھر میں کیا آیا۔ بچوں کے ہاں عید ہو گئی۔ ہر وقت اُسے گھیرے بیٹھے رہتے ہیں۔ کبھی باجا سُن رہے ہیں، کبھی گانا، کبھی دُنیا کی خبریں۔ کبھی نقلیں، کبھی حکایتیں، کبھی چٹکلے، کبھی تاریخی داستانیں۔ کبھی ایسے ڈرامے کہ سُن کر آدمی ہنستے ہنستے لوٹ جائے۔ بچے گانوں، انگریزی خبروں وغیرہ کو چھوڑ کے کہ اُن کی سمجھ سے باہر ہیں۔ باقی سب چیزیں مزے سے بیٹھے بیٹھے سنتے رہتے ہیں۔ اتوار کے دن کا تو ہفتے بھر انتظار رہتا ہے۔ اس دن ریڈیو میں خاص طور پر بچوں کا پروگرام ہوتا ہے۔ اس وقت کیا مجال جو کوئی اُنھیں پل بھر کے لئے ریڈیو سٹ کے پاس سے ہٹا دے۔

خیر یہ دلچسپیاں تو تھیں ہی۔ ہمارے طاہر میاں کو رہ رہ کے اچنبھا ہوتا تھا کہ اتنے سے صندوق میں یہ اتنی باتیں اور بھانت بھانت کی بولیاں کیوں کر سُننے میں آجاتی ہیں۔ ہوتے ہوتے آپ کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ کام ہر صندوق یا ڈبے سے لیا جا سکتا ہے۔ پھر کیا تھا فوراً آپ نے کوششیں شروع کر دیں کہ ڈبا یا صندوقچہ ہاتھ لگے اور اس بات کے درپے ہوئے کہ ہم بھی ایک ریڈیو بنا ڈالیں۔

مگر بے چارے کرتے تو کیا کرتے۔ ابھی آپ کی عمر خدا کے فضل سے پانچ ہی سال کی ہے۔ اکیلے گھر سے باہر جا نہیں سکتے۔ پیسے بھی اتنے نہیں ملتے کہ کسی کے ہاتھ پر رکھیں اور بازار بھیج کر اپنے لئے ایک چھوٹا سا صندوق منگوالیں۔ ہر پھر کے میرے ہی پیچھے پیچھے پھرتے اور برابر سر ہوتے رہے کہ میں اُن کے لئے ریڈیو سٹ کے برابر لکڑی کا ایک صندوق یا پھر گتے کا ایک ڈبا ہی لا دوں۔

کون ہے جو اپنے بچے کے ایسے شوق کو پورا ہوتے نہ دیکھے گا۔ مگر صندوق یا ڈبے کے آجانے سے ریڈیو کیسے بن جائے گا، یہ بات میری سمجھ میں بھی نہ آتی تھی۔ اور اس لئے کبھی مُسکرا کر، کبھی ہنس کر کبھی اچھا کہہ کر اور کبھی اُن کو ایک حد تک اُمیدوار بنا کر ٹال دیا کرتا تھا۔

میاں طاہر نے دیکھا کہ ڈبا نہیں آتا تو کچھ مایوس سے

ہوگئے۔ ہم سمجھے شاید بھول بھال گئے۔ اس سے ذرا دل کو اطمینان ہوا کہ ہر وقت کی دردسری سے نجات ملی۔ مگر یہ خیال غلط نکلا۔ طاہر میاں کے دل میں ریڈیو بنانے کا شوق باقی رہا۔ وہ برابر اس دُھن میں رہے۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ایک دِن اُن کے نانا صاحب ایک بڑا سا ڈبا لائے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ اُس میں چائے ہے۔ ہم لوگ خاموش ہوگئے۔ مگر طاہر میاں آہستہ آہستہ نانا صاحب کے پاس پہنچے ویسے بھی ہیں نانا صاحب کے چہیتے۔ مگر یہ چاہت آج کچھ بڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ کیوں کہ باوجود اس چاہت کے میاں طاہر بن بُلائے اُن کے پاس پہنچنے والے نہ تھے۔ مگر آج بن بلائے ہی اُن کے پاس گئے اور جھٹ اُن کی گود میں بیٹھ گئے اور لگے پیاری پیاری باتیں کرنے۔ مگر اتنا صبر کہاں کہ یہ ڈراما آگے چلے۔ بولے "نانا صاحب یہ ڈبا ہم لیں گے"۔ نانا صاحب بولے " اچھا مگر اس میں تو چائے ہے یہ ختم ہوجائے تو لے لینا۔" "لے لینا" کا لفظ سُننا تھا کہ طاہر میاں کا چہرہ خوشی کے مارے کھِل گیا اور اب اس کے خالی ہونے کی راہ دیکھنے لگے مگر ڈبا تھا بڑا کوئی آٹھ انچ لمبا اور پانچ چھ انچ چوڑا۔ چائے ہوتے ہی ہوتے ختم ہوتی۔ مگر اُن کا شوق اور اصرار دیکھ کر نانا صاحب کو بھی ترس آگیا۔ چائے چھوٹے ڈبوں میں بھروادی گئی اور گتے کا ڈبا خدا خدا کرکے میاں طاہر کو مل گیا۔

ڈبا تو خیر مل گیا مگر اب ریڈیو بنے تو کیسے بنے۔ اُنھوں نے بڑی کوشش سے ڈبے کے ایک پہلو کے درمیان اُلٹا سیدھا گول سا ذرا بڑا سوراخ بنایا اور اُس میں ایک سفید کاغذ لگا کر چھوٹے چھوٹے اینڈے بینڈے نشان لگا دیے۔

طاہر میاں کا شوق اور دلچسپی دیکھ کر کتنا جی چاہا کہ ان کے اس کام میں مدد کی جائے مگر اس میدان میں ہم خدا کے فضل سے کورے تھے ہم نے سوچا کہ اگر اِس میں کچھ کل پُرزے لگا بھی دیے تو آواز کیوں کر پیدا ہوگی۔ ہمارے دِل میں اس طرح خیالات آرہے تھے اور میاں طاہر کی کوشش کے اکارت ہوجانے کا اندیشہ لاحق ہورہا تھا۔ مگر میاں طاہر تھے کہ برابر اپنی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ جب کئی سوراخ ہوگئے تو ہم نے بھی اُن کو بہت شاباش دی اور کہا کہ "میاں طاہر تم نے ریڈیو تو بنا ہی لیا اب بس آواز کی کسر رہ گئی ہے۔ یہ کمی بھی کبھی نہ کبھی پوری ہوہی جائے گی"۔ یہ سُن کر طاہر میاں ظاہر میں بہت خوش ہوئے مگر اپنی کوشش برابر جاری رکھی۔ یہ بات ہمارے خیال میں بھی نہ تھی کہ اُن کے اِس ریڈیو میں آواز اب بس پیدا ہی ہونے والی ہے۔

اتنے میں ہم کسی کام کو باہر گئے اس کام

میں مشکل سے آدھ گھنٹہ لگا ہوگا۔ اب جو گھر میں آئے ہیں تو دروازے ہی سے گانے کی آواز آتی سنائی دی:۔ "رونا ہے بے کار پگلی رونا ہے بے کار"

"رونا ہے بے کار پگلی رونا ہے بے کار"

اور یہ گانا اسی دُھن میں ہو رہا ہے جس دُھن میں ریڈیو کے کسی ریکارڈ میں گایا جاتا ہے۔

ہم حیران کہ یا اللہ ریڈیو تو بند ہے پھر آواز کہاں سے آرہی ہے۔ اب آگے بڑھے اور دالان کے قریب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ٹاٹ بچھا ہے طاہر میاں اس پر بیٹھے ہیں اور وہ گتے کا ڈبا انھو نے ٹوپی کی طرح سر پر اوڑھ لیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ٹوپی صرف سر کے اوپر ہوتی ہے اور اس نے غلاف کی طرح سارا سر ڈھانک لیا ہے۔ بیچ کے سوراخ میں سے اُن کی آنکھیں اور مُنہ دکھائی دے رہے ہیں۔ گھر کے اور بچے اور بڑے اُن کے چاروں طرف پاس بیٹھے ہوئے ریڈیو کی تعریف کر رہے ہیں۔ مگر ان کو کسی بات کی پرواہ نہیں۔ وہ برابر لہک لہک کر گا رہے ہیں ؎

"رونا ہے بے کار پگلی رونا ہے بے کار"

خیر صاحب ہم بھی کھڑے ہو گئے یہ اور وہ اور خدا جانے کون کون سا گیت کوئی آدھا، کوئی پاؤ۔ اُنھوں نے گایا۔ ہاں "ہم دہلی سے بول رہے ہیں" کہہ کہہ کر مضمون اور موضوع بدلتے رہے کبھی کوئی چھوٹا سا لطیفہ کہہ دیا۔ کبھی کوئی سُنی سنائی چھوٹی سی کہانی کہہ دی۔ کبھی ہٹلر کا نام لے کر کوئی خبر سُنا دی۔ غرض دیر تک بڑی دل لگی رہی یکایک ہم سب نے قہقہہ لگایا۔ اچانک ڈبا سر سے اُتر کر نیچے آگرا۔ اور یہ پروگرام ختم ہوا۔ یہ ہے طاہر میاں کا ریڈیو۔ اب بھی جب اُن کا جی چاہے گا اپنے اس ریڈیو سے اسی طرح کام لیں گے اس ریڈیو کو نہ ایریل کی ضرورت ہے نہ بجلی کی۔ اور یقین ہے کہ وہ بہت دن تک ادھر اُدھر لڑکنے پڑنے کے باوجود بگڑے گا بھی نہیں۔ مجھے یہ سیدھا سادھا ریڈیو اتنا پسند آیا کہ میں نے جھٹ پٹ اُسی وقت یہ مضمون لکھ ڈالا۔ جو اب آپ کی خدمت میں پیش ہے۔



ہماری زمین :- یہ مضمون اِس پرچے میں ختم ہو گیا۔ اب یہ کتابی صورت میں چھپے گا۔ کتاب شاید مہینے کے آخر تک چھپ جائے۔ اِس میں بہت سی تصویریں بھی ہوں گی۔

مکتبہ جامعہ دہلی، قرول باغ

گاؤں کی برسات

(خلیل الرحمٰن مستقیمی۔ اعظم گڈھ)

یوُں تو برسات ہر جگہ دلچسپ ہوتی ہے لیکن اس کا مزہ تو بس دیہات ہی والے جانتے ہیں۔ اساڑھ کا مہینہ آتا ہے تو تپتی ہوئی دھوُپ اوُر گرم گرم لوُ کے جھونکوں میں کام کرنے والے کسانوں کے دل اُمّید دِل سے بھر جاتے ہیں جب دوپہر کو وہ پسینہ سے لت پت کھیتوں سے واپس آتے ہیں تو آسمان کی طرف منہ کرکے اللہ میاں کا نام لیتے ہیں۔ اُن کے دل میں ابھی سے طرح طرح کے حوُصلے پیدا ہو رہے ہیں۔ فلاں کھیت کو امسال خوُب کمایا ہے اگر مالک نے .... برکھا کی تو مکئی خوُب ہوگی اوُر کیاریوں میں اتنی کھاد پڑی ہے کہ دھان سے ہماری کوٹھریاں بھر جائیں گی۔

آدھا اساڑھ گذر گیا اور ابھی تک ایک بوُند بھی نہیں پڑی۔ کبھی کبھی آندھیاں برکھا رت کا پیغام لاتی ہیں۔ اس وقت ہر طرف لڑکے خوشی خوشی گاتے بجاتے ہیں۔ اے لو وہ کالے کالے بادل بھی دکھائی دینے لگے۔ آہا ہا وہ ہاتھی کی طرح جھوُمتے چلے آ رہے ہیں لیکن بھئی پُروا ہوا آتی ہے اوُر ان بادلوں کو اُڑا لے جاتی ہے۔ پھر وہی گرمی، وہی اُمس۔ کئی دن یوُں ہی گذر گئے۔ آسمان خالی خالی نظر آتا ہے۔ اب تو گاؤں میں ہر طرف کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ طرح طرح کی منّتیں مانی جا رہی ہیں۔ اوُر تو اوُر لڑکوں نے ایک دلچسپ چیز نکالی۔ گاؤں کے لڑکے بھی خوُب ہوتے ہیں۔ جب پانی نہیں برستا تو وہ اللہ میاں سے مچلتے ہیں اوُر زمین پر لوٹ لوٹ کر "کال کلوتی" کھیلتے ہیں۔ ایک گھڑا پانی گرا دیا گیا۔ اس پر سب چھوٹے چھوٹے لڑکے لوٹ رہے ہیں۔ اوُر یہ گاتے ہیں ؎

کال کلوتی اُجلی دھوتی ✦ اے مولا تو پانی دے

ہاں بھئی وہ دیکھئے سچ مچ اللہ میاں نے اُن کی سُن لی بادلوں کی چڑھائی ہوئی اوُر چھم چھم پانی برسنے لگا۔ دم کے دم میں تال تلیّاں بھر گئیں۔ ابھی پانی رُکا بھی نہیں تھا کہ کسان پھاوڑا لے کر اپنے اپنے کھیتوں میں پہنچ گئے۔ کیاریوں کی مینڈھیں درست کر رہے ہیں اُن میں پانی روک کر دھان کے بیج ڈالے جائیں گے۔ جو کسان دیر میں پہنچے وہ پچھتا رہے ہیں۔ اُن کی کیاریوں کا پانی

مینڈھ کاٹ کر بہہ گیا۔

خریف کی فصل بوئی جانے لگی، جوار، باجرا، ارہر سن، تلی، کاکن اور مکئی اب ہر طرف لہلہائے گی۔ کھیتوں میں چاروں طرف ہل ہی ہل نظر آتے ہیں۔ بیل کی گھنٹیوں کی آواز سے دل میں بڑی اُمنگ پیدا ہوتی ہے۔

ادھر گاؤں میں عورتوں نے برکھا کے آتے ہی جھولے ڈال دئے، لڑکیاں بالیاں لمبی لمبی پینگیں بڑھا کر جھول رہی ہیں۔ ایک جھول رہی ہے دوسری جھلا رہی ہے۔ یکایک ایک گر پڑتی ہے اور سب قہقہہ لگا کر ہنستی ہیں۔ مینڈک تالابوں میں اپنی خوشی کا ترانہ گا رہے ہیں دوسری طرف کوئل کی "کوکو" پپیہے کی پی کہاں اور جھینگر کی ریں ریں ہے اور ادھر جھولوں پر سہیلیوں کے گیت "ساون آیا تم نہیں آئے"

گویا برسات کیا ہے ایک خوبصورت کتاب ہے جس میں طرح طرح کے رنگین گیت ہیں۔

اور سنیے باغوں میں عجب بہار ہے۔ آم تو پہلے بھی پکنے شروع ہو گئے تھے۔ لیکن لو کی وجہ سے کھٹے ہوتے تھے۔ اب پانی پڑتے ہی مصری کی طرح میٹھے ہو گئے۔ لال، پیلا، سیندریا طرح طرح کے آم دیکھ کر منہ میں پانی بھر آتا ہے اور کیوں نہ ہو یہ بھی تو جنت کا میوہ۔ گاؤں کے لوگ اپنے باغوں میں پھوس کا ایک ایک چھپر ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں۔ جب آم ٹپ ٹپ گرتے ہیں تو چننے میں بڑا مزا آتا ہے۔ کبھی کبھی ہم لڑکے باغوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ کہیں کوئی آم ٹپ سے گرا اور ہم سب دوڑ پڑے۔ کبھی کبھی تو دو ایک لڑکے پھسل کر گر پڑتے ہیں اور خوب چوٹ آتی ہے، کوتے طوطے، گلہریاں بہت مگن ہیں۔ وہ مالک کی چوری پکا پکا آم دے کر چل دیتے ہیں اور چھپ چھپ کر کھاتے ہیں۔

کچھ دن کے بعد جامنیں بھی پکنا شروع ہو گئیں۔ ہم سب اپنے دوستوں کے ساتھ باغ میں جاتے ہیں اور پیڑ پر چڑھ کر خوب کالی کالی جامنیں کھاتے ہیں پیڑوں پر کھیل بھی ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے کپڑوں پر داغ لگایا جاتا ہے اور خوب شرارت ہوتی ہے ایک مرتبہ ہم اپنے دوستوں کے ساتھ جامن کھا رہے تھے یکایک ڈالی ٹوٹی تو ایک لڑکا نیچے آ رہا۔ ہم سب ڈر کر بھاگنے لگے۔ لیکن خیریت ہوئی کہ لڑکے کے زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ اس دن ہم گھر خوب ڈانٹے گئے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد دھانوں کے بیج تیار ہو گئے اور اب وہ کیاریوں میں بٹھلائے جاتے ہیں۔ کسان عورتیں دھان بٹھاتی ہیں۔ کیا اچھا سماں ہوتا ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑتی ہے اور اس میں عورتیں گیت گا گا کر دھان بٹھاتی ہیں۔ کبھی کبھی جب دھوپ میں ہلکی ہلکی بارش ہوتی ہے اور دھنک نکلتی ہے تو بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ہم لوگ جب چھوٹے تھے اور دھوپ میں بارش ہوتی تو کہا کرتے تھے کہ گیدڑ کا بیاہ ہو رہا ہے۔

لیجیے اب مکئی بھی پکنے لگی۔ کھیتوں میں مچان پڑے

ہیں اور اس میں بیٹھ کر لوگ مکئی کی رکھوالی کرتے ہیں گیدڑ مکئی کے بھٹے کھا جاتے ہیں۔ اس لئے اُن کے بھگانے کے لئے لوگ کنستر بجاتے ہیں جب تمام مچانوں پر کنستر بجتے ہیں تو بڑا دلچسپ تماشا ہوتا ہے۔ ہم سب ککڑی اور پھوٹ ڈھونڈھ کر رہتے ہیں اور مچان پر بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ کھیت کے پاس لکڑیاں جمع کرکے آگ جلائی جاتی ہے اور اُس میں بھٹے بھون بھون کر خوب کھائے جاتے ہیں۔ بھئی بھٹا بھی دیہات کا کیا عمدہ تحفہ ہے۔ جب پانی برستا ہے تو مچان پر بیٹھ کر گرم گرم بھٹا کھانے میں بڑا لطف آتا ہے۔

برسات کے دنوں میں چھوٹے چھوٹے لڑکے صبح کو میدان میں جا کر بیر بہوٹیاں پکڑتے ہیں۔ کچھ تالاب پر بنسیاں لے کر مچھلیوں کا شکار کھیلنے جاتے ہیں۔ چارہ لگا کر مچھلی کے انتظار میں بیٹھے مکھیاں مارتے ہیں۔ بار بار مچھلیوں کے چارہ کھا جانے پر بڑا غصہ آتا ہے۔ لیکن جب مچھلی پھنستی ہے تو طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ گھسیاروں کی تو گویا بن آئی۔ روندی ہوئی گھاس جو گرمی میں سوکھ گئی تھی۔ اب تو خوب ہری ہو گئی ہے اور میدانوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اللہ میاں نے مخمل کا خوب نرم فرش بچھا دیا ہے۔ گھسیارے کھرپی اور کھنچیا لے کر جاتے ہیں اور جب جلدی سے گھاس کاٹ کر اپنی کھنچیا بھر لیتے ہیں تو وہیں گلی ڈنڈا اور طرح طرح کے کھیل کھیلتے ہیں۔

چرواہے بڑے خوش ہیں اب جانوروں کے لئے چراگاہوں میں خوب چارہ ہو گیا ہے اب اُن کی گائیں اور بھینسیں کھیتوں میں نہیں جائیں گی اور اُن کو بار بار ہانکنا نہیں پڑے گا۔ اب تو وہ کبڈی اور بیاہ بیاہ کھیلتے ہیں اور خوب بنسی کی تان اُڑاتے ہیں اور جب پانی آ جاتا ہے تو برگد کی گھنی چھاؤں میں جا کر چھپ جاتے ہیں۔

جب برسات کی کالی کالی راتیں آتی ہیں۔ بادل گرجتے ہیں اور بجلی چمکتی ہے تو دیہاتی اپنے گھروں میں دبک کر سوتے ہیں۔ جب موسلا دھار بارش ہونے لگتی ہے اور گھر کی چھت ٹپکتی ہے تو چارپائیاں اِدھر سے اُدھر کھسکاتے ہیں۔ کبھی کبھی جب آسمان صاف ہوتا ہے اور سب لوگ باہر سوئے رہتے ہیں اور یکا یک بوندیں پڑنے لگتی ہیں تو ہر طرف "پانی آیا پانی آیا" کی آواز سے گاؤں گونج اُٹھتا ہے۔ جلدی جلدی چارپائیوں اور سامانوں کو لوگ اندر کرتے ہیں۔

برسات کے دنوں میں ہماری بڑی بہار ہوتی ہے ہم روز تالاب میں نہانے جایا کرتے ہیں۔ خوب ڈبکی لگاتے ہیں اور تیرتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک دوسرے کو چھونے کی بازی رکھتے ہیں۔ تالاب میں کنول کے پھول کھلتے ہیں تو ہم گھنٹی بنا کر چلتے ہیں اور پھول لا کر اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو دیتے ہیں سچی بات تو یہ ہے کہ گاؤں میں برسات بہت پُرلطف گذرتی ہے۔

برسات

انور شاہ آبادی (عثمانیہ)

گرمی تھی اس بلا کی سب لوگ تھے پریشاں ؛ کالی گھٹا ہے چھائی خلقت ہے ساری شاداں
اب وہ خزاں کا موسم رخصت ہوا عزیزو! ؛ دکھلایا ابر رحمت نے پھر رُخِ بہاراں

ہر سمت بچھ رہا ہے سبزے کا نرم مخمل ؛ جائے نظر جہاں تک اک ہو گئے ہیں جل تھل
بارش کی بوندیاں یہ چلمن کی تیلیاں ہیں ؛ قُدرت نے یا کہ ڈالا ہے رخ پہ اپنے آنچل

شکرِ خدا کہ پھر سے فصلِ بہار آئی ؛ اُجڑے چمن میں پھر سے پہلی نکھار آئی
پیدا ہوئیں دلوں میں سب کے نئی اُمنگیں ؛ رحمت خُدا کی آئی اور بار بار آئی

دیکھو وہ اک گوالا گائیں لئے کھڑا ہے ؛ بنسی بجا رہا ہے اور خود بھی گا رہا ہے
کتنا لطیف نغمہ! کیا رس بھری صدا ہے ؛ ملہار راگ شاید اب وہ سُنا رہا ہے

آؤ نہ ہم بھی چل کر جنگل میں لُطف اُٹھائیں ؛ اور اس حسین منظر سے خوب دل لُبھائیں
لو! وہ جھڑی لگی پھر۔ ہے کچھ پھوار کم کم ؛ ہم جا رہے ہیں بھائی وہ آئیں یا نہ آئیں

بچوں کے لئے سنہ ۴۲ء کی کتابیں

م ، ش ، ن

۱۹۴۳ء کے شروع میں ایک دن جناب حامد علی خاں صاحب مہتمم مکتبہ جامعہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ بچوں کے ادب کا ذکر چل نکلا۔ صاحب موصوف نے بہت دنوں بیمار رہنے کے بعد مکتبے کا کام شروع کیا تھا اور اگرچہ ابھی کامل طور پر صحت نہ ہوئی تھی۔ تاہم امید تھی کہ تھوڑے دنوں میں وہ بالکل تندرست ہو جائیں گے آپ کا خیال تھا کہ آیندہ آپ بچوں کے ادب کی طرف کافی توجہ اور اور مکتبے کی طرف سے بچوں کے لئے اچھی کتابیں معقول تعداد میں شائع کریں گے۔ اسی سلسلے میں آپ نے کہا کہ پچھلے سال بچوں کے لئے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ جمع کی جائیں اور اس بات کا اندازہ لگایا جائے کہ ملک میں کس نوعیت کا کام انجام پا رہا ہے۔ آپ کا یہ بھی خیال تھا کہ بچوں کے لئے مخصوص طور پر لکھنے والے حضرات کی ہمت بڑھائی جائے۔ اور ان کا کام سجنے اور خوش نمائی کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کیا جائے

مجھے صاحب موصوف کی یہ خواہش اور رائے پسند آئی۔ جناب حسین حسان صاحب ایڈیٹر پیام تعلیم بھی موجود تھے۔ حامد صاحب نے اُن سے کہا کہ وہ پچھلے سال کی تمام کتابیں مختلف مقامات کو خط لکھ لکھ کر جمع کریں اور مجھ سے فرمائش کی کہ ان پر تبصرہ کرنے کی خدمت میں اپنے ذمے لوں۔

خدا کا کرنا کہ اول تو صاحب موصوف پھر کچھ بیمار ہو گئے، آپ کو آرام اور علاج کے لئے بھوپال جانا پڑا اور تھوڑے عرصے کے لئے اپنے ارادوں کو ملتوی کرنا پڑا، دوسرے کاغذ کی نایابی کی وجہ سے رسالہ پیام تعلیم کی اشاعت بھی کچھ دن بے قاعدہ رہی۔ اس لئے جو کتابیں ایڈیٹر صاحب نے بڑی کوشش سے جمع کی تھیں۔ ان کی بابت کچھ نہ لکھا جا سکا۔ بہر حال اب کہ یہ سال آدھے سے زیادہ ختم ہو چکا ہے ضرور ہے کہ اس کام کو ختم کیا جائے۔

پہلے یہ خیال تھا کہ ہر کتاب پر مفصل تبصرہ ہو۔ مگر کاغذ کی گرانی اور نایابی کی وجہ سے پیام تعلیم میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ یہ خواہش پوری ہو سکے اس لئے مجبوراً نہایت مختصر طور پر ہر ایک کتاب کے بارے میں اظہار خیال کیا جاتا ہے۔

ان کتابوں میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو اگرچہ پرانی ہیں مگر ان کے نئے ایڈیشن اس سال شائع ہوئے ہیں

اگر پیامیوں نے یہ سلسلہ پسند کیا، اور مصنفین اور مولفین نے اپنی کتابیں اس غرض سے پیام تعلیم کو بھیجیں تو یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہ سکتا ہے۔

(۱) **روٹی کس نے پکائی:**- ۵، ۶ سال کے بچوں کے لئے یہ کتاب عبدالواحد صاحب سندھی نے لکھی ہے اور بڑے اچھے کاغذ پر جلی خط میں مکتبے کی طرف سے باتصویر شائع ہوئی ہے۔ اُمید ہے کہ بچے اس کہانی کو بڑے شوق سے پڑھیں گے، بدتمیزی، محنت، الفت، قطار جیسے لفظوں سے احتراز کیا جاتا تو اچھا تھا۔ کیونکہ اس عمر کے بچوں کے لئے یہ لفظ ذرا مشکل ہیں۔ اُستاد اور والدین کو چاہیئے کہ یہ کتاب بچوں تک پہنچائیں۔ کاپی سائز قیمت ۴ر۔ مکتبہ جامعہ دہلی سے مل سکتی ہے۔

(۲) **آسان املا:**- فیاض حسین صاحب، ایڈیٹر رسالہ ہونہار، دہلی نے اس کتاب میں املا کی دُرستی کے لئے چند ایسی ہدایتیں اور مشقیں مہیا کی ہیں کہ اگر اُستاد اُن ہدایتوں کے مطابق بچوں کو املا سکھائیں تو بچوں کو نہ صرف املا کے سیکھنے میں مدد مل سکتی ہے بلکہ اُن کے خط میں خوش نمائی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ عام کتابی سائز لکھائی، چھپائی اچھی۔ ضخامت ۳۲ صفحے۔ قیمت ۲۰ر۔ مکتبہ جامعہ دہلی سے مل سکتی ہے۔

(۳) **بجلی کی کہانی**
(۴) **مقناطیس کی کہانی**
(۵) **بجلی اور مقناطیس کے کھیل**

یہ تینوں کتابیں علی احمد خاں صاحب بی، ایس، سی (جامعہ) نے لکھی اور مکتبہ جامعہ نے شائع کی ہیں۔ جیسا کہ اُن کے نام سے ظاہر ہے ان میں بڑی آسان زبان میں بجلی اور مقناطیس کے بارے میں ابتدائی معلومات بہم پہنچائی گئی ہے۔ بچے ان کتابوں کو پڑھ کر کافی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ ضخامت علی الترتیب ۴۰، ۳۰ اور ۸۵ صفحات۔ قیمت ۳ر۔ ۲۰ر اور ۴ر۔ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ، دہلی۔

(۶) **جادو کا جہاز:**- اس کتاب میں دو کہانیاں ہیں۔ فیاض حسین صاحب ایڈیٹر ہونہار نے انگریزی کہانیوں سے مدد لے کر لکھی ہیں۔ صفحہ ۳ کے آخر اور صفحہ ۵ کے شروع میں کچھ لفظ لکھے جانے سے رہ گئے ہیں۔ اُن کو درست کر دیا جائے تو اچھا ہے۔ ۲۴ صفحات قیمت ۲۰ر۔ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

(۷) **جھوٹے اور سچے دوست:**- ایک ڈراما ہے، سبق آموز۔ چودھویں منظر میں اشرف کا طرز عمل کوئی وجہ جواز نہ ہونے کی وجہ سے غیر فطری ہو گیا ہے۔ بارہ برس کے بچوں کے لئے موزوں ہے۔ یہ ڈراما بھی فیاض حسین صاحب ایڈیٹر ہونہار نے لکھا ہے۔ ضخامت ۴۴ صفحے۔ قیمت ۲ر۔ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی

(۸) **بلی حج کو چلی**:- یہ کہانی حکیم اللہ صدیقی صاحب نے لکھی ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہوگا کہ دوبارہ چھپی ہے۔ عام کتابی سائز ضخامت ۳۲ صفحے۔ قیمت ۲ر۔ ملنے کا پتہ حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی

(۹) **نئی ایجادیں**:- یہ کتاب نفیس احمد صاحب نے لکھی ہے۔ اس میں ریل، موٹر، ہوائی جہاز وغیرہ گیارہ عنوانوں پر ایجادوں کا حال بڑی سادہ زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ تیسری بار چھپی ہے۔ اس کا مطالعہ بچوں کے لئے مفید ہوگا۔ کتابی سائز ضخامت ۶۰ صفحات۔ قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر، دہلی

(۱۰) **فسانۂ عجائب**:- بشیر احمد صاحب انصاری نے فسانۂ عجائب مصنفہ مرزا رجب علی بیگ لکھنوی کی اسی نام کی کتاب کا خلاصہ کر دیا ہے۔ زبان آسان ہے اس لئے بچے اصل قصے سے واقف ہو کر لطف اٹھا سکتے ہیں۔ ضخامت ۴۸ صفحات۔ قیمت ۳ر ملنے کا پتہ۔ حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر، دہلی۔

(۱۱) **بچوں کی پیاری کہانیاں**:- یہ کہانیاں بال کرشن داس صاحب نے لکھی ہیں۔ خاصی دلچسپ کتاب ہے۔ ضخامت ۴۸ صفحات قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ۔ دی ودیا پبلشنگ ہاؤس، انبالہ چھاؤنی۔

(۱۲) **سدا بہار ڈرامے**:- اتفاق۔ سفارشی چٹھی۔ آدھا انعام کی مشہور کہانیوں کو مفتی غلام جعفر صاحب بی اے نے تمثیل کے پیرائے میں بہت عمدگی سے پیش کیا ہے۔ ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ۔ رائے صاحب گلاب سنگھ اینڈ سنز، لاہور۔

(۱۳) **بگلا بھگت**:- یہ کہانی ڈاکٹر ایف ایم شجاع ناموس نے لکھی ہے۔ اس کہانی کی عبارت مشکل اور مزید توجہ کی محتاج ہے۔ الفاظ نامانوس اور دوران عبارت میں تشریحیں ایسی ہیں جن سے کہانی کی دلچسپی میں فرق پڑتا ہے۔ کہانی سبق آموز ہے۔ مگر چھوٹے بچوں کے مطلب کی نہیں۔ دس بارہ برس کے بچے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ ملنے کا پتہ۔ رائے صاحب گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور۔

(باقی آئندہ)



مرے پیارے بچو بہن اور بھائی — سناتا ہوں میں تم کو باتیں ہوائی

ہوائی کے معنی نہ غپ شپ سمجھنا — ہوائی سے مطلب ہے یاں ریڈیائی

مرا تجربہ ہے کہ بھاتی بہت ہے — مرے پیارے بچوں کو املی کھٹائی

تو بھر آیا پانی تمہارے دہن میں — کشش نام میں اس کے ہے کہربائی

یہ ہے چیز بے شک بڑے فائدے کی — کہاں اس کا پاسنگ دودھ اور ملائی

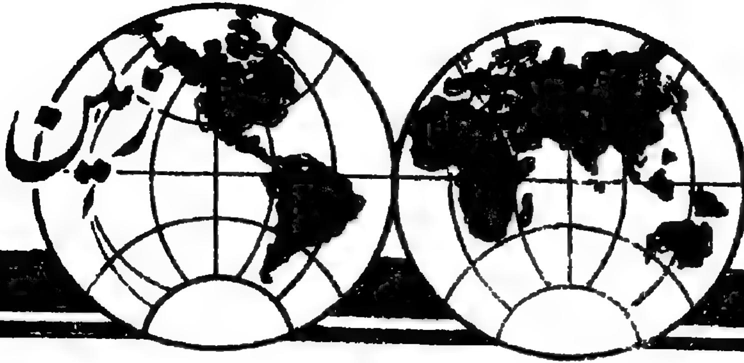
سناتا ہوں میں چند اس کے فوائد — مصنف ہیں اس کے حکیم سنائی

اگر کھانے لگ جائے ہر شخص اس کو — تو دنیا سے مٹ جائے جھگڑا لڑائی

جکڑ جاتے ہیں ہاتھ اور پیر اس سے — نہ پھرتی ہے گردن نہ گھومے کلائی

جو گُھٹنے ہیں اکڑے تو کُہنی ہے ٹیڑھی | پھر ایسے میں مُمکن کہاں ہاتھا پائی
یہی حال اِک دن تُمھارا بھی ہوگا | اکڑ جاؤگے کھا کے اِملی کھٹائی
نہ تُم مدرسے جاسکوگے نہ مکتب | کہاں کی لِکھائی کہاں کی پڑھائی
نہیں اُٹھنے دے گی نہ یہ چلنے دے گی | مزے سے پڑے توڑوگے چارپائی
مگر تم نہ پاؤگے راحت وہاں بھی | کمر درد کے مارے دے گی دُہائی
کراہا کروگے پڑے بستروں پر | مرا میرے باوا مرا میری مائی
کسیلی کبھی اور کبھی کڑوی کڑوی | تُمھیں روز پینی پڑے گی دوائی
نہ فالوُدہ پینے کو تم کو ملے گا | نہ کھانے کو آئس کریم اور ملائی
غرض فائدے اس میں لاکھوں ہیں بچو | نہ کھاؤگے کیا اب بھی اِملی کھٹائی
"نہیں کھائیں گے اب نہیں کھائیں گے آپا" | مرے کان میں کیسی آواز آئی
خدا تندرست اور خوش تم کو رکھے | تمھاری زباں عمدہ چیزیں ہی چکھے

ہماری زمین



میں نے کہا" مگر بھائی ہم تو زمین کی باتیں کر رہے تھے۔ اس بندر کے قصّے نے بہت طول کھینچا اور ہم اپنی پگڈنڈی سے ذرا ہٹ گئے۔ اچھا ایک بات تو بتاؤ۔ دیکھو سچ سچ بتانا ہم جواب تک بک بک کرتے رہے۔ کچھ تمھاری سمجھ میں بھی آیا؟" واجد میاں بہت اکڑ کے کہنے لگے "کیوں نہیں آپ نے مجھے کوئی کوڑھ مغز سمجھا ہے۔ دیکھئے آپ نے یہی تو کہا تھا اوں اوں (کچھ دیر تک سوچ کر آنکھیں بھیچ کر گردن جھکائے اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر) ہاں یاد آیا دیکھئے، آپ نے یہی تو بتایا تھا کہ جیسے اور ستارے ہیں، چاند، سورج وغیرہ ایسے ہی ہماری زمین بھی ایک ستارہ ہے اور بھئی ——— ہماری زمین سورج سے نکلی ہے۔ یعنی کوئی ستارہ سورج کے قریب آگیا۔ دونوں میں گڑبڑ یعنی کھینچا تانی ہوئی اور اس گڑبڑ میں سورج کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر اس سے الگ ہوگیا۔ اور خود ایک ستارہ بن گیا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟" میں نے کہا۔ "جی ہاں، یعنی بالکل ٹھیک ہے اور آگے۔" واجد میاں بولے۔ "اور آگے یہ کہ ہماری زمین کا ایک ٹکڑا جانے کیسے الگ ہوا تو چندا ماموں بن گئے۔" میں نے کہا "پھر؟" واجد میاں بولے "پھر یہ کہ بہت دنوں تک، اتنے دنوں تک کہ ہم حساب بھی نہیں لگا سکتے۔ زمین گیس کی حالت میں رہی۔ پھر آہستہ آہستہ جانے کتنے دنوں میں اس نے گرم گرم لگدی کی سی شکل اختیار لی۔" میں نے کہا "یہ لگدی تمھیں خود یاد رہا، اچھا پھر؟" واجد میاں نے جواب دیا "پھر یہ لگدی آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہونے لگی اور ٹھنڈی ہو کر سکڑی۔ اس سکڑنے سے سوکھے ہوئے سیب کی طرح کہیں تو بڑے بڑے پہاڑ ابھر آئے اور کہیں غار یا سمندر بن گئے۔ پھر کئی گیسوں سے مل کر پانی بنا پھر بارش ہوئی، پھر آہستہ آہستہ ننھے ننھے جان دار، چھوٹی چھوٹی گھاس پیدا ہوئی پھر ہوتے ہوتے بڑے بڑے ہیبت ناک جانور

بڑے بڑے درخت پیدا ہونے لگے۔ پھر یہ بڑے بڑے جانور ختم ہوگئے اور ان کی جگہ دوسرے جانور اور پھر انسان پیدا ہوا اور آہستہ آہستہ دنیا نے اتنی ترقی کر لی جتنی ہم آج کل دیکھ رہے ہیں۔" میں نے کہا: "شاباش، خدا تمھارے علم میں ترقی دے اچھا میں نے کچھ اور تو نہیں بتایا تھا؟" واجد میاں نے کہا "ہاں۔ آپ نے یہ بھی بتایا تھا کہ زمین خود بھی لٹو کی طرح گھومتی ہے اور سورج کے گرد چکر بھی لگاتی ہے۔" ماموں صاحب بولے۔ "اچھا ایک بات تو بتاؤ یہ زمین کیا ہمیشہ ایسی ہی رہے گی؟" میں نے کہا زمین کے بارے میں ابھی تو آپ کوئی فکر نہ کیجیے ابھی ابھی کیا کروڑوں بلکہ اربوں سال تک ویسے زمین کی قسمت سورج کے ساتھ ہے اگر سورج کی طاقت کم ہوگئی اور روشنی بھی کم ہوگئی تو لازمی بات ہے کہ اس کی کشش یعنی کھینچنے کی طاقت بھی کم ہو جائے گی اور زمین سورج سے بہت دور چلی جائے گی اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زمین پر اندھیرا چھا جائے گا۔ اور گرمی کی کمی کی وجہ سے ہر طرف برف ہی برف نظر آئے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سورج کی گرمی اور روشنی کسی وجہ سے یکایک بڑھ جائے۔ ایسی حالت میں جتنے بھی انسان، حیوان، چرند، پرند اور اور پودے وغیرہ ہیں، سب جل بھن جائیں گے اور یوں سمجھیے کہ قیامت آجائے گی۔ اسی طرح کے اور بھی خطرے ہیں۔ مثلاً کوئی ستارہ سورج سے ٹکرا جائے یا دو چھوٹے چھوٹے ستارے آپس میں ٹکرا جائیں اور ان میں سے کوئی زمین کی طرف نکل آئے۔ اسی طرح کے اور بھی بہت سے خطرے ہیں۔ لیکن یہ سب سائنس کے عقل و دماغ کی پیداوار ہیں۔ کوئی یقینی بات نہیں کہی جا سکتی۔ بہرحال ہمیں آپ کو تو بالکل اطمینان رکھنا چاہیئے۔ ہماری زندگیاں تو بڑے اطمینان سے گذر جائیں گی۔" ماموں صاحب ہنس کر کہنے لگے۔ "جی ہاں اس کا تو مجھے بھی اطمینان ہے۔ اچھا ایک بات اور بتا دو، پھر میں تم سے کوئی سوال نہیں کروں گا۔ یہ بتاؤ کہ یہ آبادی بس زمین ہی پر ہے یا کسی اور ستارے پر بھی ہے؟" میں نے کہا: "ابھی تک تحقیقی بات یہی ہے کہ یہ شرف کسی اور ستارے کو حاصل نہیں ہے۔ پہلے چاند کے بارے میں لوگوں کو خیال ہوا تھا۔ کہ وہاں آبادی ہے مگر یہ خیال غلط نکلا۔ اب ایک ستارہ ہے مریخ۔ اس کے بارے میں لوگ کچھ اسی قسم کا خیال ظاہر کر رہے ہیں۔ بلکہ بہت سے سائنس داں تو مریخ تک پہنچنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ مگر ابھی تک مریخ کی آبادی کے بارے میں بھی یقینی بات نہیں کہی جا سکتی۔" ممانی یعنی واجد میاں کی امی چولھے کے پاس بیٹھی آٹے کے پیڑے بنا رہی تھیں۔ کہنے لگیں "سالن پک چکے ہیں۔ لاؤ

چولھے پر رکھ دیا ہے۔ گرم گرم اور تازی تازی روٹی کھانا ہو تو اس داستان کو ختم کردیں دسترخوان بچھواتی ہوں۔" فہمیدہ بولیں "لو یہ کرو بھائی یہ داستان کہیں ختم ہو سکتی ہے۔ یہ تو ابھی ابھی شروع ہوئی ہے بے چاروں کو اپنی قابلیت جتانے کا آج ہی تو موقع ملا ہے۔ عائشہ خاتون بولیں "ہونھ کچھ آتا جاتا ہوتا تو جانے کیا حال ہوتا"۔ میں نے کہا "نہیں بھئی اب اس داستان یا کہانی کو ختم ہی سمجھو۔ ہمارا تمھارا خدا بادشاہ

بچوں کی نظمیں

مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر کی اصلاح کے بعد

علم

علی احمد پشاوری

ہے علم بھی عجیب شے — یہی دلاتی ہے روپے
یہی خوشی کے ہے پلائے — یہی خدا سے بھی ملائے
یہی ہے دوست باصفا — یہی ہے یارِ باوفا
یہ علم طرفہ ریل ہے — سیاحت اس کا کھیل ہے
یہ علم جس کا یار ہے — اسی کا بیڑا پار ہے
جلاؤ علم کا دیا — ہے کرتے ہی کی بدیا
لگاؤ علم و فن سے لو — ہے جس میں مہر و مہ کی ضو
اب اس کی راہ میں بڑھو — خرد کے بام پر چڑھو
علی نئی کتاب لو — پڑھو، پڑھو، پڑھو، پڑھو

چھوٹے تارے

نسیم احمد زبیری

چمکو چمکو چھوٹے تارو — چھوٹے چھوٹے پیارے تارو
چمکو چمکو تم ساری شب — چمک چمک کر رات گذارو
آؤ آؤ جلدی آؤ — آؤ ہم سب مل کر کھیلیں
تم تو ہو آکاش کے تارے — ہم ہیں اپنے گھر کے تارے
تم کو بھی ہے اس نے بنایا — ہم کو بھی ہے اس نے بنایا
لو اب پاس ہمارے آؤ — ہم تم مل کر کھیل رچائیں
چمکو چمکو چھوٹے تارو — چمکو چمکو تاج کے پیارو

صبح کا سہانا وقت

امام الدین انصاری گوہر

وقت سحر ہے کیسا سہانا — گاتی ہیں چڑیاں پیڑ پہ گانا
باغ میں ٹھنڈی ہوائیں آئیں — موجیں دریا میں لہرائیں
شاخوں میں غنچے جھول رہے ہیں — پھول خوشی سے پھول رہے ہیں
نغمہ سرا ہے بلبل کیا کیا — جلوہ نما ہے ہر گل کیا کیا
اٹھو سویرے کر لو عبادت — لوٹو دونوں جہاں کی دولت
پڑھنے والے لڑکے جاگے — ناشتہ کر اسکول کو بھاگے
صبح کا منظر دیکھو گوہر — اچھا دلکش پیارا بہتر

بہار کی آمد

امام الدین انصاری گوہر

معطر، معنبر بہار آگئی — کھلے گل ہزاروں ہزار آگئی
فضا دھانی جوڑا بدلنے لگی — درختوں میں کونپل نکلنے لگی
شجر ہر طرف لہلہانے لگے — طیورِ چمن مل کے گانے لگے
نیا ہو گیا دہر کا ماجرا — ہے منظر عجب دل کشا دل فزا
گلے غنچے آپس میں ملنے لگے — چمن ہنس پڑا پھول کھلنے لگے
ہر اک خشک صحرا چمن بن گیا — بہار آئی عالم دلہن بن گیا

نہ جائیں گے ہم کعبہ و دیر کو
اٹھو آؤ گوہر چلو سیر کو

آپا جان کی یاد میں

محمد مسیح الزماں

ہے فنا کو بقا دوام کہاں ⁂ رنگ و بو میں نہیں قیام یہاں
چل بسیں آہ آپا جان ⁂ غم جدائی کا دے گئیں ارمان
حیف کیوں ہوگئیں جدا ہم کو ⁂ لے خدا کیا ہوئی خطا ہم سے
سب کی ہمدرد جامعہ کی جان ⁂ ہائے اب تم کہاں ہو آپا جان
موت نے تیری سوگوار کیا ⁂ ساری دنیا کو اشکبار کیا
عرض میری ہے یہ خدا سن لے ⁂ ان کو فردوس میں جگہ دیدے

برسات

محمد وحیدالدین، اعظم گڑھ

جون کا بھی مہینہ گیا آیا ⁂ ساتھ برسات کو پکڑ لایا
گھر سے باہر گئے ہوئے لت پت ⁂ مینہ کیا ہے کہ ایک ہے آفت
شور کی اب سکون نے لی آڑ ⁂ رات دن ہو رہی ہے جھم دھاڑ
وہ پھسل کر ہوا کوئی تلپٹ ⁂ گرتے گرتے کسی نے لی کروٹ
گر ٹہلنے کی سمت موڑے باگ ⁂ آئے واپس میں بھاگم بھاگ
باغ کی سیر کی ہے یہ حالت ⁂ خوب کپڑوں کی بن رہی ہے گت
روشنی یوں گھٹا نے مدھم کی ⁂ دوپہر دن میں رات آدھمکی
اف یہ بارش نے کیا غضب ڈھایا ⁂ باکے جیٹی بھی میں نہ گھر آیا
شام سے صبح تک ڈسیں مچھر ⁂ بیٹھ کر اب کھجائیے دن بھر
لوگ تعریف کرتے ہیں کیسے ⁂ میں تو باز آیا ایسے موسم سے

حمیدہ اور اس کے ماموں

سعیدہ خانم انصاری - دہلی

حمیدہ بہت تھی شریر اک لڑکی
بغیر اپنے ماموں کے ہرگز نہ رہتی
اگر اپنے ماموں کو وہ دیکھ لیتی
تو پھر ماموں ماموں وہ کہتی ہی رہتی
یہی صبح اور شام تھا اس کا دھندا
تھا الفت کا ماموں کی گردن میں پھندا
کھلونے سے مطلب نہ کھانے سے مطلب
نہ پڑھنے سے رغبت نہ لکھنے سے مطلب
نہ اماں سے خوش اور نہ ابا سے خوش تھی
نہ تایا سے خوش اور نہ چچا سے خوش تھی
اگر چند روز اس کے ماموں نہ آئیں
اگر بہن اور بھائی اس کو کھلائیں
نہ بشاش ہوا ورنہ وہ شاد ہو
پھری دل میں ماموں کی بس یاد ہو
غرض ہے حمیدہ عجیب ایک لڑکی
بغیر اپنے ماموں کے بے چین رہتی
سعیدہ نے قصہ یہ ہے خوب لکھا
بہن اپنی چھوٹی کا یوں حال لکھا
پیامی سنیں اور دل بھر کے خوش ہوں
حمیدہ کی یہ داستاں سن کے خوش ہوں



سسلی

محمد عبد الرشید مہاجر - حیدرآباد دکن۔

ٹیونشیا کی فتح کے بعد اتحادی فوجوں کا سیلاب سسلی کی طرف بہہ نکلا ہے۔ یہاں بھی اٹلی کی فوجیں دُم دبا کر بھاگتی نظر آئیں۔ ہاں جرمن فوجوں نے ہر موقع پر خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ پھر بھی اتحادی فوجوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور جرمن فوجیں برابر پیچھے ہٹ رہی ہیں۔

سسلی بحر روم کا سب سے اہم جزیرہ ہے۔ اس کی یہ اہمیت اب سے نہیں ہزاروں سال پہلے سے ہے۔ یہ مثلث نما جزیرہ ہے اور اٹلی کے جنوب میں ہے۔ آبنائے مسینا اسے اٹلی سے جدا کرتی ہے۔ اس آبنائے کی سب سے کم چوڑائی کوئی دو میل ہے۔ سسلی کا رقبہ کوئی ۹۹۸۵ مربع میل ہے اور آبادی کوئی چالیس لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ یہ علاقہ زیادہ تر پہاڑی ہے۔ کٹانیہ کے آس پاس کا علاقہ سب سے زیادہ ہموار ہے۔ مشہور آتش فشاں اٹنا بھی اسی علاقے میں ہے۔ آب و ہوا یورپ کے جنوبی ملکوں کی طرح ہے۔ یعنی معتدل ہے۔ سردیوں میں کافی بارش ہوتی ہے۔ کبھی کبھی برف بھی گر جاتی ہے۔ گرمیوں میں بارش کا اوسط بہت کم رہتا ہے۔ اٹنا پہاڑ کا نیچے کا حصہ بہت زرخیز اور آباد ہے۔ بیچ کے حصے میں گھنے جنگل ہیں۔ اوپر کا حصہ لاوے کی وجہ سے بنجر اور غیر آباد ہے۔ اب یہاں بھی لیمو، نارنگی اور بادام کی کاشت کی جاتی ہے۔ ویسے بھی سسلی کے تمام علاقے میں نارنگی، لیمو اور زیتون کی پیداوار زیادہ ہے۔ گیہوں بھی بہت پیدا ہوتا ہے۔ کٹانیہ کا علاقہ خاص طور پر بہت زرخیز ہے۔



سسلی میں معدنیات زیادہ نہیں پائی جاتیں۔ ہاں گندھک بہت ہوتی ہے۔ اور آج کل لڑائی کے

زمانے میں یہ خصوصاً بہت قیمتی چیز ہے۔ مچھلی کی تجارت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔ غوطہ خور اسفنج بھی نکالتے ہیں۔

یہاں ۱۸۶۰ء میں ریلوے لائن بچھائی گئی۔ اور آہستہ آہستہ تمام اہم مقامات تک پہنچائی گئی۔ اب بھی ریلوے لائن کی کل لمبائی بارہ سو میل ہے۔ پالرمو، کٹانیہ، مسینا، لکارٹا، مارسلا اور سیراکیوس یہاں کی مشہور بندرگاہیں ہیں پالرمو سسلی کا دار السلطنت ہے۔

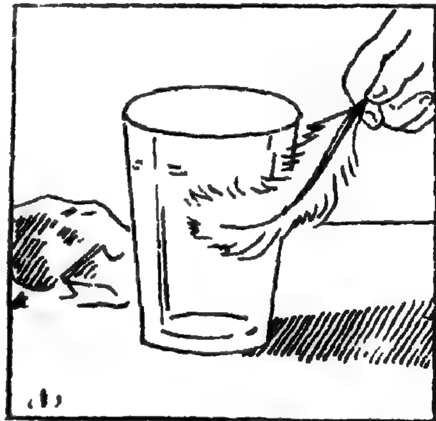
اس جزیرے پر بہت سی قوموں کا قبضہ رہا ہے۔ پہلے اہل فنیشیا نے اس پر قبضہ کیا پھر یونانی آئے۔ پھر رومن پھر مسلمان پھر نارمن سب سے آخر میں یہ اٹلی کی حکومت میں آگیا۔ مسولینی کے زمانے میں اس جزیرے نے کافی ترقی کی۔ بہت سی کچی اور پکی سڑکیں بنوائی گئیں۔ پارک تیار کرائے گئے۔ سینما گھر کھولے گئے اور ایک بہت بڑا بنک کھولا گیا۔ مگر اب یہاں کشت و خون کا بازار گرم ہے۔ اتحادی فوجوں کا ٹڈی دل برابر بڑھتا چلا آرہا ہے۔ اطالوی فوجیں بھاگ رہی ہیں یا ہتھیار ڈال رہی ہیں۔ جرمن فوجیں پیچھے ہٹ رہی ہیں اور اب تھوڑے ہی دنوں میں خبر آنے والی ہے کہ سسلی پر اتحادیوں کا قبضہ ہوگیا۔

بجلی کے کھیل

مشتاق احمد اعظمی

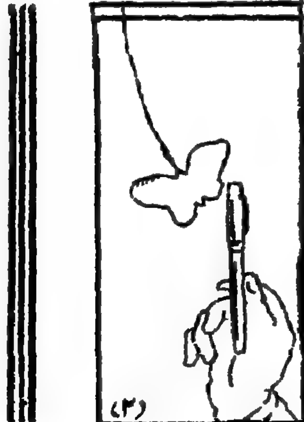
پچھلے پیام تعلیم میں ہم نے کشتی والا مضمون چھپوایا تھا بہت سے بچوں نے اسے پسند کیا۔ آؤ آج تمھیں بجلی کے کچھ کھیل کھلائیں۔

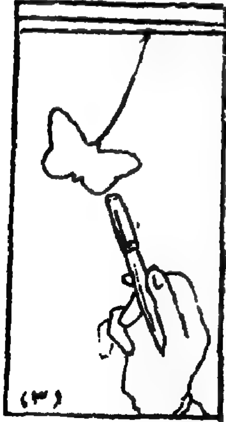
جاؤ ایک شیشے کا گلاس لے آؤ۔ اب ذرا اسے گرم کر لو۔ کہیں اتنا گرم نہ کر دینا کہ تڑاق سے ہو جائے اور بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ گلاس گرم ہو جائے تو اُسے کسی خشک ریشمی


(۱)

کپڑے سے خوب رگڑ دو۔ اب اگر تم کسی پر کو گلاس کے قریب لے جاؤ گے تو وہ بڑی تیزی سے اس کی طرف لپکے گا جیسے برسوں کے چھوٹے ہوئے دوست مل رہے ہیں۔ آخر یہ پر اس تیزی سے گلاس کی طرف کیوں جھپٹا۔ بہت معمولی سی بات ہے۔ گرم گلاس پر ریشمی کپڑا رگڑنے سے گلاس میں بجلی پیدا ہو گئی اور اس نے پر کو اپنی طرف کھینچا۔

ایک کھیل اور :۔ باریک کاغذ کی دو تتلیاں کترو اور اُنھیں ریشم کے تاگے سے شیشے کی چھڑی میں لٹکا دو۔ اب (گندھک ملی ہوئی ربر کا) ایک فاؤنٹین پن لے لو اور اسے اون یا خشک فلالین کے ٹکڑے سے رگڑ لو۔ یہ قلم تم لٹکتی ہوئی تتلی کے پاس لے جاؤ۔ تتلی فوراً قلم کی طرف


(۲)


(۳)

کھنچ آئے گی (تصویر نمبر ۲) مگر تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس سے الگ ہٹ جائے گی اور تم جتنا جتنا قلم کو قریب کرو گے اتنا اتنا وہ دور بھاگتی جائے گی (تصویر نمبر ۳) تمھیں اس

بات پر تعجب ہوگا - ہے بھی تعجب کی بات - اچھا آؤ چلتے چلاتے تمھیں بجلی کے بارے میں دو چار باتیں بتاتے چلیں - ان کے معلوم ہوجانے پر تمھیں اور دوسرے کھیلوں میں زیادہ مزا آئے گا اور تتلی کے بھاگنے کی وجہ بھی معلوم ہوجائے گی -

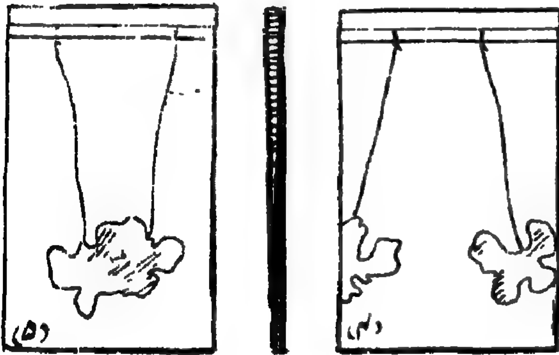
بجلی کی دو خاص عادتیں ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں - ان میں سے ایک تو اس میں چیزوں کو اپنی طرف کھینچنے کی طاقت ہے - اور دوسری اپنے سے پرے ڈھکیل دینے کی - کیسی عجیب عادتیں ہیں - اب اس بجلی کی بھی دو قسمیں ہیں ایک کو مثبت بجلی کہتے ہیں دوسری کو منفی -

ایک گُر کی بات اور سن لو - دو چیزوں میں اگر ایک ہی قسم کی بجلی بھری ہوگی - مثلاً صرف مثبت ہی مثبت یا صرف منفی ہی منفی تو یہ دونوں ایک دوسرے سے دور بھاگیں گی - لیکن دو چیزوں میں دو مختلف بجلیاں ہوں گی - مثلاً (ایک میں مثبت اور ایک میں منفی) تو یہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچیں گی -

کیوں اب تو سمجھ گئے نا! کاغذ والی تتلی قلم سے کیوں بھاگنے لگی؟ بڑی سیدھی سی بات ہے - پہلے کاغذ کی تتلی اس لئے قلم کی طرف کھنچ آئی تھی کہ قلم میں منفی بجلی پیدا ہوگئی تھی - اب ہوا یہ کہ ربر کی قربت کی وجہ سے قلم کی منفی بجلی تتلی میں بھی پہنچ گئی - دونوں میں ایک ہی قسم کی بجلیاں پیدا ہوگئیں تو ایک کو دوسرے سے نفرت ہوگئی - اور بی تتلی صاحبہ دور بھاگنے لگیں -

ایک تجربہ اور کرو تتلی میں پہلے کی طرح قلم کے ذریعے منفی بجلی پہنچاؤ اور فوراً ہی مثبت بجلی سے بھری ہوئی شیشے کی چھڑی تتلی کے پاس لے جاؤ - تتلی شیشے کی چھڑی سے چمٹ جائے گی -

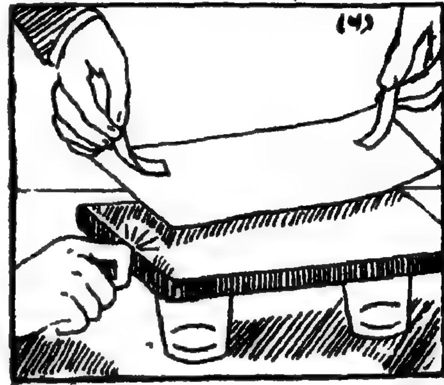
اچھا ایک اور مزے کا کھیل! ایک شیشے کی چھڑی میں دو کاغذ کی تتلیاں لٹکاؤ - دونوں کے درمیان ایک انچ کا فاصلہ رکھو - اب ایک اور شیشے کی چھڑی سے دونوں میں بجلی پہنچاؤ - دونوں ایک دوسرے سے دور بھاگیں گی - (تصویر نمبر ۴) اچھا اب قلم کے ذریعے بجلی پہنچاؤ - ارے! اب بھی تو یہ اسی طرح بھاگ رہی ہیں - اچھا ابھی ایک تیسرا تجربہ کرنا ہے - تم ایک میں



تو قلم کے ذریعے منفی بجلی پہنچاؤ اور دوسری میں شیشے کے ذریعے مثبت بجلی پہنچاؤ - بھئی واہ اب کے تو دونوں ایک دوسرے کی طرف کھنچ آئیں - جیسے گلے مل رہی ہوں (تصویر نمبر ۵)

کیوں ابھی جی نہیں بھرا؟ اچھا تو ایک اور

کھیل سہی۔ تمہارے گھر میں قلعی کی ہوئی ٹرے تو ہوگی اس کی لمبائی ایک فٹ ہو تو اچھا ہے۔ اب موٹے بادامی کاغذ کا ایک ٹکڑا ٹرے کی ناپ کا کاٹ لو۔ یہ ٹرے کے اندر بالکل فٹ ہو جائے۔ اس کاغذ کے دونوں سروں پر کاغذ کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے گوند سے چپکا دو یہ گویا دستے کا کام دیں گے۔ (تصویر نمبر ۶)



اب ٹرے دو گلاسوں کے اوپر رکھ دو تاکہ زمین سے الگ ہو جائے۔ ٹرے میں بچھنے والے کاغذ کو پہلے ذرا گرم کر لو پھر اُسے کسی لکڑی کی میز پر رکھ کر کپڑے کے گولے سے یا اونی کپڑے سے خوب رگڑ دو۔ رگڑ چکے؟ اب اسے دستوں سے پکڑ کر ٹرے میں رکھ دو۔ دو ایک منٹ گذرنے کے بعد اسے ٹرے میں اُٹھا لو اور اپنے کسی دوست سے کہو کہ وہ اپنی اُنگلی کے سرے یا پور کے جوڑ سے ٹرے کے کنارے کو چھوئے۔ اُنگلی لگاتے ہی ٹرے میں سے شرارے نکلنے لگیں گے مگر یہ شرارے اور یہ چنگاریاں کہاں سے آگئیں ارے جناب! یہ بجلی ہے۔ ابھی ابھی کاغذ کے ٹکڑے میں سے نکل کر ٹرے میں سما گئی تھی اور اب ٹرے میں سے نکل کر تمہارے دوست کی اُنگلی میں داخل ہو رہی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے بجلی کا شعلہ بادل کے کسی ٹکڑے سے نکل کر کسی دوسرے بادل یا پھر زمین میں سماتا ہے۔ اس کی پوری کیفیت تم پیام تعلیم کے پچھلے سالنامے میں پڑھ چکے ہو۔

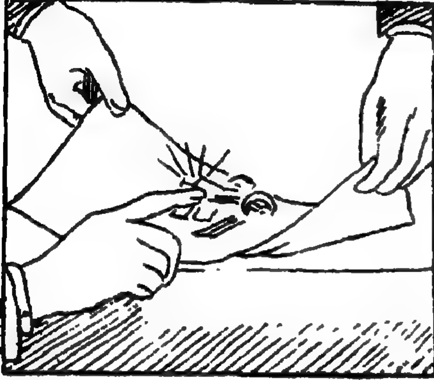
تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ یہی تجربہ پھر کرو اس مرتبہ ٹرے کو اُنگلی سے نہ چھوؤ۔ چمچے کے دستے سے چھوؤ۔ یہ چمچہ کچھ دیر تک ایک خشک گلاس میں رکھا رہا ہو۔ اور گلاس میں بندوق کے چھرّے بھرے ہوئے ہوں۔ ہاں ایک بات کا خیال رکھنا۔ ٹرے چھوتے وقت چمچہ گلاس سے نکالا نہ جائے۔ تھوڑی دیر بعد گلاس کو چمچہ سمیت ٹرے سے الگ ہٹا لو۔ اور ایک ہاتھ میں گلاس تھام کر دوسرے ہاتھ کی اُنگلی کے سرے یا پور کے جوڑ سے چمچے کا دستہ چھوؤ



(تصویر نمبر ۷) تمھیں تڑاقے کی آواز سنائی دے گی

اور شرارے نکلتے دکھائی دیں گے۔ ہوا یہ کہ بڑے کی بجلی چھرے بھرے گلاس میں سما گئی اور اب یہی بجلی انگلی لگانے سے گلاس سے خارج ہو رہی ہے۔ کیوں! ابھی گھبرائے تو نہیں! اچھا ایک آخری کھیل اور۔ یہ بھی بہت مزے کا ہے۔ بادامی کاغذ یا نقشہ بنانے والے کاغذ کا ایک ٹکڑا میز پر پھیلا کر اونی کپڑے سے خوب رگڑو۔ پھر کنجیوں کا ایک چھوٹا سا گچھا کاغذ کے بیچوں بیچ رکھ دو اور ورق کے دونوں کنارے پکڑ کر اوپر اٹھاؤ۔ اب اگر کنجیوں کو کوئی چھوئے گا تو کچھ روشن شرارے گچھے میں سے نکل کر انگلی میں سما جائیں گے (تصویر نمبر ۵)

دیکھو! کیسے مزے کے اور کتنے آسان کھیل ہیں اور ہمیں کتنی نئی باتیں معلوم ہو گئیں۔ ایک تو یہ کہ مثبت، مثبت بجلی سے اور منفی بجلی منفی بجلی سے دور بھاگتی ہے۔ اور مثبت بجلی، منفی بجلی کو اور منفی بجلی، مثبت بجلی کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ علاوہ اس کے فونٹین پن کو خشک اون سے رگڑنے سے منفی بجلی پیدا ہوتی ہے۔ اور شیشے کی چھڑی کو خشک اون سے رگڑنے سے



مثبت بجلی پیدا ہوتی ہے۔

مگر ہاں یہ سب کھیل خشک موسم میں کھیلنے کے ہیں۔ کھیل کی تمام چیزیں بھی خشک ہونی چاہئیں۔ ذرا بھی گیلی ہوئیں تو تجربہ کامیاب نہ رہے گا۔

پیامِ برادری

پیاری بچیو اور بچو! خوش رہو اور تندرست۔

آج کل برسات کے موسم کی آخری بہار ہے۔ ۱۵ر اکتوبر سے جاڑے شروع ہو جائیں گے۔ اس مرتبہ ہر جگہ بہت اچھی بارش ہوئی۔ خود دہلی میں جہاں کبھی کبھی تو پورا موسم یوں ہی خشک گذر جاتا تھا۔ ساری برسات آسمان پر بادل چھائے رہے۔ کہیں کہیں تو بارش کی زیادتی سے سیلاب بھی آگیا۔ میواڑ کے علاقے میں دو ندیوں کے بند ٹوٹ جانے سے اچانک سیلاب آگیا اور ہزاروں جانیں تلف ہو گئیں۔ اسی طرح بردوان میں بھی زبردست سیلاب آیا اور جانی اور مالی دونوں نقصان ہوئے۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے جاڑے بخار کی شکایتیں بھی سننے میں آرہی ہیں۔ بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

لیجئے جناب سسلی پر تو اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا اور اب کوئی دن جاتا ہے جو خود اٹلی پر حملہ شروع ہوتا ہے۔ ادھر کیوبک کانفرنس میں بہت سی اہم باتیں طے ہوئی ہیں۔ کانفرنس میں علاوہ مسٹر چرچل اور مسٹر روزولٹ کے اور دوسرے اہم لوگ بھی شریک ہوئے تھے۔ روسی حکومت کے وزیر اعظم اسٹالین اس مرتبہ بھی غیر حاضر تھے۔ ایک نئی بات یہ ہوئی کہ کانفرنس ہی کے زمانے میں روسی حکومت نے امریکہ اور انگلستان سے اپنے سفیر واپس بلالئے اور ان کی جگہ دو نئے سفیروں کو مقرر کیا۔ ان کی شخصیت سیاسی معاملات میں اتنی اہم نہیں تھی۔ روس کے اس اچانک فیصلے پر اخباروں میں بہت چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ بعض اخبار اس کا سبب امریکہ کے موجودہ رویے کو قرار دیتے ہیں۔ کیوبک میں روس کے شریک نہ ہونے کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس موقع پر زیادہ تر جاپان کے معاملے میں مشورے ہوئے اور جاپان سے روس کی دوستی ہے اس لئے روس کی شرکت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

سنا ہے اس کانفرنس میں یورپ میں دوسرا محاذ قائم کرنے کے بارے میں بھی قطعی فیصلہ ہو چکا ہے اور یہ دوسرا میدان غالباً اٹلی ہی ہوگا۔ اس طرح ایک تو روس کا مطالبہ پورا ہو جائے گا، دوسرے لڑائی کے جلد ختم ہو جانے کا امکان بھی پیدا ہو جائے گا۔ بہرحال یہ تو طے ہے کہ خود جرمنی پر اور جرمنی کے مقبوضہ علاقوں پر بمباری خوب ہوگی۔ اسی طرح جاپان پر بھی

پہلے سے زیادہ سازو سامان کے ساتھ اور زیادہ شدت سے حملے کئے جائیں گے۔ پہلے تو عام خیال یہ تھا کہ پہلے ہٹلر اور مسولینی سے نپٹ لیا جائے۔ جاپان کو بعد میں دیکھ لیں گے۔ مگر اب یہ خیال بدلتا ہوا معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ جاپان نے جس آسانی سے جاوا، ملایا، سنگاپور اور برما پر قبضہ کیا ہے اس نے سب کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ یہ سب جگہیں ایسی ہیں جن میں تیل اور دوسری بہت قیمتی چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ جاپان ان سب سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اور اپنی طاقت کو خوب بڑھا رہا ہے۔ جتنی دیر میں ان کی طرف توجہ کی جائے گی اسی قدر اس پر قابو پانے میں مشکل پیش آئے گی۔ امریکہ کو جاپان کے خلاف کارروائی پر زیادہ اصرار تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ انگریزوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اب لارڈ لوئس ماؤنٹ بیٹن جنوب مشرقی ایشیا کے کمانڈر انچیف بنائے گئے ہیں یہ اس سلسلے میں مشورے کے لئے امریکہ گئے ہیں۔ غالباً چین کے دارالسلطنت چنگکنگ بھی جائیں گے۔ جاپان پر حملہ ہندوستان سے کیا جائے گا۔ اسی کو اس مقصد کے لئے مرکز بنایا جائے گا۔

روس میں جرمنی اب بجائے حملہ کرنے کے حملوں کا جواب دے رہا ہے۔ روسی فوجیں بڑی بہادری اور جرأت سے آگے بڑھ رہی ہیں انھوں نے خارکوف جرمن فوجوں سے چھین لیا ہے۔ اس خوشی میں ماسکو میں خاص طور پر چراغاں کیا گیا۔ اور خوب خوشی منائی گئی اس لئے اور بھی کہ اب ماسکو شہر دشمنوں سے محفوظ ہو گیا۔ اب روسی فوجیں یوکرین کی طرف بڑھ رہی ہیں اور کوئی سو میل آگے تک چلی آئی ہیں۔

آج کل اسپین کے ڈکٹیٹر جنرل فرانکو اور برطانیہ کے سفیر سر سموئل ہور سے اہم معاملات پر بات چیت ہو رہی ہے معلوم ہوا ہے اسپین برطانیہ سے جہاز رے کر جرمنی کو دیتا رہا علاوہ اس کے اسپین میں جرمنی کے ایجنٹ تھے جو انگریزوں کے بارے میں اہم خبریں جرمنی کو بھیجتے تھے۔

ہندوستان کے معاملات بدستور ہیں۔ بنگال میں لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں۔ خود کلکتے میں پولیس روزانہ بہت سے بے جان لوگوں کو سڑکوں پر سے اٹھا اٹھا کر ہسپتال پہنچا رہی ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ مر جاتے ہیں کچھ اچھے بھی ہو جاتے ہیں۔ دوسرے مقامات پر بھی حالات کچھ بہتر نہیں ہیں۔ اناج اور ضرورت کے دوسرے سامان کی گرانی کا وہی حال ہے۔ ریزگاری ملنے میں بھی وہی دقتیں ہیں۔ اسٹینڈرڈ کلاتھ کی خبریں کبھی کبھی اخباروں میں آجاتی ہیں اور پھر خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ ویسے کپڑا پہلے سے بہت کافی سستا ہو گیا ہے۔ چند بڑے شہروں میں حالات نسبتاً بہتر ہیں معمولی اور چھوٹے شہروں کی حالت قابلِ رحم ہے۔

اس مرتبہ پیامیوں نے بہت کافی حل بھیجے۔ خوشی کی بات ہے کہ بہت سے حل صحیح تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پیامیوں کو معما حل کرنے کا گر معلوم ہو گیا ہے۔ بہت سے پیامیوں کی تجویز ہے کہ آئندہ اچھا رنگ بھرنے پر بھی انعام رکھا جائے اور پیامی بھی اس بارے میں ہمیں اپنی رائے لکھیں اگر اوروں نے بھی اسے پسند کیا تو ہم بڑی خوشی سے انعام دینے کو تیار ہیں +

معمّا نمبر ۳۶

اوّل انعام ۶ ے

دوسرا انعام للعہ

(انعام میں کتابیں دی جائیں گی)

۷ ق	۶ و	۵	■	۴ و	۳ و	۲ ر	۱ ا
ا	۹	■	■			ج	۸
	■		۱۱ ا	■	ل		۱۰ ل
ل	۱۴	■		۱۳ ا		ع	۱۲
■	ت	۱۶	ج	۱۵	■	■	ر
۱۹ ن		ز	۱۸	■		۱۷ گ	■
	■		ن	۲۰	■		■
	■	ب	■	ل		ا	۲۱

دائیں سے بائیں

۱۔ یہ زبان ہندو مسلمانوں کا ایک مشترک ترکہ ہے جو قطعاً ناقابلِ تقسیم ہے۔

۵۔ جس کو ہنگھ یہ ہو دہی اچھی تحریر کی قدر کرسکتا ہو۔

۸۔ اردو میں کسی حرف کا یہ مشکل نہیں۔ (بے ترتیب)

۹۔ شاہ جہاں کے زمانے میں اردو.. لفظ زبان کے لئے استعمال ہوا۔

۱۰۔ محمد تغلق کے زمانے سے اردو مستقل زبان بن کر... چال اور لین دین کا ذریعہ بن گئی تھی۔

۱۱۔ ... کی عمر ۸۰ برس سے زیادہ نہیں ہے

۱۲۔ ہم ڈنکے کی چوٹ پر یہ .... کہہ سکتے ہیں کہ اردو ہی ہندوستان کی قومی زبان بن سکتی ہے۔

۱۴۔ ہمارا ادبی سرمایہ ہماری .. اولاد کی امانت ہے۔

۱۵۔ اردو کی .... بھی مخالفت کی جائے یہ ترقی ہی کرے گی (بے ترتیب)

۱۷۔ مغلوں کے زمانے سے ہندوستان میں اردو.. لفظ لشکر و لشکرگاہ کے معنوں میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ (بے ترتیب)

۱۸۔ اردو درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی .... میں اُگا، مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا۔ (بے ترتیب)

۲۰۔ مولوی عبدالحق صاحب اردو کے لئے بہت کوشش کر رہے ہیں مگر اکیلا ... بھاڑ کیا پھوڑے۔

۲۱۔ جب لفظ ہماری زبان میں یہ ہو گیا تو ہمارا ہو گیا۔

اوپر سے نیچے

۱۔ پہلا اردو یہ مولوی اکرام علی نے کلکتہ سے ۱۸۱۰ء میں نکالا تھا

۲۔ ہم سب کا فرض ہو کہ اردو کی اشاعت کی طرف اپنے آپ کو یہ کریں (بے ترتیب)

۳۔ اردو کی مخالفت میں اب تک کوئی ایسا بیان شائع نہیں ہوا

۴۔ اردو ا .. ہندی دونوں زبانیں برج بھاشا کی دو صورتیں ہیں۔

۶۔ فارسی وغیرہ.. اردو کی اصل سمجھنا غلطی ہے (الٹا)

۷۔ اگر انسان حقیقتاً یہ ہو جائے تو اس کو اپنی غلطیاں خود معلوم ہو جائیں گی۔

۱۱۔ ..... ترقی اردو اردو کی بڑی خدمت کر رہی ہے۔

۱۳۔ ہر لفظ جو اردو میں مشہور ہو گیا، اردو ہو گیا خواہ وہ عربی ہو.. ایرانی۔ (الٹا)

۱۴۔ کہو داغ یاروں سے سن لیں یہ نکتہ
کہ ... ہے اردو زبان آتے آتے — داغؔ

۱۶۔ یہی وہ ... ہے جو ہندو مسلمانوں میں یکساں محبوبیت حاصل کر چکی ہے (بے ترتیب)

۱۷۔ اگر بچوں بیچ ہندوستان میں کھڑے ہو کر آواز دیں کہ ملک کی زبان ... ہے تو یہی جواب سنیں گے کہ اردو۔

۱۹۔ زبان اردو کے ظہور پر خیال کریں اور اس کی تصنیفات پر نظر کریں تو پہلے نظر آئے گی۔

۲۰۔ زبان کے مسئلے نے آج کل ہندوستان میں ہل.. مچا رکھی ہے۔

قواعد

۱۔ حل کے ساتھ ایک آنے کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

۲۔ ایک سے زیادہ حل بھی بھیجے جا سکتے ہیں۔ چار حلوں کی رعایتی فیس ۳ ر ۰ حلوں کی ۶ ر ہے۔

۳۔ دونوں انعام تقسیم کر دیے جائیں گے۔ قرعہ اندازی نہ ہوگی۔

۴۔ ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

۵۔ پیام تعلیم میں چھپے ہوئے کوپن کے علاوہ ہاتھ کے بنے ہوئے کوپن بھی لے لیے جائیں گے۔

۶۔ کسی کوپن میں کوئی حرف کٹا یا مٹا ہوا ہوگا۔ یا پنسل سے بھرا ہوا ہوگا تو مقابلے میں شامل نہ کیا جائے گا۔

۷۔ ایک لفافے میں ایک نام سے حل آنے چاہئیں۔

۸۔ چھوٹی اور بڑی ے کا فرق لازمی ہے۔ (ی ۔ ے)

۹۔ تمام حل ۲۰ ستمبر تک دفتر پیام تعلیم دہلی پہنچ جائیں۔

۱۰۔ پتہ: سب ایڈیٹر پیام تعلیم۔ مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔ قرول باغ

صحیح حل معمہ نمبر ۳۵

و	خ	■	■	ن	ا	پ	ب
ہ	ا	ن	گ	■	ک	ن	ب
■	ن	■	ر	ا	یا	ہ	آ
ب	■	ش	ف	■	ر	ہ	ن
ا		پ	■	پ	■	■	■
ع	■	ہ	■	ی	■	و	ت
ی	ٹھ	د	ن	ا	گ	■	■
ل	ے	ظ	■	م	ا	ی	ق

صحیح حل فی کس چار آنے

(اگلے معمے میں ۵ کوپن بھیج سکتے ہیں)

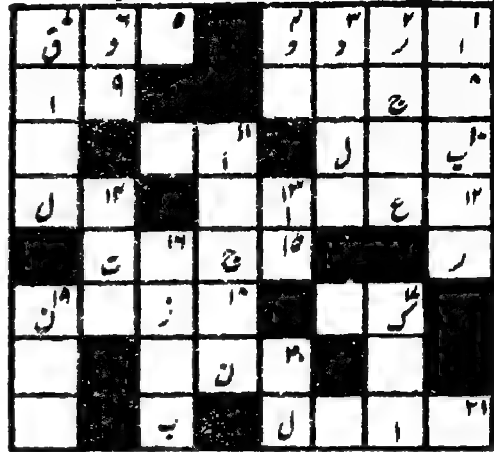
۱۔ میر حامد عزیز امرتسری۔ اچھرہ
۲۔ اقبال احمد خاں میرٹھ
۳۔ محمد سعید اختر نعمانی۔ کانپور
۴۔ اطہر سعید۔ بہار
۵۔ محمد لقاء اللہ۔ قراری باغ
۶۔ وحید الدین۔ اعظم گڑھ
۷۔ خدیجہ زبیری۔ کشمیر
۸۔ شمس راج۔ گجرات
۹۔ سید اسد مہدی۔ دہلی
۱۰۔ محمد عزیز۔ الہ آباد
۱۱۔ شاہ جہاں بیگم۔ لکھنؤ
۱۲۔ احمد عرفان، غازی، دہلی۔
۱۳۔ محمد شکیل احمد۔ الہ آباد
۱۴۔ محمد ستار الرب۔ کانپور
۱۵۔ ذوالفقار علی۔ نئی دہلی
۱۶۔ محمود حسین زبیری۔ دہلی
۱۷۔ میرزا سید عزیز امرتسری۔ اچھرہ
۱۸۔ محمد وسیم خاں۔ کانپور
۱۹۔ شاہدہ خاتون زیدی۔ کشمیر
۲۰۔ رانا صفدر جنگ خاں پشاور
۲۱۔ سلمہ بائی۔ جبل پور
۲۲۔ عبدالماجد عثمانی۔ بھوپال
۲۳۔ سید جلیل الدین۔ سندیلہ
۲۴۔ انیسہ فردوس۔ جھانسی
۲۵۔ سید منصور حسین۔ دہلی

ایک غلطی فی کس ۱ ر

(اگلے معمے میں تین کوپن بھیج سکتے ہیں۔ اپنا نمبر لکھنا ضروری ہے)

۱۔ بلقیس جہاں بیگم۔ رام پور
۲۔ غلام حسین۔ سنگھ بھوم
۳۔ قادر بخش۔ چھوڑ دسپور
۴۔ بدر عالم رتری۔ لوچن
۵۔ بی بی شیخ۔ نور پور
۶۔ مس حضور جہاں۔ کشمیر
۷۔ مس بلقیس سیدین۔ کشمیر
۸۔ بشیر احمد۔ مالیگاؤں
۹۔ اقبال رضا۔ دہلی
۱۰۔ شمس الدین۔ سلطان پور
۱۱۔ غلام علی۔ حیدرآباد دکن
۱۲۔ عنایت حسین۔ امین
۱۳۔ عرفان محمد حبیب۔ علی گڑھ
۱۴۔ قیصر محمد آفاق۔ دہلی
۱۵۔ نسیم احمد۔ دہلی
۱۶۔ خورشید مصطفیٰ زبیری۔ دہلی
۱۷۔ محمد تقی۔ دہلی
۱۸۔ منظر علی علوی۔ علی گڑھ
۱۹۔ ذوالفقار حسین۔ اورنگ آباد
۲۰۔ سید عزیز حسن۔ مارہرہ
۲۱۔ احمد منظور الحق حیدرآباد دکن
۲۲۔ محمد اسد۔ ایبٹ آباد
۲۳۔ چھنو میاں۔ عثمان آباد
۲۴۔ سید تسنیم طاہر۔ بھوپال
۲۵۔ عبد المتین۔ پونا
۲۶۔ عشرت حسین۔ فیض آباد
۲۷۔ ثریا سلطان۔ لکھنؤ
۲۸۔ ضیاء العارفین۔ دہلی
۲۹۔ محمد زاہد۔ امرتسری اچھرہ
۳۰۔ میر ساجد عزیز امرتسری۔ اچھرہ
۳۱۔ غلام جیلانی۔ دہلی
۳۲۔ سراج الدولہ۔ دہلی
۳۳۔ فضل عباس۔ اورنگ آباد
۳۴۔ محمد منیر احمد۔ لاہور
۳۵۔ رشیدہ خانم۔ بہار (۳۶) مس محمد مصطفیٰ زبیری۔ دہلی (۳۷) سعیدہ خانم شمیم (۳۸) چندر پرکاش۔ مظفر نگر (۳۹) فرحت حسین دہرہ دون (۴۰) سلطان مسیح۔ گڑھ (۴۱) اعجاز احمد۔ سیالکوٹ۔

معما نمبر ۳۶ کوپن نمبر

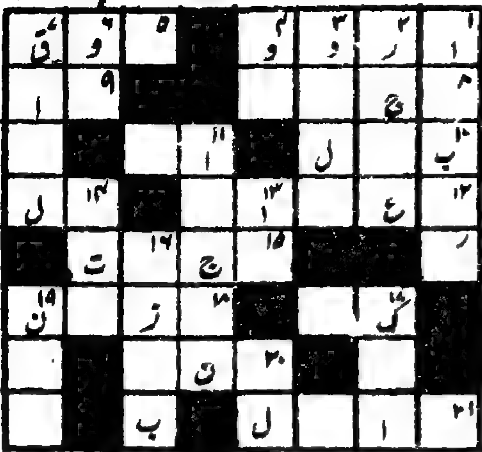


نام ....

پتہ ....

ٹکٹ

معما نمبر ۳۶ کوپن نمبر

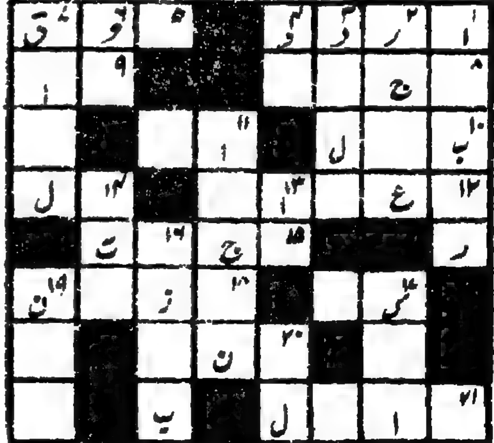


نام ....

پتہ ....

ٹکٹ

معما نمبر ۳۶ کوپن نمبر

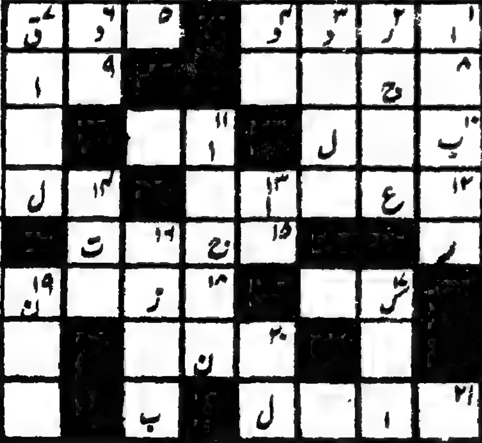


نام ....

پتہ ....

ٹکٹ

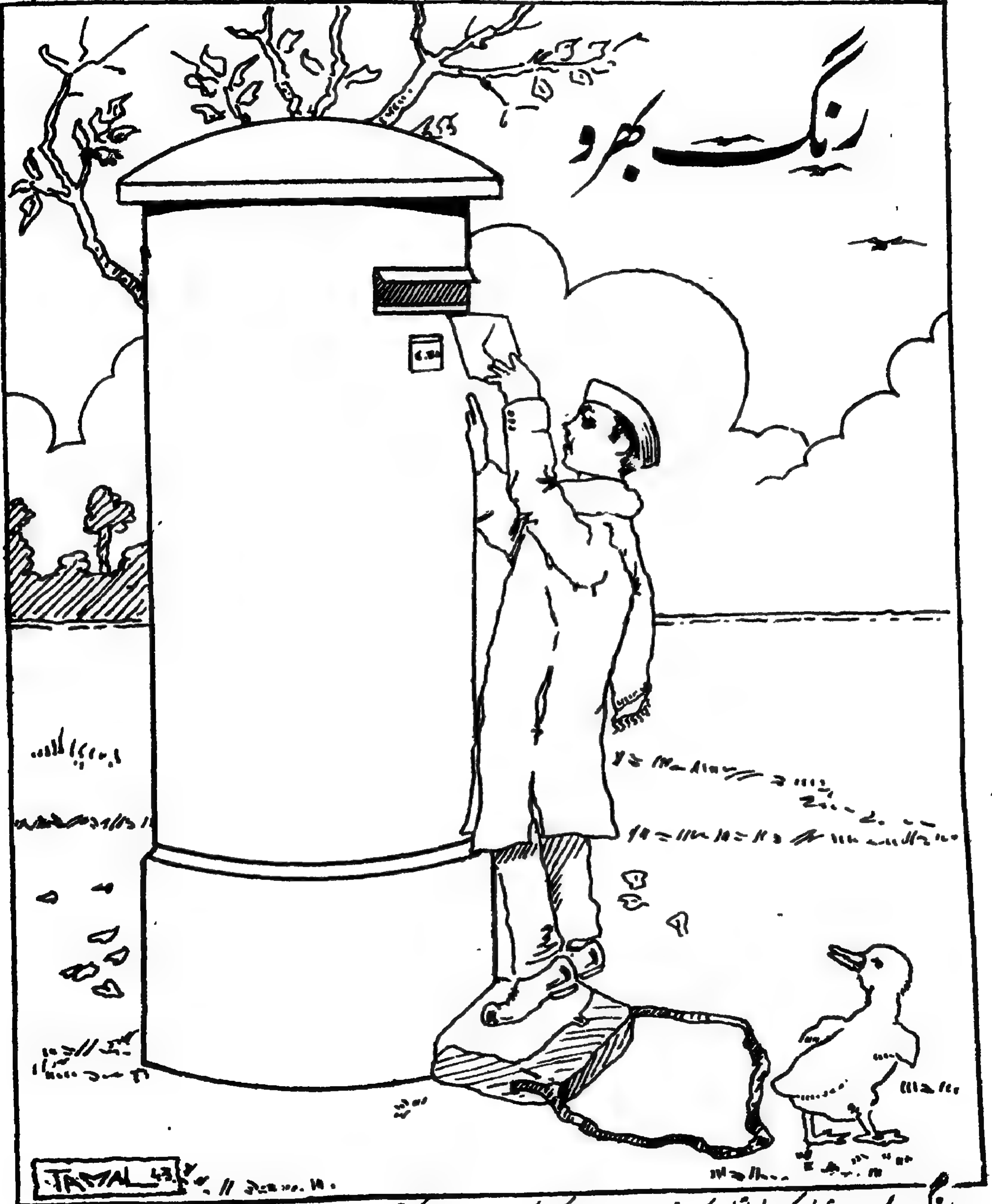
معما نمبر ۳۶ کوپن نمبر



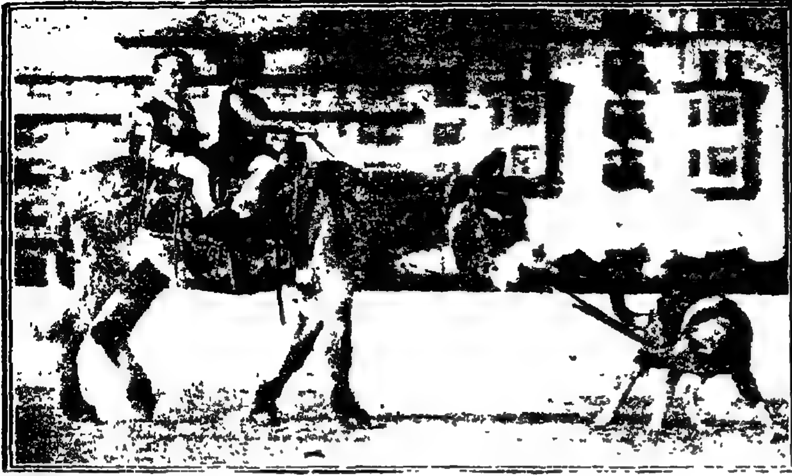
نام ....

پتہ ....

ٹکٹ



رنگ بھرو اور بھر کر پیام تعلیم کے دفتر میں ۲۰ ستمبر تک بھیج دو۔ جس بچے کی تصویر سب سے اچھی ہوگی اُسے جمال صاحب آرٹسٹ



گدھے کی سواری



ایک اچھا منظر



سنپیرا

1943

Regd. No. L. 1961







بچوں کی نئی کتابیں

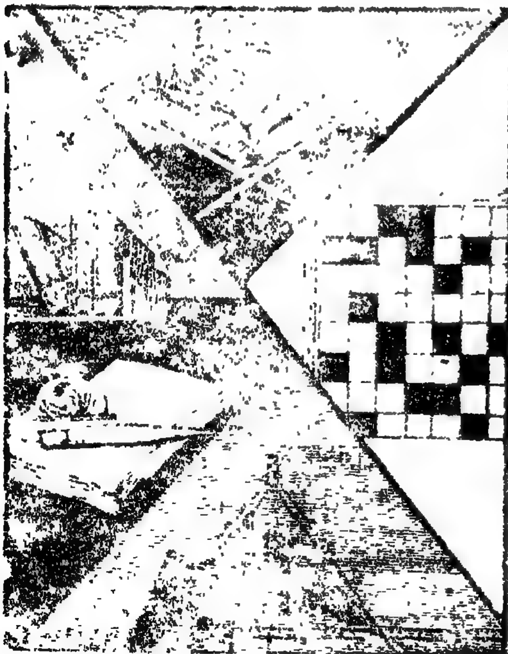
(اعلان صفحہ ۴ ۲ ۲ پر دیکھئے)

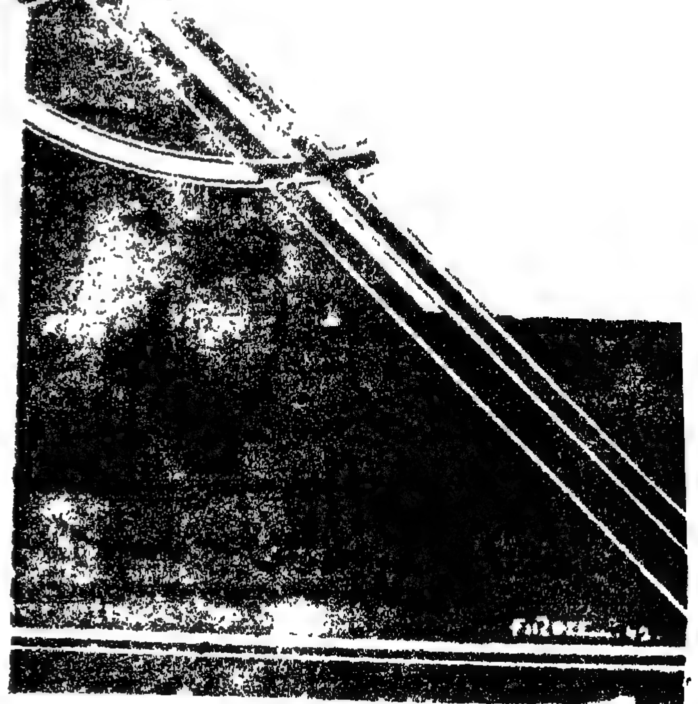
اکتوبر

۱۹۴۳

تعلیم









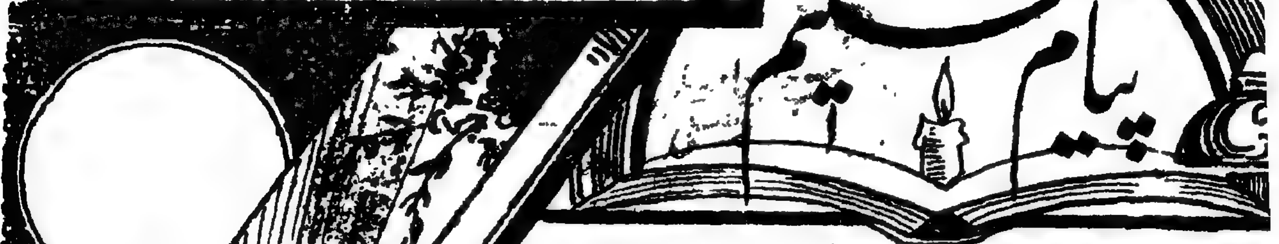
ہمت کے پھل



مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

بچوں کی یہ کتاب اس مہینہ شائع ہوئی ہے قیمت ۶ آنے

دہلی، یوپی، سی پی، برار، میسور، قلات، بنگال، رام پور، حیدرآباد سندھ، کشمیر، پنجاب، بہار اور سرحد کے محکمہائے تعلیم کی طرف سے سرکاری طور پر منظور کیا گیا ہے ۔ "منیجر"



پیام تعلیم

جلد ۲۶ | فہرست مضامین اکتوبر سنہ ۴۳ء | نمبر ۱۰

نمبر	مضمون	مصنف	صفحہ
۱	بچوں سے باتیں	ایڈیٹر	۲۹۰
۲	عید	محمد شفیع الدین نیر	۲۱۹
۳	سونے کا ہاتھی	آصفہ خاتون	۲۹۲
۴	میں کیا ہوں	محمد شفیع الدین نیر	۲۹۵
۵	خطوں کا البم	عقیل الرحمٰن متقی	۲۹۶
۶	نانی اماں	محمد حسن	۳۰۰
۷	سنہ ۴۲ء کی نئی کتابیں	م ، ش ، ن	۳۰۳
۸	جہاز	شجاع احمد قائد	۳۰۶
۹	اعتماد الدولہ	محمد تقی، تعلیمی مرکز جامعہ	۳۰۹
۱۰	بچوں کی نظمیں	...	۳۱۱
۱۱	اٹلی	ایڈیٹر	۳۱۳
۱۲	مزے مزے کے کھیل	مشتاق احمد اعظمی	۳۱۶
۱۳	پیام برادری	ایڈیٹر	۳۱۹

ایڈیٹر ۔ محمد حسین حسان

قیمت سالانہ عہ

فی پرچہ ۳

پرنٹر پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ، ڈی محبوب المطابع پریس دہلی

بچوں سے باتیں

یہ رمضان المبارک کا مہینہ ہے۔ عید کے تھوڑے دن باقی رہ گئے ہیں۔ پہلی شوال کو عید ہوگی۔ ہمارے پیامی اس دن خوب خوشیاں منائیں گے، دودھ سویّاں کھائیں گے۔ اور یار دوستوں سے مل کر جی بھر کے کھیلیں، کودیں گے۔ پیام تعلیم کی طرف سے سب پیامیوں کو عید کی یہ خوشی مبارک ہو"

ہم نے اس موقع کے لئے جناب شفیع الدین صاحب نیّر سے عید پر اچھی سی نظم لکھوائی ہے۔ اُمید ہے کہ پیامیوں کو یہ نظم پسند آئے گی۔

جناب نیّر صاحب قبلہ کی تین کتابیں، نئی کہانیاں گھی شکّر اور پھولوں کا کھلونا مکتبے نے پریس بھیج دی ہیں۔ غالباً اس مہینے کے آخر تک چھپ کر آجائیں گی۔ پیامیوں سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ کتابیں کیسی ہوں گی۔ مکتبے نے اس مہنگائی کے زمانے میں اِن کے چھپوانے میں بہت اہتمام کیا ہے۔

ہمارا ارادہ ہے کہ آیندہ پرچے سے پیام تعلیم میں سوال وجواب کا سلسلہ قائم کیا جائے جن بچوں کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی ہو یا کسی چیز کے بارے میں وہ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں بے تکلف لکھیں۔ اس وقت جگہ کی کمی کے سبب صرف ایک صفحہ مخصوص کیا جائے گا۔ یہ سوال ہر مہینے زیادہ سے زیادہ دس تاریخ تک ہمارے پاس پہنچ جاہیں۔

پیام تعلیم کے سالنامے کی تیاری کا زمانہ آگیا ہے۔ پیامی ہمیں اپنی خواہش اور رائے بتائیں کہ اب کی وہ کس قسم کے مضمون چاہتے ہیں ہم ۳۰ اکتوبر تک ان کی رایوں کا انتظار کریں گے

عید مُبارک

مولوی محمد شفیع الدین نیّر

پھر ہلالِ عید سے دُنیا پہ رونق چھا گئی
لیجیے عید آ گئی عید آ گئی

پھر زمانے میں محبت کی ہوا چلنے لگی
پھر مسرّت کی کلی ہر قلب میں کھلنے لگی

دیکھیے تو کس قدر مسرور ہے چھوٹا بڑا
سب کو ہے ایسی خوشی گویا خزانہ مل گیا

گھر کی رونق اور آبادی دوبالا ہو گئی
پست بھی جو چیز تھی وہ آج بالا ہو گئی

اور بچے! اُن کی خوشیوں کا بیاں ہو کس طرح
اُن کے دِل کی کیفیت پوری عیاں ہو کس طرح

سب کے چہرے پر خوشی ہے اور ہر اک خوش حال ہے
دِل کی دُنیا عید کی خوشیوں سے مالا مال ہے

جی میں ہے اُٹھ کر سویرے شیر خُرما کھائیں گے
پھر نئے کپڑے بدل کر عید گہ کو جائیں گے

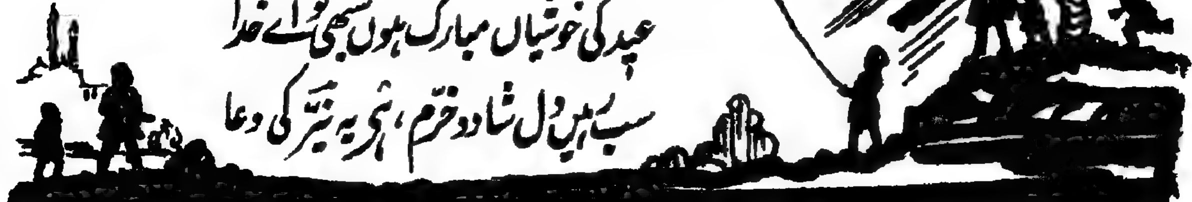
لُطف آئے گا جو ہوں گے اپنے پیارے ساتھ سب
پیار سے پکڑے ہوئے اِک دُوسرے کا ہاتھ سب

عید گہ میں آئے گی ہم کو نظر دُنیا نئی
سب مسلمانوں کو خوش خوش دیکھ کر ہوگی خوشی

پڑھ کے دوگانہ نمازِ عید واپس آئیں گے
بھائی بہنوں کے لئے اپنے کھلونے لائیں گے

دوستوں سے عید مِل کر اپنا جی بہلائیں گے
خوب ہی ڈٹ کر مِٹھائی اور میوے کھائیں گے

عید کی خوشیاں مبارک ہوں سبھی کو اے خُدا
سب رہیں دِل شاد و خرّم، ہے یہ نیّر کی دعا





سونے کا ہاتھی

آصفہ خاتون بریلی

ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمھارا خدا بادشاہ۔
اس بادشاہ کے ایک لڑکی تھی۔ اس لڑکی کی ماں مرگئی تھی۔ لڑکی کا نام رضیہ بیگم تھا۔ رضیہ بیگم جوان ہوئی تو بادشاہ کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ مگر اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ پہلے اپنی شادی کرلوں پھر رضیہ کا بیاہ کروں۔ بادشاہ نے ایک جوڑی سونے کے کپڑے بنوائے۔ یہ کپڑے بہت خوب صورت تھے۔ یہ کپڑے اُس نے ایک میز پر رکھ دیے۔ اور ہر جگہ ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ یہ کپڑے جس عورت کے ٹھیک آجائیں گے، بادشاہ سلامت اُسی سے شادی کریں گے۔

اتفاق کی بات اُسی دن رضیہ بھی نہائی دھوئی کپڑے بدلے اور باپ کو سلام کرنے پہنچی۔ بادشاہ سلامت تو اس وقت موجود نہیں تھے۔ ہاں میز پر کپڑے رکھے تھے۔ یہ کپڑے اُس نے پہن لیے

دوپہر کو رضیہ جب باپ کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھی تو بادشاہ سلامت سے پوچھا "ابا جان یہ کپڑے کس کے تھے جو میں نے پہن لیے۔" بادشاہ سلامت نے پوچھا "تمھارے ہاتھوں میں ٹھیک بھی ہیں؟"

رضیہ نے جواب دیا۔ "ہاں، ہاں ابا جان یہ دیکھیے۔" بادشاہ سلامت بولے "اچھا تو پھر ہم تمھارے ساتھ شادی کریں گے۔" اگلے وقتوں کے بادشاہ سلامت بہت بھولے اور کچھ کچھ بے وقوف ہوتے تھے۔ مگر رضیہ کو بڑی پریشانی ہوئی وہ دن بھر سوچتی رہی کہ اس مصیبت سے کیسے نجات ملے۔

دوسرے دن صبح کو اُس نے بادشاہ سلامت سے کہا "ابا جان ایک بات ہے وہ آپ پوری کر دیجیے تب شادی کروں گی۔ آپ میرے لئے سونے کا بڑا سا ہاتھی بنوا دیجیے۔" "بہت خوب صورت۔" بادشاہ سلامت نے کہا "بیٹی یہ کون بڑی بات ہے۔"

بادشاہ سلامت نے اُسی وقت لاکھوں روپے کا سونا منگوایا اور ہاتھی بننے کا حکم دے دیا۔ رضیہ نے یہ ہاتھی اپنے سامنے بنوایا اور اُس کا پیٹ کھوکھلا رکھوایا۔ ہاتھی تیار ہوگیا تو شادی

کی تاریخ مقرر ہوئی۔ رخصتی کا وقت آیا تو شہزادی غائب! تمام میں ڈھونڈا کہیں پتہ نہ چلا۔ بادشاہ بہت پریشان ہوا کہ میری لڑکی کہاں گئی۔ اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ سونے کا ہاتھی منحوس ہے اُسے بیچ ڈالا جائے۔ بھلا بازار میں اُسے کون خرید سکتا تھا۔ آخر ایک بادشاہ نے خریدا۔ وہ اُسے اپنے شہر لے گیا۔ اور محل میں اپنے کمرے کے سامنے رکھوا دیا۔ رات کو اُس کے لئے کھانا آیا اور وہ کھاکر سوگیا۔ برتن یوُں ہی رکھے رہے۔ اِدھر رضیہ کئی دن کی بھوکی پیاسی تھی۔ چُپکے سے ہاتھی کے پیٹ میں سے نِکلی اور بادشاہ کے سامنے کا بچا ہوا کھانا کھالیا۔ دوُسرے دن بادشاہ کوئی کتاب پڑھتے پڑھتے سوگیا تھا، ملازم آیا اور کھانا رکھ کر چلا گیا۔ رضیہ نے یہ موقع غنیمت جانا اور ہاتھی میں سے نِکل کھانا کھایا اور جلدی سے اپنی جگہ جاکر بیٹھ گئی۔ بادشاہ کی آنکھ کھلی تو کھانا کھانے بیٹھا۔ اُسے یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ اُس کے کھانے میں سے تھوڑا سا کسی نے کھالیا ہے۔ اگر بلّی کھاتی تو برتن اس طرح سلیقے سے ڈھک کر نہ رکھتی!

دوُسرے دِن نوکر کھانا لایا تو بادشاہ سوتے بن گئے۔ رضیہ نے دیکھا کہ رات کے بارہ بج گئے ہیں۔ بادشاہ نے کھانا نہیں کھایا ہے اور بے خبر سو رہا ہے۔ وہ کل رات کی طرح ہاتھی میں سے نِکلی اور اطمینان سے کھا پی کر برتن ڈھک کر رکھ دیئے۔ خاص دان میں سے پان لینے بڑھی تھی کہ بادشاہ نے ہاتھ پکڑ لیا اور پوُچھا "تم کوُن ہو، اور کہاں سے آئی ہو؟" اب تو رضیہ بہت پریشان ہوئی، اوُپر کا سانس اوُپر، نیچے کا نیچے۔ بادشاہ نے بہت دم دلاسا دیا بہت اطمینان دلایا تو شہزادی نے اپنا سارا حال سُنایا۔

بس اب تو یہ روزانہ کا معموُل ہوگیا کہ رضیہ روزانہ دن بھر ہاتھی کے پیٹ میں بیٹھی رہتی اور رات کو بادشاہ کے ساتھ کھانا کھاتی اور شطرنج کھیلتی۔ ہوتے ہوتے یہ خبر نوکروں کے ذریعے ملکہ تک پہنچی کہ بادشاہ روزانہ رات کو ایک شہزادی کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہیں۔ ملکہ نے نوکروں کو حکم دیا کہ ہاتھی میں آگ لگا دیں۔ ہاتھی جب خوب جلنے لگا تو رضیہ اُس میں سے نکلی۔ وہ بھی کافی جل گئی تھی۔ نوکر جاکر اُسے کہیں دوُر جنگل میں پھینک آئے۔

شام کو بادشاہ محل میں آیا تو ہاتھی جلا پڑا تھا اور رضیہ غائب تھی۔ چاروں طرف بہت پوُچھ گچھ کی مگر کسی نے کچھ نہ بتایا۔ بادشاہ غصّے میں بھرا ہوا محل سے باہر نکل آیا اور نوکروں کو اُسی وقت رضیہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑایا

کوئی چھ مہینے اسی طرح گذر گئے۔ رضیہ کا کہیں پتہ نشان نہ ملا۔ بادشاہ اس غم سے بہت بیمار ہو گیا۔

اِدھر رضیہ کا حال سُنو۔ بے چاری جنگل میں بے ہوش پڑی تھی کہ ایک جوگی کا اِدھر سے گذر ہوا وہ رضیہ کو اُٹھا کر اپنی جھونپڑی میں لے گیا۔ جوگی کی مہربانی اور توجہ سے رضیہ تھوڑے ہی دِنوں میں اچھی ہو گئی۔ رضیہ نے بوڑھے جوگی کو اتنا ہمدرد پایا تو اُسے اپنی بپتا سُنائی اور کہا بابا" جیسے بھی بنے مجھے اس بادشاہ کی خیریت لا دو" جوگی بولا" اچھا بیٹی یہ کون بڑی بات ہے" جوگی بادشاہ کے شہر کی طرف چل کھڑا ہوا۔ بادشاہی محل کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ بادشاہ بہت بیمار ہے۔ جوگی اجازت لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا" بادشاہ سلامت میں غیب کی باتیں بتا سکتا ہوں" بادشاہ نے کہا" اچھا میرے بارے میں کچھ بتاؤ" جوگی نے بادشاہ کا ہاتھ دیکھا اور بولا" بادشاہ سلامت ایک شہزادی کی وجہ سے پریشان ہیں۔ وہ شہزادی زندہ سلامت ہیں اور بادشاہ سلامت کی اُس سے جلد ملاقات ہو گی" بادشاہ نے جوگی کی زبان سے یہ باتیں سُنیں تو بہت تعجب ہوا اور جوگی کو بہت سا انعام دینے کا حکم دیا۔ مگر جوگی نے بس ایک رومال اور انگوٹھی لی اور اپنے گھر چلا آیا۔ جھونپڑی میں آکر رضیہ کو یہ سب قصہ سُنایا۔ خُدا کا کرنا پندرہ دن میں بادشاہ اچھا ہو گیا۔ ایک دن جوگی نے بادشاہ سے کہا" بادشاہ سلامت ابھی آپ کمزور ہیں۔ سلطنت کے کاموں میں کم دخل دیجئے تھوڑے دنوں تک شطرنج سے دل بہلائیے میں اپنے لڑکے کو بھیج دوں گا۔ وہ شطرنج بہت اچھا کھیلتا ہے" دوسرے دن جوگی نے رضیہ کو لڑکے کے بھیس میں بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ بادشاہ لڑکے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس کی شکل رضیہ سے ملتی جلتی تھی۔ شطرنج بھی اسی طرح کھیلتا تھا۔ بادشاہ کو یقین سا ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ شاہزادی ہے لڑکے کا بھیس بدل کر آئی ہے۔ شاہزادی نے بھی اب زیادہ چھپنا مناسب نہ سمجھا۔ دونوں مل کر بہت خوش ہوئے۔ آخر تھوڑے دنوں میں اُن کی شادی ہو گئی۔ بارات جوگی کے گھر گئی تھی۔ بادشاہ نے جوگی کو بہت کچھ اِنعام و اِکرام دینا چاہا۔ جوگی نے قبول نہ کیا اور بولا" اللہ کے نیک بندوں کی خدمت کر کے مجھے جو خوشی ہوتی ہے وہی میرے لئے سب سے بڑا انعام ہے"

میں کیا ہوں

محمد شفیع الدین صاحب نیرؔ

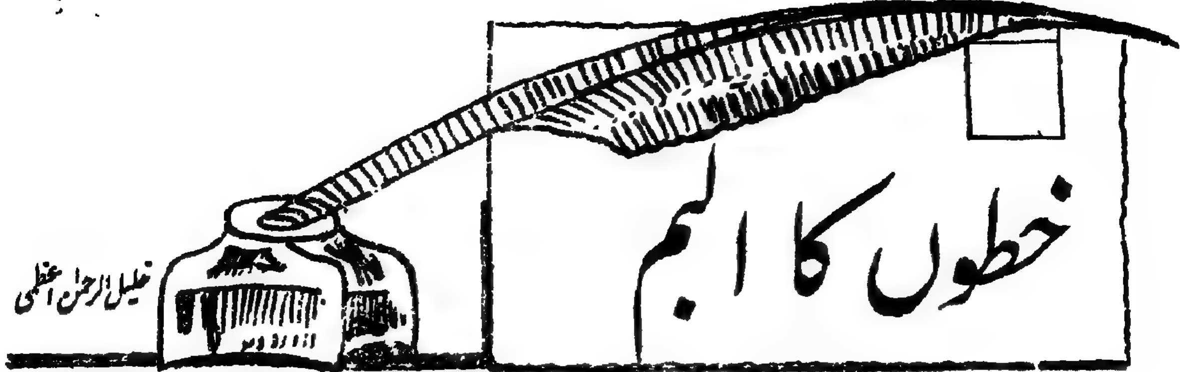
میں نے اس قسم کی نظم کے لئے ایک نیا نام "بتاؤنی" وضع کیا ہے۔ یہ بتاؤنی بچوں کے لئے ہے۔ اس میں کسی چیز کے بارے میں خاص خاص باتیں بتا کر اس چیز کا نام پوچھا جاتا ہے۔ یہ "بتاؤنی" ایک قسم کی پہیلی ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہیلی بڑوں چھوٹوں سب کے لئے ہوتی ہے اور اس کا بتانا بتانے پر بھی مشکل سے سمجھ میں آتی ہے مگر بتاؤنی کا مقصد یہ ہے کہ بچے کا ذہن تیزی کے ساتھ اس چیز کو پہچان لے جس کو بتاؤنی میں پوچھا گیا ہے۔

محمد شفیع الدین نیرؔ

میں کیا ہوں یہ بتلاؤ تم
پھر گھی اور شکر کھاؤ تم

باغوں میں میرا ڈیرا ہے
اک تاج مرے سر پر ہے دھرا
ہیں لمبے لمبے پر میرے
نقش ان کے جھمکتے رہتے ہیں
جب بادل گھر کر آتے ہیں
اس وقت مری جھنکار سنو
میں جوش میں جس دم آتا ہوں
پھرتا چاہوں میں جی بھر کے
تعریف مری سب کرتے ہیں
ہیں لیکن پاؤں مرے بھدے
میں کیا ہوں یہ بتلاؤ تم

جنگل میں میرا بسیرا ہے
اودا اودا نیلا نیلا
جو سارے بدن کو ہیں گھیرے
تارے سے چمکتے رہتے ہیں
جب بادل بارش لاتے ہیں
اک بار کہیں سو بار سنو
پر اپنے سب پھیلاتا ہوں
ٹھمک ٹھمک ٹھمک کر کے
سب میرے حسن پہ مرتے ہیں
بس ہیں یہی مجھ کو دکھ دیتے
پھر گھی اور شکر کھاؤ تم



خطوں کا البم

خلیل الرحمٰن اعظمی

پڑھے لکھے لوگ اپنی فرصت کی گھڑیوں میں ایسے کام کرتے ہیں جن سے اُن کی طبیعت بھی بہلے اور انھیں تعلیمی و اخلاقی فائدے بھی حاصل ہوں۔ ترقی یافتہ ملکوں کے لڑکوں میں اس قسم کی چیزوں کا بہت رواج ہے اس کام کو انگریزی میں ہابیز (HOBBIES) اور اردو میں مشغلے کہتے ہیں۔ ہمارے مُلک کے طالب علموں میں بھی رفتہ رفتہ اب مشغلوں کا شوق پیدا ہو چلا ہے اور خاص کر رسالہ پیام تعلیم کی وجہ سے تو ہر اسکول میں اس کی چہل پہل ہے۔ آج کل ہر لڑکے کو دیکھئے، کوئی نہ کوئی چیز جمع کرنے کی فکر میں ہے۔ کوئی ٹکٹوں کی تلاش میں ہے تو کوئی تصویروں کے اکٹھا کرنے میں دیوانہ بنا ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ طالب علم بجائے اس کے کہ چھٹی کے وقتوں میں بُرے دوستوں کی صحبت میں رہیں یا یونہی آوارہ پھریں اُن کو کوئی نہ کوئی مشغلہ ضرور اختیار کرنا چاہیے۔ اس سے سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ وقت دلچسپی کے ساتھ کٹ جاتا ہے۔ دوسری

بات یہ ہے کہ جب لڑکوں کو کوئی کام نہیں رہتا تو اُن کے دل میں بُرے بُرے خیالات آتے رہتے ہیں۔ اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایسے لڑکوں کو تاش کھیلتے کھیلتے جُوا کھیلنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ پھر وہ اپنی پڑھائی کے وقتوں میں بھی اسی فکر میں رہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اپنی کتابیں اور کاپیاں بیچ کر اپنی خواہش پوری کرتے ہیں۔ اور جب یہ چیزیں ختم ہو جاتی ہیں تو چوری کرتے ہیں اور طرح طرح کی بُری عادتوں میں مُبتلا ہو جاتے ہیں۔ ایسے لڑکوں کا انجام بہت بُرا ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے وہ طالب علم جو ایک نہ ایک مشغلہ رکھتا ہے۔ وہ فرصت کے وقت میں اسی کی دُھن میں لگا رہتا ہے۔ وہ دوستی بھی رکھتا ہے تو صرف ان لڑکوں سے جنھیں مشغلوں سے دلچسپی ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کے یہاں جا کر اس کی جمع کی ہوئی چیزوں کو دیکھے اور نئی باتیں معلوم کرے۔ رفتہ رفتہ اس کی طبیعت میں ایک اُمنگ پیدا ہوتی ہے اور اس کو اچھے

کاموں سے دلچسپی اور کاہلی سے نفرت ہو جاتی ہے
ایسے طالب علم پڑھنے میں بھی دل لگاتے ہیں اور انھیں
کھیلوں سے بھی دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ اپنے وقت
کو قیمتی جانتے ہیں اور آوارہ گھومنے یا دوستوں کی
صحبت میں رہنے کو بُرا خیال کرتے ہیں۔ مشغلہ رکھنے
والے لڑکوں میں سلیقہ، صفائی، چُستی، بات چیت
کا ڈھنگ، اخلاق اور ہنرمندی پیدا ہوتی ہے۔
اور وہ ان ہتھیاروں سے تمام لوگوں کے دلوں
پر قبضہ کئے رہتے ہیں۔ انھیں اس بات کا خیال رہتا
ہے کہ اپنے البم کے بنانے میں کس ترکیب سے کام
لیں۔ چیزوں کو کس ترکیب اور صفائی سے رکھیں۔
کہ دیکھنے والے تعریف کریں۔ دوستوں کے پاس جاتے
ہیں تو اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ اُن سے نئی باتیں
معلوم کریں اور اپنے تجربے انھیں بتائیں۔ رفتہ
رفتہ وہ یہ عادتیں اپنے روزمرہ کے کاموں میں استعمال
کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً کپڑوں کو کس طرح صاف رکھیں
اور اُن کو بکس میں کس طرح رکھیں۔ کتابوں کو الماری
میں کس ترتیب سے رکھیں۔ اپنی کاپیوں کو کس
طرح صاف ستھرا بنائیں۔ اپنے اُستادوں اور
عزیزوں سے کس طرح بات چیت کریں جس سے
وہ خوش رہیں۔ غرض ایک طالب علم کے اندر جتنے
جوہر ہوسکتے ہیں وہ صرف ایک عادت کی بدولت
پیدا ہو جاتے ہیں۔

تم شاید مضمون کا عنوان پڑھ کر ہنسو کہ اب
تک تو ٹکٹوں اور تصویروں کے البم سنتے آئے
تھے لیکن خطوں کے البم کب سے بننے لگے۔ اگر غور کرو
تو یہ بھی بہت مفید اور دلچسپ مشغلہ ہے۔ جو لڑکے
تاریخ، جغرافیہ اور سائنس وغیرہ سے دلچسپی
رکھتے ہیں۔ تو وہ ٹکٹ، تصویریں، کیڑے، پتیاں
وغیرہ جمع کرتے ہیں۔ لیکن جو لڑکے زبان وادب
سے دلچسپی رکھتے ہیں یا جن کو مضمون نگاری اور
شاعری سے شوق ہوتا ہے وہ ان چیزوں کو بے کار
سمجھتے ہیں۔ ایسے طالب علموں کے لئے میرے خیال
میں خطوں کا جمع کرنا سب سے اچھا مشغلہ ہے۔
نہ صرف یہ لڑکے بلکہ وہ لڑکے جنھیں دوسری چیزوں
سے دلچسپی ہے اُن کے لئے بھی یہ کم دلچسپی کی چیز
نہیں ہے۔ کیونکہ خط تو ہر قسم اور ہر ڈھنگ کے
لکھے جاتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی ایسا لکھا پڑھا نہ
ہوگا جو اپنے دوستوں، بھائیوں اور بزرگوں
کو خط نہ لکھا کرتا ہو اور اس کے پاس ایک اچھی
خاصی تعداد میں خطوط نہ آتے ہوں۔ ہم ان خطوں
کو پڑھنے کے بعد تھوڑی دیر لذت اُٹھا کر ضائع
کر دیتے ہیں یا ایسی جگہ رکھ دیتے ہیں کہ وہ جلدی
نہیں مل سکتے۔ لیکن اگر ان خطوں کو حفاظت کے
ساتھ ایک البم میں رکھتے جائیں تو سب سے بڑا
فائدہ یہ ہوگا۔ کہ وہ ہمارے دوستوں اور عزیزوں

کی ایک یادگار رہے گی ۔ دوسرے جب کبھی ہمارے پاس کوئی اچھی کتاب پڑھنے کے لئے نہ رہے گی تو ان خطوں کو نکال کر ہم اپنا جی بہلا سکتے ہیں کیونکہ ان خطوں میں دوستوں اور بزرگوں کے مشورے اور نصیحتیں رہتی ہیں جن پر ہم فرصت کے وقت غور اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ کبھی ان خطوں میں اس زمانے کے حالات پر روشنی پڑتی ہے جس وقت یہ لکھے گئے۔ تم کو بڑے ہونے پر معلوم ہوگا کہ بہت سی تاریخیں اور سوانح عمریاں صرف خطوں کے ذریعے تیار ہوتی ہیں۔ بعض خطوں میں بے تکلف دوستوں کی ہنسانے والی تحریریں ہوتی ہیں جنھیں پڑھ کر دماغ کو فرحت حاصل ہوتی ہے اور اس ہنس مکھ دوست کی تصویر آنکھوں میں ناچنے لگتی ہے۔ کسی خط میں اپنے کسی عزیز یا دوست کے مرنے کی خبر رہتی ہے اور دوبارہ پڑھ کر ہم ان کی یاد کو تازہ کر لیتے ہیں۔ غرض ان خطوں میں ہمیں کافی دلچسپی کے سامان مل سکتے ہیں۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کے جمع کئے ہوئے خطوں کا مطالعہ کر کے نئی نئی باتیں بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے دوستوں سے تعلیم کے بارے میں خط و کتابت کرتے ہیں۔ بعض لوگ تاریخ، ادب اور شاعری پر اپنی اپنی رائیں لکھتے اور بحث کرتے ہیں۔ اسی طرح اپنے بزرگوں کے خطوط میں ان کی ڈانٹ اور نصیحتیں پڑھ کر ہم اپنی اصلاح کر سکتے ہیں یا غور کر سکتے ہیں کہ ہم نے ان پر کہاں تک عمل کیا ہے اور کس بات کی کمی رہ گئی ہے۔ سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ خط کتابت کرنے سے ہماری تحریر کی مشق ہوتی ہے ہم دوسروں کی تحریر سے اپنا مقابلہ کرتے ہیں اور اپنی روزمرہ کی چیزوں پر اپنے خیالات کو خطوط میں ظاہر کرتے ہیں۔ اس طرح ہمیں ہر طرح کی باتیں لکھنے کا ڈھنگ اور بحث کرنے کا طریقہ معلوم ہو جاتا ہے اور ہم اپنے دل کی باتوں کے ظاہر کرنے کے لائق ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں بہت سے طالب علم اپنے جیب خرچ کا زیادہ حصہ بیڑی، سگریٹ، یا مٹھائی کھانے میں ضائع کر دیتے ہیں۔ اگر وہ یہ رقم خط و کتابت میں خرچ کریں اور اچھے لوگوں سے تحریری بات چیت کیا کریں تو بہت فائدہ مند ہے۔

مجھے بھی تصویروں اور ٹکٹوں کے جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔ لیکن جتنی دلچسپی میں نے خطوں کے جمع کرنے میں پائی اتنی کسی مشغلے میں نہیں۔ میری شروع سے عادت ہے کہ جتنے چھوٹے بڑے خط آتے ہیں سب کو ترتیب سے ایک البم میں جمع کرتا جاتا ہوں اور چھٹیوں کے دنوں میں یہ میرے لئے دلچسپی کا سامان ہوتے ہیں۔ البم بنانے کا طریقہ تو سب لوگ جانتے ہیں۔ ایک کاپی کے برابر جلد بناؤ اور اس میں دس بارہ یا اس سے زیادہ موٹے

کاغذ لگا دو۔ اس کے پہلے صفحے پر لکھ دو "خطوط" دوسرے صفحے پر جن لوگوں سے خط و کتابت ہے ان کے نام نمبروار لکھ دو۔ مثلاً اس طرح۔

(۱) مرزا اسلم بیگ
(۲) عبدالدیان خاں
(۳) اختر انیس
(۴) عبدالرحمٰن ناصر وغیرہ

پھر اس کے بعد تیسرے صفحے پر ان لوگوں کے پورے پتے ترتیب سے لکھ دو۔ اب ہر آدمی کے تمام خط تاریخ وار جس ترتیب سے آئے ہیں ایک البم میں لگا دو اب ایک صفحے کے بیچ میں رکھ دو۔ یہ تمھارا البم تیار ہو گیا۔

(باقی آئندہ)



نانی امّاں

از احمد حسن آگرہ

ایک چھوٹا سا چھپر کھٹ تھا یا بڑا سا پلنگ:
اس پر نانی اماں سوتی تھیں ، اور جاڑوں کے دنوں
میں جب تک مکان میں دھوپ اچھی طرح نہ آجائے
بیٹھی انگیٹھی سے ہاتھ تاپتی تھیں۔ ان کی انگیٹھی بھی
عجیب طرح کی تھی مٹی کا ایک چھوٹا سا کونڈا ایک
صاف بڑی سی رکابی میں رکھا ہوا۔ وہ اس انگیٹھی
کو لحاف پر یا پلنگ کے کنارے رکھ لیتی تھیں پلنگ
کے ایک طرف پاندان رہتا اور اسی طرف زمین پر
اُگالدان۔ اور سرہانے تکیہ ، اُن کا تکیہ عجیب قسم کا تھا
اس کے بیچوں بیچ ایک بڑی سی جیب تھی اور اس میں
بہت سی چیزیں رہتی تھیں ، سُرمہ ، کاجل ، منجن
نانی اماں کا کارچوبی کا بٹوا اور اس میں روپیے
پیسے ، چورن ، تیلے دانی وغیرہ۔ آپ یقین نہ کیجیے
گا مگر اُس میں یہ تمام چیزیں رہتی تھیں۔ اسی لئے
لکھا ہے۔ سُرمہ اور کاجل بچوں کے لئے باقی چیزیں
خود اُن کی ضرورت کی تھیں۔ مگر ہمیں جس چیز سے دلچسپی
تھی وہ چورن تھا ، کھٹ مٹھا۔ دوڑے دوڑے
نانی اماں کے پاس گئے چورن مانگا "نانی امان!
نانی امان! پیٹ میں درد ہو رہا ہے ، چورن دیجیے"
نانی اماں جانتی تھیں کہ چورن صرف مزے کے لئے
مانگا جا رہا ہے۔ وہ کہتی تھیں "دور ہو۔ چورن تم
لوگ یوں ہی ختم کر دو گے۔ پھر ضرورت کے وقت
ملے گا نہیں۔" مگر جب ہمارا جی نہ مانتا تو ہم پیٹ پکڑے
اُمّی جان کے پاس جاتے روتی صورت بنائے اور امّی
یقین کر لیتیں کہ واقعی پیٹ میں درد ہو رہا ہے اور
وہ ہماری سفارش کرتیں "خالہ جی ، چھوٹے میاں
کے پیٹ میں درد ہے ایک خوراک چورن دے
دیجیے۔" نانی اماں پوچھتی تھیں۔ کہیں جھوٹ موٹ
تو نہیں ، بڑا شیطان لڑکا ہے۔" امّی کہتیں نہیں
اس بے چارے کے پیٹ میں واقعی سخت درد
ہے۔ پہلے تو میں بھی یہی سمجھی تھی مگر وہ تو بے چارا
رو رہا ہے۔" نانی اماں پاس بلاتیں اور چورن دیتیں
اور کہتیں "اللہ شافی اللہ کافی" اور ہم لوگ مزے
سے چورن چاٹتے اور آدھ گھنٹے میں بھلے چنگے

کھیلنے لگ جاتے۔

چوُرن سچ مچ بڑا ہی مزے دار تھا اور فائدہ مند بھی۔ جب کبھی پیٹ میں درد ہوتا نانی اماں نے ایک خوراک چوُرن دیا اور گھنٹے، آدھ گھنٹے میں چوُرن نے وہ اثر کیا کہ درد غائب اور ایسا کیوں نہ ہو۔ ہمارے نانا جان کا نسخہ تھا، ہمارے نانا حکیم تھے اور اُن کے بہت سے نسخے نانی اماں کو زبانی یاد تھے یہ گھریلو بیماریوں میں بہت کام آتے اور بہت جلد اثر کرتے۔

بہت دنوں سے دادی اماں کی آنکھوں میں موتیا بند ہو گیا تھا۔ پھر بھی ہر کام خود کرتی تھیں سوئی میں اٹکل سے تاگا بھی ڈال لیتیں اور سی بھی لیتیں۔ بہت بوڑھی تھیں، غدر کے واقعات اُن کو یاد تھے "کس طرح بہلی میں بیٹھ کر گھر کے تمام لوگ گنگا پار بھاگے تھے۔ اور کس طرح ہمارے خاندان والوں کو شاہی خاندان کا سمجھ کر لال فوج نے پیچھا کیا تھا" وہ اس وقت نو، دس برس کی تھیں۔

نانی اماں کو بہت سی کہانیاں یاد تھیں۔ بہت سی۔ جاڑوں کی راتوں میں لحاف میں گھس کر کچھ سوتے، کچھ جاگتے۔ "پھر کیا ہوا" کہتے کہانیاں سنتے تھے، اچھی اچھی کہانیاں، پریوں اور بادشاہوں کی کہانیاں اب بھی وہ مجھے یاد ہیں وہ بادشاہ کی سات بیویاں اور وہ "صبر" کی فرمائش" زرد بیل اور حبشی غلام اور چمکیلے ریشمی کپڑے۔ لحاف میں گرمی ہے۔ نانی اماں مسہری سے پیٹھ لگائے بیٹھی ہیں۔ ایک طرف پان دان رکھا ہے اور ایک طرف انگیٹھی۔ ہم بہت سے بچے پلنگ پر آدھے لیٹے آدھے بیٹھے کھانا کھا چکے ہیں۔ نانی اماں سے اصرار ہو رہا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ عشاء کی نماز پڑھ لوں، تب کہانی کہوں، ہم لوگ مصر ہیں۔ چھٹن آپا بجیا، اپیا۔ بھائی جان سب کے سب۔ چھٹن آپا میوے کی تھیلی لے آئیں۔ میوہ سب کو بانٹا اور جیسا کہ بچوں کا قاعدہ ہے ہر اک کو ایسا لگا کہ اُسی کو میوہ کم ملا۔ مگر چھٹن آپا حصے بہت اچھی طرح بانٹتی تھیں، مجال ہے کسی کو کم یا زیادہ مل جائے۔ مگر ہم ندیدے نہیں مانتے تھے۔ رمضان شریف کے زمانے میں جب سوائے چھٹن آپا اور بھائی جان کے کہ وہ مذہبی معاملوں میں بہت بلند تھے۔ ہم سب کے سب سہ پہر سے مغرب تک کا روزہ رکھ کر افطار کے وقت اپنا حصہ لگانے آ جاتے بعض دفعہ ہم لوگوں کے اس ندیدے پن سے آپا حصے لگانے سے انکار کر دیتیں۔ پھر جب بڑے نماز پڑھتے تو ہم نانی اماں کے پاس پہنچ جاتے اور وہ ہم لوگوں کو وہ چیزیں دیتیں جو اُن کے کم زور مسوڑھے چبا نہ سکتے تھے۔ اُن کے دانت تو تھے ہی نہیں۔ جھک کر اور لکڑی پکڑ کر

چلتی تھیں۔ اُن کی کھال میں بے انتہا جھُریاں تھیں اُن کے سفید بال گُندھے رہتے تھے۔ اور یہ چھٹّن آپا کا کام تھا۔ کبھی کبھی اپیا اور بجیا بھی نانی اماں کا سر گوندھ دیتی تھیں۔ نانی اماں عشاء کی نماز ختم کرکے مسہری پر آجاتیں۔ انگیٹھی میں آگ نہیں کون لائے؟ نانی اماں کہتیں "جو آگ لائے وہ میرا لال" مگر آگ جاکر لائے کون؟ سب گرم گرم لحاف میں سُکڑے، اونگھتے ہوتے، کمرا بند ہوتا۔ باہر سردی اور سرد ہوا۔ نانی اماں کی خدمت گار۔ حمید کی اماں نماز پڑھتی ہوئی۔ یہ بھی بے چاری بہت بوڑھی تھیں۔ مُصیبت کی ماری ہمیشہ نانی اماں کی نوکر رہیں۔ نانی اماں کہتیں "جو جاکر آگ لائے وہ میرا لال"

باورچی خانہ دور تھا۔ آنگن سے ہوکر جانا پڑتا۔ کوئی نہ کوئی ہمت کرتا، مفلر لپیٹا، کنٹوپ پہنتا، دولائی اوڑھتا، اور لحاف میں سے نکل آگ لانے کی مہم سر کرتا۔ یہ سب اس لئے کہ اس وقت تمام نوکروں کو چھٹی مل چکی ہوتی۔ نانی اماں بہت خوش ہوتیں۔ پان کھاکر کہانی شروع کرتیں۔ آگ لینے بجیا یا چھٹّن آپا جو باوجود اونچے درجے میں پڑھنے کے کہانی سُننے سے شوق رکھتیں) اگر باہر جاتیں تو واپس آکر نانی اماں سے کہتیں "نانی اماں، نانی اماں، آج آسمان ستاروں سے جگ مگ ہورہا ہے اور کہکشاں نکلی ہوئی ہے اور ثریا کا جھُرمٹ بھی" اور نانی اماں ستاروں کا حال بتاتیں اور ان کے فارسی اور عربی نام۔

(باقی آئندہ)

۱۹۴۶ء کی نئی کتابیں

م ۔ ش ۔ ن

نغماتِ فرخ یہ کتاب چالیس نظموں کا مجموعہ ہے جو جناب منشی غلام قادر صاحب فرخ امرتسری نے بچوں کے لئے لکھی ہیں۔ اس مجموعے کی اکثر نظمیں بہت اچھی اور اس قابل ہیں کہ بچوں کے ہاتھ میں دی جائیں اور وہ اُنھیں پڑھ پڑھ کر فائدہ حاصل کریں اور لطف اُٹھائیں۔ بعض نظمیں گیت کی طرح گائی جاسکتی ہیں اور بعض بطور تمثیل کے کام آسکتی ہیں۔ قابل مُصنّف تعریف کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے اس کام پر اتنی محنت صرف کی۔ ضرورت ہے کہ یہ نظمیں بچوں تک پہنچیں تاکہ قابل مصنّف کی محنت ٹھکانے لگے اور وہ اور زیادہ توجہ سے اس کام کو جاری رکھنے پر مائل ہوں۔ یوں تو کم وبیش سب ہی نظمیں اچھی ہیں پھر بھی سُہانی صُبح، تیتر، مالی، تارا ٹوٹا، گرمی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

آئندہ ایڈیشن میں اگر لائق مصنف ان لفظوں پر غور کرلیں تو بہتر ہوگا۔

خدا کی تعریف میں چمکارا بمعنی چمک مناسب نہیں۔

تیتر کی نظم میں۔ یہ اُڑتی پھرے۔ یہ دل جلی والا مصرعہ۔ سیاق و سباق سے کچھ لگا نہیں کھاتا۔

تیزی میں۔ وہ راستہ کترگئی۔ کترگئی۔ کترا گئی کے معنوں میں کچھ ٹھیک نہیں۔

مُرغ کی بانگ میں۔ سونا ضائع جائے گا۔ مطلب واضح نہیں ہوتا۔

بارش میں۔ برس رہی ہے گھٹا۔ بارش برستی ہے گھٹا نہیں برستی۔

دھوبی میں۔ آخر بند میں "میل" مؤنث استعمال کیا گیا ہے۔ حالانکہ اس کو مذکر ہونا چاہیئے۔

سیاہی۔ یہ نظم کتاب کے عام معیار سے کیا بلحاظ الفاظ اور کیا بلحاظ خیالات ذرا مشکل ہے

کتابی سائز ضخامت ۹۰ صفحات قیمت ۸/ ملنے کا پتہ :۔ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، لاہور۔

محنت کا پھل غلام حیدر خاں صاحب نے یہ قصّہ لکھا ہے۔ پلاٹ کسی انگریزی قصّے سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے اس قصّے میں مائیکل نامی ایک غریب لڑکے کی داستاں ہے جس نے اپنی ماں اور اپنے ایک

مُربّی کی نصیحت پر عمل کر کے اپنے کام کی بنیاد محنت اور دیانت پر قائم کی تھی اور صحبتِ بد سے ہمیشہ نفور رہا تھا۔ اور آخرکار اپنی محنت اور دیانت کی وجہ سے ایک اجنبی ملک میں ایک بہت بڑے کارخانے کا مُلک بنا اور دنیوی مال اور دولت سے بہرہ مند ہوا۔ اس قصّے کی زبان سلیس، بامحاورہ اور رواں اور طرزِ ادا دلچسپ اور مؤثر ہے یقین ہے کہ جو بچے اس کہانی کو پڑھیں گے۔ اُن کے دماغ پر ایک دیرپا اثر قائم رہے گا۔ اور ممکن ہے کہ اُن کی زندگی پر بھی اثر انداز ہو۔ کتابی سائز ضخامت ۰ ۵ صفحات، قیمت ۱۲/ ملنے کا پتہ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور

دیوانہ لکھ پتی یہ قصّہ بھی غلام حیدر خاں صاحب نے لکھا ہے۔ اس میں امریکہ کے ایک قصبے پان کو کے رہنے والے ایک وحشی خاندان کے لڑکے جان روبلز کا قصّہ درج ہے، جان روبلز اپنی محنت اور مستعدی کی بدولت اپنی آمدنی بڑھانے میں کامیاب ہوگیا اور نیکی اور شرافت کی وجہ سے اپنے ساتھیوں میں معزز سمجھا جانے لگا۔ اور آخرکار ایک بہت بڑی وسیع زمین کا مالک بنا جس میں مٹی کے تیل کے چشمے نکل آئے۔ ان چشموں کی وجہ سے وہ لکھ پتی بن گیا۔ مگر غریبی سے اِک دم امیری کے درجے پر پہنچنا اُسے راس نہ آیا اور آخر دیوانہ ہو کر راہیِ ملکِ بقا ہوا۔

قصّہ کافی دلچسپ ہے۔ اور اُمید ہے کہ بچّے اس قصّے کو دلچسپی کے ساتھ پڑھ لیں گے اور انھیں اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ جان کی بربادی کا سبب اس دولت کی بنیادی خرابی تھی یعنی اس دولت کی ابتدا جوئے میں کامیابی سے اور دولت کی انتہا ایک بیوی کی زمین اس کی مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر تھوڑی رقم میں خرید لینے پر ہوئی۔ اگر یہی اثر بچّوں نے قبول کیا تو اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔ زبان سلیس رواں اور یکساں ہے کتابی سائز ضخامت ۰ ۵ صفحات۔ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور سے مل سکتی ہے۔

دو ڈرامے اس کتاب میں دو ڈرامے ہیں۔ پہلا "ایک سیب کی قیمت" اور دوسرا "بے تعصبی کا انعام" پہلا ڈراما سعد اللہ خاں وزیرِ اعظم حضرت شاہ جہاں سے متعلق ہے اور دوسرا ڈراما اس قصّے پر مبنی ہے کہ رانی کرنارت چتوڑ کی رانی نے شہنشاہ ہمایوں کو بہادر شاہ والی گجرات کے خلاف بھائی بنایا۔ اور شہنشاہ نے رانی کی مدد کی۔ ڈرامے خاصے دلچسپ ہیں مگر کہیں کہیں غیر ضروری طور پر طویل کر دیے گئے ہیں زبان بھی بعض مقامات پر قابلِ توجہ ہے۔ یہ ڈرامے مظفر حسین صاحب اطہر دہلوی نے لکھے ہیں۔ کتابی سائز ضخامت ۹ ۸ صفحات۔ قیمت ۰۳ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور سے مل سکتے ہیں۔

بچوں کا ہرلشچندر اس کتاب میں ہندوستان کے ایک قدیم زمانے کے راجا کا قصّہ ہے جنھوں نے ایک بزرگ وشوامتر کو کہتے ہیں کہ اپنا راج پاٹ دے دیا تھا اور خود جلا وطنی اور مصیبت برداشت کی۔ یہاں تک کہ وشوامتر رشی کو نذر دینے کے لئے اپنی بیوی تارا اور اپنے کم عمر بچّے روہت تک کو بیچ دیا۔ اور خود ایک چنڈال کے ہاں مُردے جلانے پر بنارس میں نوکر ہوگئے۔ راجا ہرلشچندر نے اپنی خوشی سے جو مصیبتیں اختیار کیں ان کا دل پر اثر ضرور پڑتا ہے۔ مگر بچّوں کے سامنے ان واقعات کے جستہ جستہ پہلو پیش کئے جایا کریں تو زیادہ مناسب ہو۔ اس کتاب میں جو پیرایہ اختیار کیا گیا ہے وہ زیادہ تر افسانوی رنگ لئے ہوئے ہے۔ بہرحال ہندوستان کے اس پُرانے قصّے سے جو لوگ بچوں کو واقف کرانا چاہتے ہوں وہ اس کتاب سے ضرور فائدہ اُٹھائیں۔ قیمت ۵ر۔ مصنّف نامعلوم۔ کتابی سائز ضخامت ۴۰ صفحات۔ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور

بچوں کا عطردان اس کتاب میں پیغمبروں اور اسلامی بزرگوں اور ہندوستان کی بعض قدیم اور جدید نامور ہستیوں کا حال درج ہے۔ ساتھ ہی گنگا مائی کی باتیں کے عنوان سے بھی ایک قصّہ ہے غرض یہ کہ بیس عنوانوں پر کچھ نہ کچھ لکھا گیا ہے۔ اگر پیغمبروں کا حال الگ کسی کتاب میں لکھا جاتا اور باقی بزرگوں کا دُوسری کتاب میں تو میرے خیال میں مناسب تھا۔ اس سے نہ صرف فرق مراتب ہی ملحوظ رہتا بلکہ ہر پیغمبر اور بزرگ کے متعلق نسبتاً تفصیلی معلومات بھی مہیا کی جاسکتی تھی، بہرحال سری کرشن جی مہاتما بدھ، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، گرو نانک صاحب، گرو گوبند سنگھ، سوامی دیانند۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ، گوسائیں تلسی داس، گاندھی جی، اور لالہ ہنس راج صاحب کے بارے میں جستہ جستہ معلومات حاصل کرانی ہوں تو خان احمد حسین صاحب کی اس کتاب سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔ کتابی سائز۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ:۔ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور۔

کنول کے پھول اس کتاب میں سات کہانیاں ہیں۔ جو مترجم صاحب کے بیان کے مطابق "منصور کے خزانے" کے سوا سب فرانسیسی زبان سے ماخوذ ہیں۔ ان کہانیوں میں اکثر حزنیہ ہیں اور ان کا مطالعہ طبیعت کو مکدّر کرنے کا باعث ہے۔ یہ کتاب بچّوں کے مطلب کی نہیں اور بڑوں کے لئے بھی کوئی قابل تقلید یا سبق آموز نمونہ زندگی جو انسان کی زندگی پر مفید اثر ڈال سکے موجود نہیں۔ کتابی سائز ضخامت ۱۱۱ صفحات قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، لاہور



جہاز

شجاع احمد قائد

۱۔ سرور ⎫ حقیقی بھائی
۲۔ قادر ⎭

۳۔ قاسم ⎫
۴۔ زاہد ⎬ عزیز
۵۔ ساجد ⎭

۶۔ شبراتی] ملازم

قادر۔ (بھاگتے ہوئے آکر) بھائی جان او بھائی جان

سرور۔ ادہو۔ ریڈیو .... کیا خبر لائے۔

قادر۔ میں لاتا تھوڑی ہوں۔ بس اِدھر اُدھر باہر نکلا کہ خبریں ملنا شروع ہو گئیں

سرور۔ ہوں۔ سمجھا ؛ تم اب بہت شریر ہو گئے ہو

قادر۔ (غمگین آواز میں) کیوں بھائی جان ہم نے کیا کیا۔

سرور۔ صبح سے شام تک سوائے جھوٹی آتش بازی چھوڑانے کے اور تم کو آتا ہی کیا ہے۔ نہ خود پڑھتے ہو نہ دوسرے کو پڑھنے دیتے ہو۔

قادر۔ مگر بھائی جان ذرا سُن تو لیجیے۔ یہ جھوٹی آتش بازی نہیں ہے۔

سرور۔ اچھا سناؤ

قادر۔ کل مدرسے میں موہن کہہ رہا تھا، نمائش میں چار سر اور آٹھ ٹانگوں کا بھینسا آیا ہے مگر ہے مچھر کا اتنا۔

سرور۔ تو میں کیا کروں

قادر۔ آج ہم کو بھی لے جا کر دکھا دیجیے۔

سرور۔ پندرہ روز امتحان کے رہ گئے ہیں (منہ بنا کر) چلئے ہم کو بھی دکھا دیجیے۔ آیا بڑا وہاں سے۔

قادر۔ اچھا بھائی صاحب آپ خفا نہ ہوں۔ صرف ایک خبر ....

سرور۔ میں اب کچھ نہیں سنتا، فوراً میرے کمرے سے نکل جاؤ۔

قادر نہیں بھائی جان، میرے اچھے اچھے بھائی جان ذرا سُن لیجیے۔

سرور - اچھا کہو۔
قادر - (مُنہ بنا کر) مگر آپ تو ہم کو ہمیشہ جھڑکتے رہتے ہیں۔ صبح ہوئی کہ ڈانٹ ڈپٹ شروع...
(آنے کی آواز)
سرور - دیکھو قادر کون آرہا ہے۔ ابا جان تو نہیں ہیں۔
قاسم - (قہقہہ لگا کر) ابا جان نہیں۔ اجی ہم ہیں ہم۔
سرور - ادھو، قاسم
زاہد - (قہقہہ) قاسم نہیں، ہم ہیں ہم۔
سرور - ادھو، زاہد
ساجد - (قہقہہ) زاہد نہیں، ہم ہیں ہم۔
سرور ادھو، ساجد
قاسم - آپ تو ایسا تعجب کر رہے ہیں جیسے ہم لوگ مرکر زندہ ہوگئے ہوں۔
سرور - (ہنستے ہوئے) نہیں نہیں...... مگر ہاں ...... ہاں ......
(قاسم ساجد سب ہنستے ہیں)
زاہد سرور، آخر تم کو ہو کیا گیا ہے۔ تم ہم سب کو دیکھ کر اتنے پریشان کیوں ہوگئے۔
سرور - بات یہ ہے ...... مگر کچھ نہیں ...... اچھا بیٹھو تو سہی۔
ساجد - ہم ایسے پاگل کے پاس بیٹھ کر کیا اپنا اچھا بھلا دماغ خراب کرلیں ...... اس وقت تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ بریلی کے پاگل خانے میں بیٹھے ہیں۔
(سب کے سب ہنستے ہیں)
سرور خوب ...... مگر یہاں تو تم کھڑے ہوئے ہو۔ اچھا بیٹھو، بتاتا ہوں کہ تم بریلی کے پاگل خانے میں گھس آئے ہو یا پاگل خانہ تم میں گھس گیا ہے۔
(سب ہنستے ہیں)
(کرسیاں گھسٹنے اور بیٹھنے کی آواز)
ساجد و زاہد - ہاں فرمائیے جناب سرور صاحب۔
سرور - بھئی پہلے تم لوگ اپنے سفر کا حال بیان کرو اور یہ بتاؤ کہ یہاں پہنچے کب؟
زاہد - ارے یار ابھی ابھی تو اُترے ہیں۔ بس نہا دھو کے سیدھے تمہارے گھر آئے۔
سرور - اچھا یہ تو بتاؤ تم لوگوں کی سیر کیسی رہی۔
ساجد - (ہنستے ہوئے) پہلے تم یہ بتاؤ کہ ہم لوگوں کو دیکھ کر آئیں بائیں شائیں کیوں ہوگئے۔
سرور - اچھا تو پہلے یہی سُن لو۔ بات یہ تھی کہ کل ہی ایک خط آیا تھا، اُس میں لکھا تھا کہ جس جہاز میں تم سب لوگ سوار تھے وہ خدا نخواستہ ٹوٹ گیا اور تم لوگ ......
زاہد - سمجھ گیا سمجھ گیا ہاں سرور مرتے مرتے تو ضرور

بچے، یہ تو کہو دُوسرے جہاز والے وقت پر پہنچ گئے، ورنہ..........

سرور۔ اچھا بھئی چلو تم لوگ گھر پر خیریت سے پہنچ گئے۔ خدا کا شکر ہے، ہاں قاسم یہ تو کہو کہ سفر کیسا رہا۔

ساجد و زاہد۔ بھئی ذرا ہم اماں جان سے مل آتے ہیں۔

سرور۔ ضرور ضرور وہ تو یہ خبر سُن کر بہت پریشان ہو گئی تھیں۔

قاسم ارے قادر کہاں چل دیا۔

سرور وہ تو چلتا پھرتا ریڈیو ہے ہمیشہ نئی خبروں کی تاک میں لگا رہتا ہے۔ سب طرف تم لوگوں کے آنے کی خبریں پھونکتا پھر رہا ہوگا۔

قاسم۔ (ہنستے ہوئے) یہ بھی ٹھیک ہے۔

سرور۔ اچھا بھئی سُناؤ تو کچھ، کیا کیا دیکھا، کیا کیا نہیں دیکھا، کہاں کہاں گئے، کہاں کہاں نہیں گئے۔

قاسم۔ ہم.......... ہم نے تو ساری دُنیا چھان ماری، عدن، افریقہ، سوئیزرلینڈ، شمالی امریکہ، لندن وغیرہ وغیرہ۔

قادر۔ بھائی جان کیا وغیرہ وغیرہ بھی ملکوں کے نام ہیں۔

قاسم ارے واہ استاد، میز کے اندر چھپے بیٹھے تھے۔ واہ بھئی واہ سرور تو کہہ رہے تھے کہ تم خبریں دینے گئے ہوگے۔

قادر میں بھی سُن رہا تھا، آپ جب سب باتیں بیان کر چکیں گے تب میں جا کر سب کو سناؤں گا۔

(ہنسی)

قاسم۔ اچھا تو آپ یہاں کُرسی پر آ جائیے، وہاں کیوں۔

قادر۔ (منہ بگاڑ کر) بھائی جان کے ڈر کے مارے یہاں بیٹھ گیا تھا۔

سرور۔ اچھا آؤ یہاں بیٹھ جاؤ، مگر دیکھو بیچ میں ٹرٹر ٹرٹر نہ کرنا۔

(کسی چیز کے میز پر گرنے کی آواز)

سرور۔ ارے میاں ذرا سنبھل کے نکلو۔ اس کو اُٹھا کر وہیں رکھ دو، ہاں بھئی قاسم تو تم نے اس وغیرہ وغیرہ میں کیا دیکھا سُنا؟

قاسم۔ ارے یار وہاں کی تو خیر جو کچھ ہے، ہے پہلے جہاز ہی کے قصے سُن لو۔ بس ایسے ہیں کہ مزہ آ جائے۔

سرور۔ خوب، اچھا تو جہاز ہی سے چلو، تو بمبئی پہنچ گئے، کیوں بھئی بمبئی ہی سے جہاز روانہ ہوتا ہے نا۔

قاسم۔ (ہنستے ہوئے) ہاں وہیں سے جہاز میں سوار ہوئے تھے۔

(باقی آئندہ)

اِعتماد الدّوٗلہ

محمد تقی اول ابتدائی ششم۔ تعلیمی مرکز جامعہ

تاج محل کو دیکھ کر جو اثر ہمارے دل پر ہوا اُس کا تھوڑا بہت اندازہ آپ نے اگست والے مضمون سے لگا لیا ہوگا۔

تاج کے بعد اعتماد الدّوٗلہ کا نمبر آیا۔ یہ بھی مقبرہ ہے اوٗر اس میں نوٗر جہاں کے باپ مرزا غیاث الدین بیگ اعتماد الدّوٗلہ دفن ہیں۔

یہ مقبرہ بہت خوٗب صوٗرت ہے، کہتے ہیں آگرے کی عمارتوں میں تاج محل کے بعد اسی کا نمبر ہے۔ مقبرہ نوٗر جہاں نے بنوایا ہے۔ اس ملکہ میں جہاں اوٗر بہت سی خوٗبیاں تھیں عمارت کے سلسلے میں بھی اس کا ذوٗق بہت اچھا تھا اوٗر اس کا نموٗنہ یہ اعتماد الدّوٗلہ کی عمارت ہے۔

مرزا غیاث الدین ایرانی نسل کے تھے۔ جب اُن کے والد کا انتقال ہوا، یہ بے سر و سامانی کی حالت میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے اوٗر ہندوستان کا رُخ کیا۔ اُن کے ساتھ دو بچے اور ایک بیوی تھی ابھی قندھار تک آئے تھے کہ ڈاکوٗ سب سامان لوٹ کر لے گئے اوٗر یہ بے سر و سامان قافلہ دو اوٗنٹوں پر سوار ہندوستان کی طرف قدم بڑھاتا چلا آرہا تھا۔ تھوڑے دِنوں کے بعد خدا نے انھیں ایک لڑکی دی جس کا نام مہرالنسا رکھا گیا۔ سفر کی تکلیفوں اوٗر اپنی بے سر و سامانی کی وجہ سے ماں نے اپنی چھاتی پر پتھر رکھا اوٗر مہرالنسا کو وہیں چھوڑ دیا۔ اتفاق سے ایک طرف سے ایک قافلہ آرہا تھا قافلے والوں کی نظر اس لڑکی پر پڑی تو اُنھوں نے اُسے اُٹھا لیا اوٗر ہندوستان لے آئے۔ ہندوستان آکر اُن کے دن پھرے اوٗر مرزا غیاث الدین نے مغلیہ حکوٗمت میں بڑے بڑے عہدے پائے اوٗر آگے چل کر خدا کی قدرت سے یہ لاوارث بچی جہانگیر کی ملکہ بنی اوٗر نوٗر جہاں کہلائی۔

۱۶۲۲ء میں جب مرزا غیاث الدین اوٗر اس کی بیوی کا انتقال ہوا تو نوٗر جہاں نے باپ کی محبت میں چاندی کا مقبرہ بنوانا چاہا۔ مگر اپنے مشیروں کے مشورے سے یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ چاندی

کے مقبرے کو لڑکے نہ چھوڑیں گے۔ چنانچہ اُس نے یہ سنگ مرمر کا مقبرہ شہر سے ایک میل کے فاصلے پر دریائے جمنا کے بائیں کنارے پر ۱۰۳۲ھ یعنی ۱۶۲۲ء میں بنوانا شروع کیا۔ یہ عمارت ۱۰۳۸ھ یعنی ۱۶۲۸ء میں یعنی چھ سال میں بن کر تیار ہوگئی اس مقبرے میں غیاث الدین اور اس کی بیوی کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگوں کی قبریں ہیں۔

یہ مقبرہ خوب صورتی کے لحاظ سے آگرے کی عمارتوں میں دوسرے نمبر پر ہے۔ پہلا تاج اور دوسرا اعتماد الدولہ۔ مگر بعض حصے ایسے خوب صورت ہیں کہ تاج کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اس عمارت کے بننے میں کئی لاکھ روپے صرف ہوئے اس میں بہت سے پتھر لگے ہوئے ہیں مثلاً سنگ سرخ سنگ مرمر، زمرد اور نیلم وغیرہ۔ چونکہ اس کے بنوانے میں ایک نازک اور حسین عورت نورجہاں کا ہاتھ تھا اس لئے یہ عمارت بحیثیت مجموعی بہت خوب صورت ہے۔

بچوں کی نظمیں

مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیرؔ کی اِصلاح کے بعد

مرغی کے بچے

قمر احمد فاروقی۔ الہ آباد

کٹ کٹ کرتی مُرغی آئی
کیسے اچھے ہیں یہ بچے
کچھ ہیں کالے کچھ مٹیالے
موٹے موٹے ہیں یہ بچے
کوئی بڑا اور کوئی چھوٹا
اپنی ماں کو وہ گھیرے ہیں
ہا ہا! اُجلا پروں سے نکلا
لاؤں گا میں دانہ جاکر
بے حد خوش ہو جائے گی وہ
یہ بچے بڑھ جائیں گے جب
بس یہ بھی انڈے دیں گے
اچھے اچھے ہوں گے بچے
بچے بھی وہ اپنے لائی
چھوٹے چھوٹے ہیں یہ ننھے
کچھ اجلے ہیں یہ بے چارے
بھولے بھالے ہیں یہ بچے
بچے بارہ ہیں یا تیرا
جیسے وہ اس کے چیلے ہیں
کیسا چھوٹا کیسا موٹا
ہوں گے خوش وہ اس کو پاکر
دانوں کو جب پائے گی وہ
مُرغی اُن کو نہ پائے گی تب
بچے ان سے تب نکلیں گے
اُجلے اُجلے ہوں گے بچے

اندھا فقیر

محمد عبداللہ خاں

ہیں اس کے کپڑے پھٹے میلے   جو چستر ہے بے کار ہے
لکڑی لیے ہے ہاتھ میں   پھر بھی تو چلنا یار ہے
بے چارا یہ بے کس بھی ہے   اور بھوک سے لاچار ہے
ٹیک کر چلتا ہے لکڑی   پاؤں بھی بے کار ہے
پتھروں سے بچ رہا ہے   گر رہا ہے اُٹھ رہا ہے

دیکھو اندھا فقیر جاتا ہے
دیکھو اندھا فقیر جاتا ہے

بائیسکل

محمد عبداللہ خاں۔

وہ دیکھو جا رہی ہے بائیسکل
عجب سواری ہے بائیسکل

خرچ کی اُس کو نہیں ہے حاجت   تیل کی اس کو نہیں ہے چاہت
تیز بہت رفتار ہے اس کی   گلیوں میں بھی وہ ہے چلتی

وہ دیکھو وہ سائیکل ہے
خوب سواری سائیکل ہے

لمبی راہوں میں چلتی ہے   گرمی سردی میں چلتی ہے
کام میں لوگوں کے آتی ہے   سب کو چڑھا کرے جاتی ہے

وہ دیکھو وہ سائیکل ہے
خوب سواری سائیکل ہے

ہے یہ بہت ہی عام سواری
ہے یہ سواری سب کو پیاری
بچّوں کے دل کی بھی دلاری
خوبیوں سے یہ بھری ہے ساری

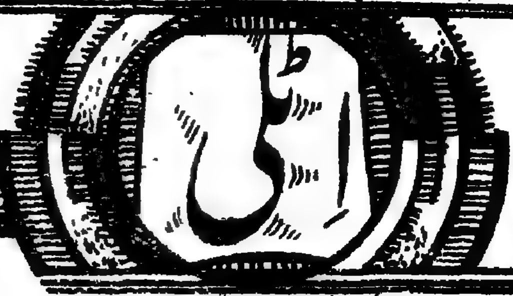
وہ دیکھو وہ سائیکل ہے
خوب سواری سائیکل ہے

سارس اور بھیڑیا

محمد وسیم خاں کا تھور

کھا رہا تھا بھیڑیا ایک دن شکار
ایک ہڈی جو نہایت سخت تھی
بھیڑیا تکلیف سے بے تاب تھا
بھیڑیا سارس سے یوں کہنے لگا
بھائی سارس مجھ پہ تو احسان کر
میرے منہ میں اپنی لمبی چونچ ڈال
تو اگر کردے مرے دُکھ کا عِلاج
رحم آیا بھیڑئے کے حال پر
بھیڑئیے کا درد جب جاتا رہا
تو نہ ہوتا گر تو مر جاتا ابھی
ایک دِن پھر اتفاق ایسا ہوا
اتنے میں آیا وہی سارس ادھر
آ کے سارس نے کہا اے بھیڑئے
میں نے مرنے سے بچایا تھا تجھے
کس قدر مغرور تھا وہ بھیڑیا
مجھ پہ کیا آتا ہے کچھ تیرا اُدھار
ہاں بچائی تو نے میری جان ہے
کم ہے کیا یہ سوچ تو دل میں ذرا
کیجے نیکی بروں کے ساتھ اگر

کھاتے کھاتے چیخ اُٹھا وہ ایک بار
حلق میں اُس کے اٹک کر رہ گئی
ایک سارس اتفاقاً آگیا
آج اک آفت میں ہوں میں مبتلا
آج اک مشکل مری آسان کر
اور ہڈی حلق سے باہر نکال
جان بچ جائے ترے صدقے میں آج
جھٹ نکالا چونچ منہ میں ڈال کر
شکر ادا کر کے یہ سارس سے کہا
تیرا یہ احسان نہ بھولوں گا کبھی
کھا رہا تھا گوشت پھر وہ بھیڑیا
بھوک کے مارے بنی تھی جان پر
میں بہت بھوکا ہوں کچھ کھانے کو دے
چاہیئے میری مدد کرنا تجھے
یوں بدل کر تیوری کہنے لگا
کیوں تجھے کھانے کو دوں اپنا شکار
تجھ پہ بھی لیکن مرا احسان ہے
چونچ کو منہ سے نکل آنے دیا
ہے خود اِس میں اپنی جاں کا بھی ضرر





سسلی کی فتح کے بعد اتحادی فوجوں نے اٹلی کی طرف رُخ کر دیا تھا اور مسینا کی آبنائے سے اتحادی فوجیں اٹلی میں اُتر گئیں۔ اسی زمانے میں اٹلی کی حکومت میں بہت بڑا انقلاب ہو گیا۔ یعنی اٹلی کے بادشاہ کے اشارے سے مسولینی اور اس کی فاشستی حکومت کو ختم کر دیا گیا اور مارشل بڈولیو کو وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ انھوں نے تھوڑے ہی دنوں کے بعد اتحادیوں سے صلح کر لی لیکن جرمن فوجیں اب تک اتحادیوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔

اٹلی کا مُلک یورپ کے جنوب میں ہے۔ بحر روم نے اسے ایک جزیرہ نما سا بنا دیا ہے۔ سسلی اور سارڈینیا کے جزیرے بھی اٹلی کی حکومت میں شامل ہیں پچھلی بڑی لڑائی کے بعد آسٹریا کا کچھ علاقہ

بھی اُسے مل گیا۔

اٹلی کا رقبہ ۱۱۹۷۱۳ مربع میل ہے اور آبادی (۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق) ۴۱،۱۷۶،۶۷۱ ہے۔ تقریباً ۹۶۰۰۰۰۰ اطالوی دوسرے ملکوں میں آباد ہیں۔ اٹلی کی حدود میں دو چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی ہیں۔ یہ ریاستیں بالکل خود مختار ہیں۔ ان میں سے ایک تو خود روم میں سولہ سو ایکڑ کا چھوٹا سا علاقہ ہے اور ویٹکن کہلاتا ہے۔ یہاں پوپ کی حکومت ہے۔ اور دوسری سان میرنو کی ریاست ہے۔

اٹلی کا علاقہ زیادہ تر پہاڑی ہے۔ شمال میں ایلپس کے پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ وسط میں اپینین پہاڑ ہیں۔ دریا بھی چھوٹے چھوٹے ہیں۔ ساحلی کنارہ بہت لمبا چلا گیا ہے۔ اس پر بہت سے بندرگاہ ہیں اور تفریح گاہیں ہیں۔ ان بندرگاہوں میں جنیوا، نیپلز، وینس، ٹریسٹا، کٹانیا، پالرمو وغیرہ زیادہ اہم ہیں۔ ان میں سے بعض بحری فوج کے مرکز ہیں۔

اٹلی کی وادیوں کی زمین بہت زرخیز ہے اور اس لحاظ سے اسے ایک زرعی مُلک کہہ سکتے ہیں۔ پھلوں کے علاوہ یہاں گیہوں، آلو اور مکئی کی پیداوار بہت زیادہ ہے۔ مچھلی کی تجارت بھی بہت ہوتی ہے۔ اٹلی کے بہت سے باشندے ماہی گیر ہیں لیکن معدنی دولت زیادہ نہیں ہے۔ یعنی کانیں وغیرہ اٹلی میں بہت کم ہیں۔ تاہم صنعت و حرفت نے شمالی علاقوں میں خصوصاً بہت اہمیت حاصل کرلی ہے۔ تورین اور ملان میں بہت سے صنعتی کارخانے اور انجینیرنگ کالج وغیرہ ہیں۔ پورے مُلک میں ریلوے کا بھی اچھا انتظام ہے۔ لڑائی سے پہلے ہوائی سروس بھی شروع ہوگئی تھی۔

فاشستی حکومت نے تعلیم کے انتظام میں بھی بہت اصلاحیں کی تھیں۔ البتہ طالب علموں میں فاشست ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یہاں کی بعض یونیورسٹیاں تمام دنیا میں مشہور ہیں۔

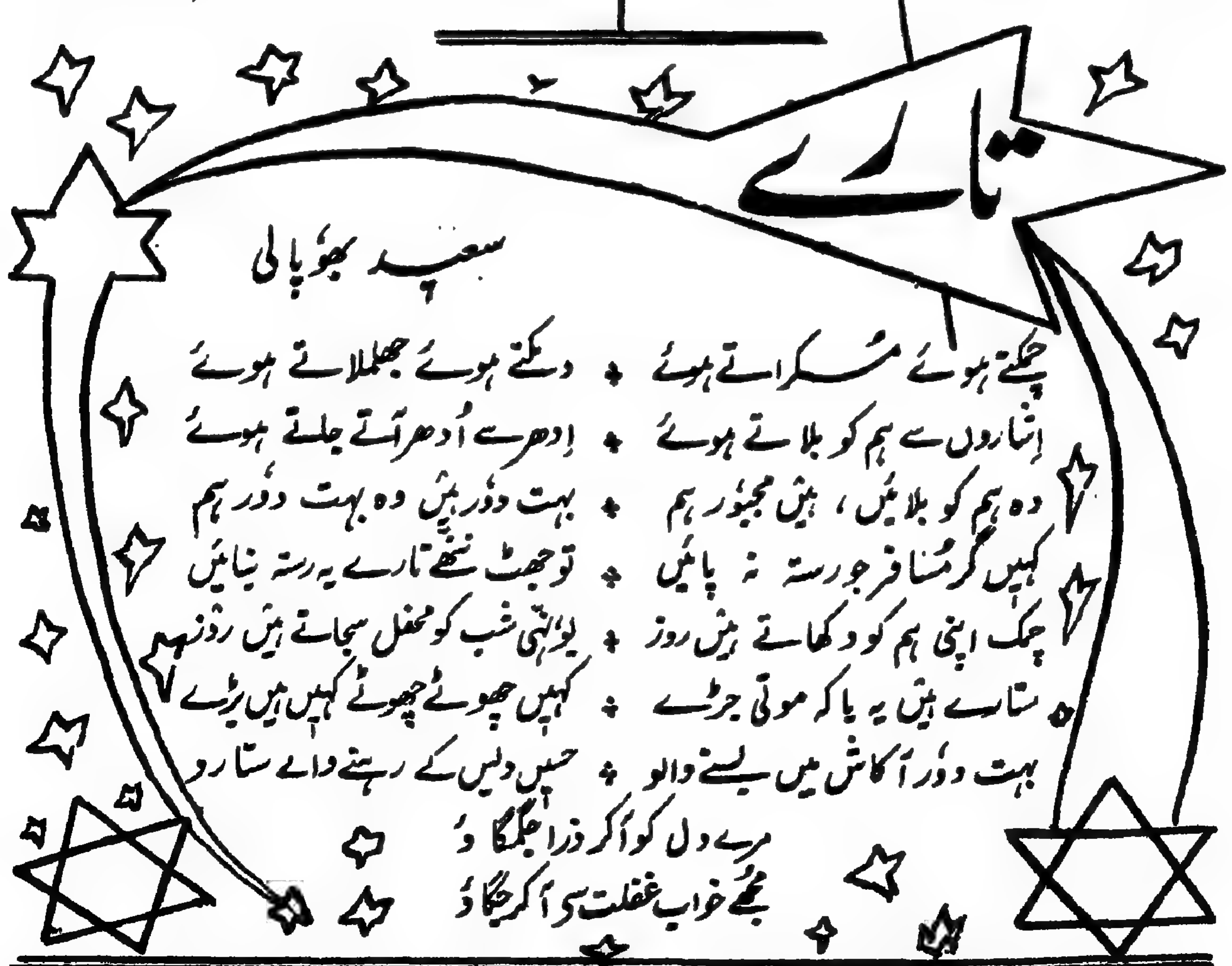
یہاں کا بادشاہ وکٹر امانوئل ہے۔ اس کا تعلق بہت پُرانے نوابی خاندان سے ہے پہلے اس خاندان کا قبضہ سارڈینیا اور سسلی پر تھا۔ رفتہ رفتہ اٹلی کا مُلک بھی اس کی حکومت میں آگیا۔

پچھلی بڑی لڑائی میں اٹلی اتحادیوں کا ساتھی تھا۔ اس کا مقابلہ آسٹریا کی فوجوں سے تھا۔ اور آسٹریا نے اٹلی کو کئی بار شکست دی۔ لیکن فتح اتحادیوں کو ہوئی۔ اس لئے اس کا شمار بھی فتح پانے والوں میں تھا اور آسٹریا کا تھوڑا سا علاقہ مالِ غنیمت میں ملا۔

لڑائی کے بعد اٹلی کی حالت بہت ابتر ہوگئی۔ اسی زمانے میں مسولینی نے ایک نئی جماعت بنائی تھی۔ اس جماعت نے آہستہ آہستہ بہت

ترقی کی۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں اس فیسسٹ جماعت کے ۴۰ ہزار آدمی روم میں داخل ہوگئے اور بادشاہ سے مطالبہ کیا کہ ملک کی حکومت ہماری جماعت کے ہاتھ میں دی جائے۔ بادشاہ کو یہ مطالبہ منظور کرنا پڑا۔ اور رفتہ رفتہ حکومت کے تمام اختیارات اس جماعت اور اس کے لیڈر مسولینی کے ہاتھ میں آگئے۔

اٹلی افریقہ کے علاقوں میں بھی حصے دار تھا۔ ایری ٹیریا، اطالوی سومالی لینڈ کے علاوہ اس نے ۱۹۳۶ء میں ابے سینیا پر بھی زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔ موجودہ لڑائی میں اٹلی جرمنی کا ساتھی ہوگیا اور لڑائی کے شروع میں اس کی فوجوں نے برطانوی سومالی لینڈ، جبوتی (فرانسیسی علاقہ) پر قبضہ کر لیا۔ اور دوسری طرف البانیہ بغیر لڑے بھڑے محض دھمکیوں سے لے لیا۔ لیکن لڑائی نے آخر پلٹا کھایا اور اٹلی کے تمام افریقی علاقے رفتہ رفتہ ہاتھ سے نکل گئے۔ اور اب تو خود اس کی جان پر آبنی ہے اور خود اٹلی میں کشت و خون کا بازار گرم ہے جس کا اٹلی والوں کو وہم و گمان بھی نہ ہوگا

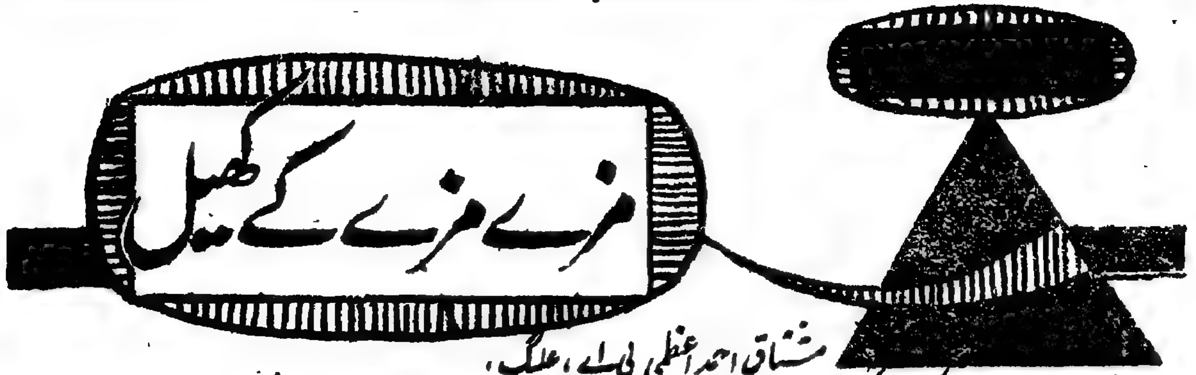


تارے

سعید بھوپالی

چمکتے ہوئے مسکراتے ہوئے ❖ دمکتے ہوئے جھلملاتے ہوئے
اشاروں سے ہم کو بلاتے ہوئے ❖ اِدھر سے اُدھر آتے جاتے ہوئے
وہ ہم کو بلائیں، ہیں مجبور ہم ❖ بہت دور ہیں وہ بہت دور ہم
کہیں گر مسافر جو رستہ نہ پائیں ❖ تو جھٹ ننھے تارے یہ رستہ بتائیں
چمک اپنی ہم کو دکھاتے ہیں روز ❖ یونہی شب کو محفل سجاتے ہیں روز
ستارے ہیں یہ یا کہ موتی جڑے ❖ کہیں چھوٹے چھوٹے کہیں ہیں بڑے
بہت دور آکاش میں بسنے والو ❖ حسیں دیس کے رہنے والے ستارو

مرے دل کو آکر ذرا جگمگا دو
مجھے خواب غفلت سے آکر جگا دو



مشتاق احمد اعظمی بی اے، علیگ،

کہیے جناب بجلی کے کھیل کیسے رہے۔ رہے نا مزے کے۔ اچھا آج ہم تمھیں اور ہی طرح کے کھیل کھلائیں گے۔ ہم نے خود بھی کھیلے ہیں، بہت ہی دلچسپ ہیں۔

اچھا ذرا اپنی آنکھیں بند کرو اور اپنے دوست سے کہو کہ تمھاری ہتھیلی پر کوئی چیز رکھ دے یہی



لکڑی کا ٹکڑا یا کوئی چھوٹی سی شیشی۔ اب تم اپنے دل میں اندازہ کرو کہ یہ چیز کتنی بڑی ہے۔ اب آنکھیں کھول دو۔ دیکھا! تمھارے اندازے میں کتنا فرق نکلا۔ جس چیز کو تم چھوٹا سمجھے تھے وہ بڑی اور جس کو بڑا سمجھے تھے وہ چھوٹی نکلی۔

اچھا اب دوبارا آنکھیں بند کرو اور کسی چیز کو اپنی انگلیوں سے چھو کر اس کی جسامت کا اندازہ لگاؤ، یعنی اس بات کا اندازہ کرو کہ وہ کتنی بڑی ہے۔ ارے اب کے تو تمھارا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔

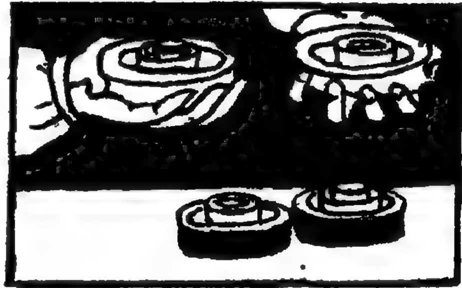
آخر بات کیا ہے، بات یہ ہے کہ تمھاری



انگلیوں میں حس کی قوت بہت زیادہ ہے اور ہتھیلی میں اتنی ہی کم، اصل میں یہ سارا کھیل تمھاری رگوں کا ہے۔ قوتِ حس کی کمی یا زیادتی انھی رگوں میں ہوتی ہے جسم کے بعض حصوں کی رگیں اس معاملے میں بہت مستعد اور چست ہیں اور بعض کی بہت سست۔

ایک بات یاد رکھنا تمھاری انگلیاں کبھی دھوکا بھی کھا جاتی ہیں۔ تمھیں یقین نہیں آیا! اچھا اپنی کلمے کی انگلی پر بیچ کی انگلی رکھو اب آنکھیں بند کرلو اور دونوں انگلیوں کے سرے سے کوئی گول سی چیز، چھوٹی سی گیند یا گولی کو چھوؤ۔ کہئے دو گولیاں معلوم ہورہی ہیں نا؟ کیسا دھوکا کھایا؟ ارے بھئی ایک ہی گولی تو تھی!

اچھا اب ایک تجربہ اور سہی۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں ہلکے سے وزن کی چیزیں لے لو۔ اگر ان میں تھوڑا سا بھی فرق ہوگا تو تم تمیز کر لوگے۔ کیا سمجھے! تمھارے پٹھوں میں بھی حس کی قوت موجود ہے۔ مگر ایسی زیادہ نہیں ہے



اگر تم دونوں ہاتھوں میں بھاری بھاری چیزیں لوگے تو تمھیں ہلکے بھاری کا فرق مشکل ہی سے معلوم ہوگا۔ مثلاً تم اپنے ایک ہاتھ میں ایک چھٹانک اور ایک ہاتھ میں دو چھٹانک وزن لو۔ فوراً تمھیں ان دونوں کے وزن کا فرق معلوم ہو جائے گا۔ برخلاف اس کے ایک ہاتھ میں اکیس اور دوسرے ہاتھ میں بائیس چھٹانک کی کوئی چیز ہوگی تو دونوں کے وزن کے فرق میں کوئی خاص تمیز نہ کر سکوگے۔

اس معاملے میں تمھاری پیٹھ تو گویا بالکل ہی بے حس ہے۔ اپنے کسی دوست سے کہو کہ وہ دو انگلیوں سے تمھاری پیٹھ چھوئے۔ انگلیاں دور دور رہیں۔ تمھیں ایسا معلوم ہوگا کہ ایک ہی انگلی سے وہ تمھاری پیٹھ چھو رہا ہے

اچھا ایک تجربہ اور۔ بہت دلچسپ اور آسان۔ تین برتن لو ایک میں گرم پانی بھر دو، ایک میں ٹھنڈا اور ایک میں گنگنا یا نیم گرم۔ اب ایک ہاتھ گرم پانی میں ڈال دو، ایک ٹھنڈے میں تھوڑی دیر تک رکھو۔ اچھا اب دونوں ہاتھ ایک



ساتھ گنگنے پانی میں ڈال دو۔ فوراً ہی۔ کیوں کیا بات ہے۔ جو ہاتھ گرم پانی میں تھا اسے یہ پانی ٹھنڈا معلوم ہوتا ہوگا اور ٹھنڈے پانی والے ہاتھ کو یہ پانی گرم معلوم ہوتا ہوگا۔

گرمی سردی کے بارے میں ایسے بہت

سے دلچسپ تجربے کئے جاسکتے ہیں۔ ہمارے جسم کی حرارت بدلتی رہتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ گرمی یا تو ہمارے جسم سے خارج ہوتی رہتی ہے یا اس میں داخل ہوتی رہتی ہے۔ جب خون تیزی کے ساتھ جسم میں حرکت کرتا ہے اس وقت اس میں گرمی آتی ہے اور جب جلد ہوا میں کھلی رہتی ہے۔ خاص طور پر سردیوں میں اس وقت جسم سرد ہوتا ہے۔ جلد کی حرارت



میں ۹۰ سے ۹۷ درجے تک فرق ہوسکتا ہے۔ سردیوں میں ہمارے جسم کی حرارت عموماً ۹۰ درجے ہوتی ہے۔ اس وقت اس سے زیادہ حرارت رکھنے والی چیز ہمیں گرم محسوس ہوگی۔ اسی طرح گرمیوں میں درجۂ حرارت عموماً ۹۷ ہوجاتا ہے۔ تو بس وہی چیز ہمیں ٹھنڈی معلوم ہوگی جس کا درجۂ حرارت اس سے زیادہ ہوگا۔ اوپر کے تجربے سے یہ بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہوگی۔

ننھے پیامیوں کے لئے

جنگلی چوہا

حسب منشا رنگ بھرو

فیروز آرٹسٹ

FIROZE

صحیح حل معما نمبر ۳۶

ق	و	ذ		و	و	ر	ا
ا	ی			ر	م	غ	غ
ب		س	ا		ل	و	ب
ل	آ		ن	ا	ل	ع	ا
	ت	ن	ج	گ			ر
ل	ی	ز	م		ا	ع	
ظ		ا	ن	ج		ی	
م		ب		ل	خ	ا	د

پیام برادری

پیاری بچیو اور بچو۔ خوش رہو اور تندرست عید مبارک۔ اس مرتبہ عید تو تم نے خوب ہنسی خوشی گذاری ہوگی مگر بھی ایسے عید کچھ ایسے موقع پر آئی ہے کہ ہمارا ملک بڑی مصیبت میں مبتلا ہے۔ فاقے اور تنگ دستی کی مصیبت۔ تم بنگال کے قحط کی خبریں روز اخباروں میں پڑھتے ہوگے۔ یہ قحط صرف بنگال میں ہی نہیں مدراس اور بمبئی کے بعض علاقوں میں بھی کم و بیش یہی کیفیت ہے۔ اڑیسہ کے پورے صوبے میں قحط ہے۔ بنگال کی حالت زیادہ خراب ہے خصوصاً پوربی بنگال کی جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ بنگال میں تو لوگ دانے دانے کو ترس رہے ہیں۔ مرنے والوں کی تعداد اب تک کوئی چار ہزار کے لگ بھگ پہنچ چکی ہے۔

ان لوگوں کو مدد تو پہنچائی جا رہی ہے بہت سی امدادی کمیٹیاں بھی بن گئی ہیں مسلم لیگ زیادہ جوش دکھا رہی ہے۔ قائد اعظم کی معرفت کوئی چونتیس پینتیس ہزار روپے بنگال بھیجے جا چکے ہیں۔ مختلف شہروں کی کمیٹیاں الگ چندہ اور اناج بھیج رہی ہیں۔ بعض اخباروں نے بھی چندے کی فہرست کھول دی ہے۔ ہندوستان ٹائمس نے اب تک تین لاکھ روپے جمع کئے ہیں تم سے بھی جو کچھ بن پڑے اپنے ان بھائیوں اور بہنوں کی امداد کرو اور اپنے بزرگوں کو آمادہ کرو۔ یہ وقت خدا کسی پر نہ ڈالے۔

پچھلے پرچے کی تصویر میں ان پیامیوں نے رنگ بھر کر بھیجا ہے۔ چنا لال کمار یہ ابوہر ازہرہ بیگم دہلی۔ محمد عزیز الہ آباد۔ سید نسیم طاہر بھوپال، سید محمد احمد عظیم، میرٹھ۔ جگت سہا لوہنگ۔ سید توقیر پاشا اٹاوہ۔ مشتاق احمد لکھنؤ۔ مرزا عثمان بیگ اجمیر۔ آصف انور جامعہ نگر۔ رئیس احمد، بھوپال۔ انور مسعود لاہور۔ بشیر محمد دہلی۔ محمد عزیز الرحمٰن سکندر آباد دکن، سلطان حلیم علی گڑھ۔ محمد اسد طاہر علی ایبٹ آباد۔ نریش چندر موگا۔ شاہ جہاں بیگم بھاول پور۔ میر حامد عزیز اچھرہ۔ محمد سعید اختر کان پور۔ سید محمد اسحٰق محبوب نگر۔ سید مسعود حسن دہلی۔ بشپ کار فورٹ سنڈیمن۔ نثیر احمد مالیگاؤں۔ علیم الدین صدیقی، حیدر آباد دکن۔ فضل الرحمٰن جہانسی۔ اقبال احمد میرٹھ۔ محمد انوار الحق جبل پور۔ سید محمد ساجد حسین اسلام پور۔ ان میں علیم الدین صدیقی حیدر آباد اور اس کے بعد فضل الرحمٰن جہانسی کی تصویر سب سے اچھی تھی۔ پہلے جمال صاحب آرٹسٹ کا ارادہ تھا کہ ایک انعام صرف دو روپے کا دیا جائے مگر اب انھوں نے فضل الرحمٰن سلمہٗ کے لئے دو روپے کا انعام اور دینا منظور کیا ہے ان دونوں کو انعام کے روپے بھیج دئے جائیں گے جمال صاحب کا پیام تعلیم کی طرف سے دلی شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ اس مرتبہ رنگ بھرنے کی تصویر کے لئے جگہ نہ نکل سکی۔ معما اور تصویر، دونوں چیزیں اگلے پرچے میں چھپیں گی۔

پچھلے معمے کے حل ان پیامیوں کے صحیح تھے: (۱) ذوالفقار علی رستگار جالندھر (۲) شمیم محمود، دہلی (۳) خورشید مصطفےٰ زبیری دہلی۔ (۴) وحید اللہ خان اعظم گڑھ (۵) محمد سجاد الرب کانپور (۶) سید اصغر مہدی دہلی (۷) سید منصور حسن اصغر دہلی (۸) خواجہ صلاح الدین گیا (۹) جلیل الدین سندیلہ (۱۰) میر عبدالباسط زاہد اچھرہ۔ (۱۱) خواجہ جمیل اختر مسلانوالی (۱۲) میر ساجد عزیز اچھرہ (۱۳) میر زاہد علی عزیز اچھرہ (۱۴) ظہیر عالم متقی رضا بدایوں۔ (۱۵) محمد وسیم خاں کانپور (۱۶) عبدالوحید بمبئی۔ (۱۷) حامد عزیز امرتسری۔ لاہور۔ اس طرح ہر پیامی کو ۵ر کا انعام ملے گا۔ انھیں اس قیمت کی کوئی کتاب بھیج دی جائے گی۔

ایک غلطی والوں کے نام یہ ہیں: (۱) اقبال احمد خان میرٹھ (۲) عبدالمتین پونا (۳) شبیر احمد مالیگاؤں (۴) محمد احمد عظیم میرٹھ (۵) عنایت حسین اجین (۶) انور حسین فاروقی ایٹہ (۷) سید اقبال حسن کرمانی اندور (۸) محمد مصطفےٰ خاں زبیری دہلی (۹) جلیس الدین عابدی مرادآباد (۱۰) نواب محمد ابراہیم دہلی (۱۱) شیخ یونس اورنگ آباد (۱۲) محمد شفیع الدین بدایوں (۱۳) محمود حسین زبیری دہلی (۱۴) لشپاکار فورٹ سینڈیمن (۱۵) محمد اسد طاہر خلجی ایبٹ آباد (۱۶) ہرشیندر موگا۔ ان میں سے ہر ایک کے حصے میں چار چار آنے آئے ہیں۔ یہ پیامی آئندہ معمے کے چار چار حل بھیج دیں۔ حل بھیجتے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں۔

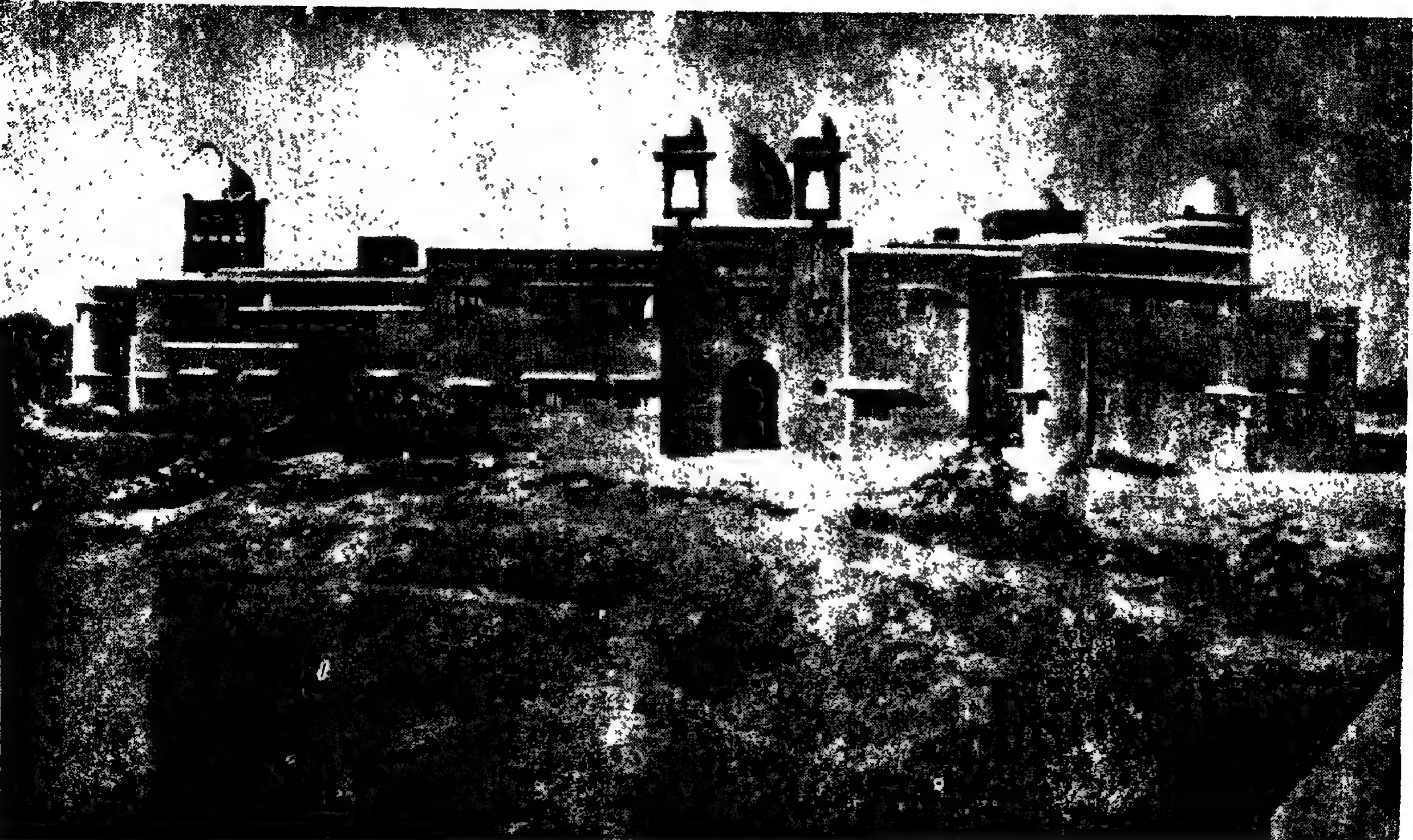
پچھلے مہینے لڑائی شروع سے آخر تک اتحادیوں کی موافقت میں رہی۔ سسلی کی فتح کے بعد اتحادیوں نے اٹلی پر حملہ کر دیا۔ زیادہ آگے بڑھنے کی نوبت نہ آئی تھی کہ اٹلی کے وزیر اعظم بدولیو نے صلح کر لی مگر لڑائی پھر بھی جاری رہی۔ اب مقابلہ جرمنی سے ہے اور بہت سخت ہے۔ باوجود اس کے اتحادی فوجیں برابر آگے بڑھ رہی ہیں۔ نیپلز پر اتحادیوں کا قبضہ ہو چکا ہے اور اب یہ فوجیں روم کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ جرمنی نے مسولینی اور اس کے عزیزوں کو مارشل بدولیو کے پنجے سے چھڑا لیا اور دوسرے اہم فاشستی لیڈر بھی جرمنی کی مدد سے آزاد ہو گئے۔ مسولینی نے اپنی وزارت بھی بنالی اور بدولیو کی حکومت کو باغی قرار دے دیا۔ اب اٹلی میں گویا تین جماعتیں ہیں۔ ایک تو بدولیو اور پرانے فاشستوں کی جماعت جس کا ملک کے ایک حصے پر اقتدار ہے۔ دوسرے مسولینی کی جماعت۔ تیسرے اٹلی کے مزدوروں کی جماعت۔ یہ بھی اپنی حکومت قائم کرنے کی فکر میں ہے۔ اس خانہ جنگی کے علاوہ دو دشمن اس ملک میں خونریز لڑائی لڑ رہے ہیں اور ملک کو تباہ کر رہے ہیں۔ غرض اٹلی اس لڑائی میں کیا شریک ہوا اس بے چارے پر مصیبت آ گئی۔

ادھر روسی سفید روس کے علاقے میں گھس گئے ہیں اور برابر آگے بڑھ رہے ہیں۔ جرمن فوجیں بہت نقصان کے ساتھ پیچھے ہٹ رہی ہیں۔ اگر یہی صورت رہی تو تمام چھینا ہوا علاقہ جرمنی کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ کوئی تین چار مہینے سے جرمنی کی ڈبکنی کشتیاں خاموش تھیں اب پھر انھوں نے اپنی سرگرمیاں دکھانا شروع کر دی ہیں۔ اس مرتبہ اس نے نئے قسم کی سرنگیں ایجاد کی ہیں۔ یہ جب پھٹتی ہیں تو جہاز فوراً سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ آدمیوں کے بچانے کی نوبت بھی نہیں آتی۔ ابھی پچھلے دنوں ان ڈبکنی کشتیوں نے اتحادیوں کے کئی جہاز ڈبو دئے۔

جاپان پر ہندوستان سے حملے کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔ جنوبی ایشیا سنٹرل کمانڈ بن گئی ہے اس کا دفتر بھی قائم ہو گیا ہے۔ غالباً جاڑوں میں جاپان پر بہت سخت حملہ کیا جائے گا۔ ویسے لڑائی اب بھی جاری ہے۔ ابھی پچھلے دنوں جنرل لیک آرتھر کو مختلف مقامات پر اچھی خاصی کامیابی ہوئی ہے۔ اس مہینے میں ہندوستان کے موجودہ وائسرائے ہز اکسلنسی لنلتھگو اپنے عہدے کا چارج دے دیں گے۔ ان کی جگہ ہندوستان کے پچھلے کمانڈر انچیف لارڈ ویول وائسرائے بنیں گے۔ دیکھئے ان کے زمانے میں ہندوستان کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اس وقت تو ہمارا دیس سخت مصیبت میں مبتلا ہے۔



بچوں کی یہ مفید کتاب اس مہینہ شائع ہوئی ہے قیمت ۸ آنے



جامعہ کا ایک دارالاقامہ (پچھلا حصہ)

پیام تعلیم

دہلی، یو پی، سی پی، برار، میسور، قلات
بنگال، رام پور، حیدرآباد سندھ، کشمیر، پنجاب، بہار
اور سرحد کے محکمہائے تعلیم کی طرف سے سرکاری طور پر منظور کیا گیا ہے

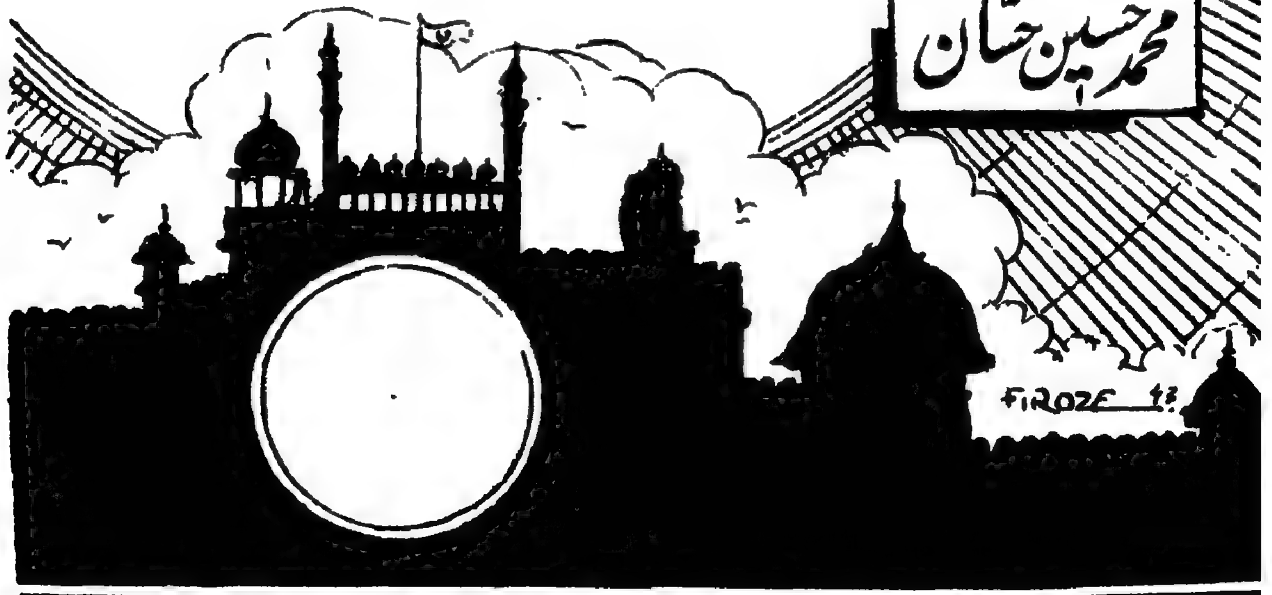
جلد ۲۶
نمبر ۱۱

قیمت سالانہ عہ
فی پرچہ ۳ر

ایڈیٹر
محمد حسین حسان

فہرست مضامین نومبر سنہ ۱۹۴۳ء

۱	بچوں سے باتیں	ایڈیٹر	۳۲۲
۲	دیوالی	محمد شفیع الدین نیّر	۳۲۳
۳	یوم تاسیس	عبداللطیف اعظمی	۳۲۵
۴	غائب ہونے کا جادو	محمد شفیع الدین نیّر	۳۲۷
۵	سنہ ۴۲ء کی کتابیں	م، ش، ن	۳۳۱
۶	خطوں کا البم	خلیل الرحمٰن اعظمی	۳۳۳
۷	جہاز	شجاع احمد قائد	۳۳۷
۸	علی گڑھ میں دو دن	انوار النعم	۳۴۱
۹	نانی اماں	محمد احسن	۳۴۴
۱۰	پیام برادری	ایڈیٹر	۳۴۷
۱۱	معما	... ...	۳۵۰
۱۲	رنگ بھرو	فیروز آرٹسٹ	۳۵۲



پرنٹر پبلشر: ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی۔ محبوب المطابع پریس دہلی

بچوں سے باتیں

تمھارے سالنامے کی تیاریاں شروع ہوگئی ہیں۔ ہمارے مضمون نگاروں نے ابھی سے مضمون لکھنا شروع کردئے ہیں۔ ایک صاحب نے مسلمانوں کی تاریخ قوم کے بارے میں بہت مفید اور دلچسپ معلومات جمع کی ہیں وہ انھیں پیام تعلیم کے لئے مضمون کی شکل میں تیار کررہے ہیں۔

سید ابو طاہر صاحب اس مرتبہ ایک بہت ہی دلچسپ ڈراما لکھ رہے ہیں۔ تیر صاحب نے ایک نظم خاص طور سے سالنامے کے لئے تیار کی ہے۔ ان کا ایک اچھا سا مضمون بھی چھپے گا۔ ان کے علاوہ اور اچھے اچھے مضمون نگار بھی مضمون لکھنے میں مصروف ہیں۔ غرض تمھارا سالنامہ خدا نے کیا تو خوب دلچسپ ہوگا۔

۳۲ء کی کتابوں پر تبصرہ سبھی پیامیوں نے پسند کیا۔ اس تبصرے سے یہ اندازہ ہوگیا کہ پچھلے سال بچوں کی کتنی کتابیں چھپیں۔ اور کس نوعیت کی تھیں۔

تبصرے کا یہ سلسلہ اس مہینے ختم ہوجائے گا۔ ہمارا ارادہ ہے کہ آیندہ سال بھی یہ سلسلہ جاری رکھا جائے۔ ہمیں امید ہے بچوں کی کتابیں چھاپنے والے حضرات اس کام میں ہماری مدد کریں گے اور ۳۳ء میں بچوں کے لئے جو کتابیں چھپی ہیں ان کی ایک ایک جلد پیام تعلیم میں تبصرے کی غرض سے ہمیں بھیج دیں گے۔

اس پرچے میں گنجائش کی کمی کے سبب بچوں کی نظمیں اور بچوں کے مضمون نہ چھپ سکے انشاء اللہ اگلے پرچے میں چھپیں گے۔

دیوالی

مولوی محمد شفیع الدین نیر

اے لو پھر دیوالی آئی — خلقت پھرتی ہے اتراتی

باغ جہاں کی رنگت بدلی — بادِ صبا نے لی انگڑائی

غنچے چٹکے، کلیاں مہکیں — پھولوں نے محفل گرمائی

ہر ہر شخص نظر خوش آیا — ہر ہر سمت مسرت چھائی

لوگ ہیں پھرتے البیلے — گویا سب نے دولت پائی

سب نے اپنے اپنے گھر کو — زینت دی، ہر چیز سجائی

سب نے کر لی لیپا پوتی — کر لی سب نے خوب صفائی

ایک نے تصویریں ٹانگی ہیں — دیوار ایک نے ہے رنگوائی

اس نے ہیں فانوس لگائے — ہانڈی ہے اس نے لٹکائی

بچے تو پھر بچے ہی ہیں — سب نے مل کر دھوم مچائی



خوب ہنسی جی بھر کے کھیلیں گے
اسکولوں سے چھٹی پائی

خوش ہیں سب لائیں گے کھلونے
خوش ہیں سب کھائیں گے مٹھائی

لڈو کھیلیں اور بتاشے
برفی پیڑے نان خطائی

اس نے بنکائے اچھے کپڑے
اُس نے نئی ٹوپی منگوائی

ملک میں اتنی خوشیاں کیوں ہیں
کیوں ہیں خوش خوش ہندو بھائی

رام اور لچھمن آئے اِس دن
اپنے وطن میں بعد جُدائی

مار کے راون کو لنکا میں
حق کی خاطر کرکے چڑھائی

یا دیں اُن کی گھر گھر روشن
شمعیں دیتی ہیں دکھلائی

شمعیں جو اتنی روشن دیکھیں
کاہکشاں تک بھی شرمائی

ہندو بھائیوں کو تم بھی
دے دو نیّرؔ دل سے بدھائیؔ[1]

[1] مبارک باد



جامعہ کا یوم تاسیس

۲۹ر اکتوبر ۱۹۴۳ء

عبداللطیف اعظمی بی اے جامعہ

پیامیوں کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ جامعہ کی بنیاد ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء میں رکھی گئی تھی۔ اسی مناسبت سے ہر سال ۲۹ر اکتوبر کو جامعہ میں یوم تاسیس منایا جاتا ہے۔ شروع شروع میں اس موقع پر بہت شاندار جلسہ ہوتا تھا۔ ملک کے اچھے لکھنے والے اور مشہور شعرا آتے۔ مضامین پڑھے جاتے مشاعرہ ہوتا۔ مکتبہ اپنی کتابوں کی نمائش کرتا، اور تمھارے رسالہ پیام تعلیم کا سالنامہ "تاسیس نمبر" کے نام سے چھپتا۔ آج کل تم جانتے ہو حالات کیسے نازک ہیں۔ روپے پیسے کی ویسے ہی کتنی کمی ہے۔ اس لئے اب ۲۹ر اکتوبر کو "حساب کا دن" مقرر کیا گیا ہے۔ یعنی جامعہ کے کارکن اور طلبا جمع ہوتے ہیں، پچھلے سال کے کاموں کا جائزہ لیتے ہیں اور آیندہ کے لئے سوچ بچار کرتے ہیں۔

حسب معمول امسال بھی ۲۹ر اکتوبر کو یوم تاسیس منایا گیا۔ ایک چھوٹی سی نمائش ترتیب دی گئی تھی۔ جس میں جامعہ کے بانیوں اور خادموں کی تصویریں اور ان کے پیغامات خاص طور پر جمع کئے گئے ڈاکٹر ذاکر صاحب شیخ الجامعہ کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا جس میں مدرسہ ابتدائی ثانوی اور کالج کے طالب علموں نے جامعہ، جامعہ کے مقاصد اور مسلمانوں کی تعلیم پر اچھے اچھے مضمون اور نظمیں پڑھیں، آخر میں ڈاکٹر صاحب نے ایک مختصر سی تقریر کی۔ انھوں نے فرمایا "جامعہ کے قیام کو امسال ۲۳ سال ہوئے۔ ۲۳ سال دیئے تو کچھ زیادہ نہیں مگر ایک غلام اور پس ماندہ قوم کے لئے یہ مدت بہت زیادہ ہے۔ غلام قوم کا ایک ایک منٹ بہت قیمتی ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیں اپنے کاموں کا بہت سختی سے جائزہ لینا چاہیے۔ جامعہ نے قومی تعلیم کا وعدہ کیا ہے۔ اس لئے جب تک قوم کے ایک ایک فرد میں تعلیم کی لگن پیدا نہ ہو جائے۔ جامعہ کے اساتذہ طلبا اور دوسرے کارکنوں کو چین سے بیٹھنا نہیں چاہیئے۔" وغیرہ وغیرہ

مدرسہ ثانوی کے طلبا نے اپنے قلمی رسالہ "مصور" کا خاص نمبر نکالا تھا جس میں حکیم اجمل خاں مرحوم

ڈاکٹر انصاری مرحوم، خالدہ ادیب خانم اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب وغیرہ کے پیامات درج تھے۔ ڈاکٹر ذاکر صاحب کے علاوہ دوسرے لوگوں کے پیامات، پیام تعلیم کے پچھلے مختلف پرچوں میں چھپ چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ پیام بالکل نیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ایسی مفید باتیں ہیں کہ پیامی ان سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، اس لئے ہم نیچے درج کرتے ہیں:-

آپ سب کو جامعہ کی زندگی کا یہ نیا سال مبارک ہو

مدرسہ ثانوی کے طلباء سے میں چاہتا ہوں کہ وہ اس سال خاص طور پر ان باتوں کا خیال رکھیں:-

(۱) تندرستی کا:- جو بیماری اُن کی توجہ سے ٹل سکے، اُسے ٹالنے کی پوری کوشش کریں۔ مثلاً کھانے پینے میں احتیاط سے یہ یقین ہو کہ بعض شکایتیں ٹل سکتی ہیں تو بد پرہیزی نہ کریں۔ اگر سردی سے بچ کر کسی بیماری سے بچ سکتے ہوں تو سردی نہ کھائیں۔ اگر بخار سے اُٹھنے کے بعد زیادہ جسمانی مشقت سے پھر بخار آنے کا اندیشہ ہو تو اپنے کو یوں نہ تھکائیں کہ پھر بیمار پڑ جائیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

(۲) کام کرنے کے طریقے کا:- تمہاری تعلیم کا راز اسی میں ہے کہ کام کا طریقہ سیکھ لو اور کام کرنے کی عادت ڈال لو۔ چند روز میں بہت سی باتیں یاد کر لینے سے تعلیم نہیں ہوتی۔ کام کا طریقہ، مطالعے کا طریقہ سیکھ لینے سے، ساری عمر تعلیم کا کام جاری رکھا جا سکتا ہے۔ اور یہ کام ساری عمر ہی کرنے کا ہے۔ ثانوی مدرسے میں ختم نہیں ہو جائے گا۔

(۳) مل جل کر رہنے کا:- آدمی اکیلا رہنے کے لئے نہیں بنا ہے۔ ہمیشہ ساتھی ڈھونڈھتا ہے۔ اور جماعت میں رہ کر پورا آدمی بن سکتا ہے۔ اچھے ساتھی بنو۔ ساتھیوں کی مدد کرو۔ دُکھ درد میں اُن کے شریک ہو۔ اُن کے سامان کی اُسی طرح حفاظت کرو۔ جس طرح اپنے سامان کی کرتے ہو۔ چوری سے ساتھیوں کا اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔

(۴) دوسروں کی خوبیاں دیکھنے اور اپنے عیبوں پر نظر کرنے کا:- اس طرح اپنے عیبوں کو کم کرکے اپنی اچھائیاں بڑھا سکو گے۔ اپنے کام کی خوبی کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ دوسرے کا کام خراب ہو یا خراب بتایا جائے۔

(۵) غیبت اور بدگوئی سے بچو:- اس سے جماعت منتشر اور پراگندہ ہو جاتی ہے۔



غائب ہونے کا جادو

مولوی محمد شفیع الدین نیر

پُرانے بادشاہتوں کے زمانے میں ایک جادوگر زوزو نامی رہا کرتا تھا۔ اُسے جادو کا شوق تھا اور لڑکپن میں اُس نے اپنا بہت سا وقت جادو سیکھنے میں صرف کیا تھا۔ وہ سالہا سال کی سخت محنت کے بعد جادو کے تین کام کرسکتا تھا۔

پہلا جادو دور کا جادو کہلاتا تھا۔ دوسرا چھپی ہوئی چیزوں کا، اور تیسرا غائب ہونے کا جادو مشہور تھا۔ آپ کی رائے میں وہ تینوں جادوؤں سے کیا کیا کام کرسکتا تھا؟ دور کا جادو یہ تھا کہ وہ منتر بڑبڑاتا اور طلسمی علامت بناتا اور اسی وقت ہزاروں میل سے جو چاہتا منگا لیتا۔ اگر کوئی چیز اور بھی زیادہ دور ہوتی تو وہ خود اس کے لینے کے لئے چلا جاتا اور چند پل بھی نہ گذرتے کہ لے کر لوٹ آتا۔ پوشیدہ جادو کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم اُس کو بتائے بغیر کوئی چیز چھپا کر رکھ دو تو وہ بڑی آسانی سے اُس کو اُسی وقت تلاش کر لیتا۔

غائب ہونے کا جادو سب سے عجیب تھا۔ کیونکہ بہت سے آدمیوں کی آنکھوں ہی آنکھوں میں محض ایک دیوار کی طرف بڑھ کر غائب ہو جاتا۔ زوزو نے اپنے اپنے کمال دکھائے کر جادوگر کی حیثیت سے سب لوگ اُسے جان گئے اور اُس نے بہت نیکنامی حاصل کر لی جب بادشاہ کے وزیر اعظم نے یہ سنا تو اُس نے مبارکباد کہلا بھیجی اور اُس کو اپنے جادو کے کارنامے دکھانے کے لئے بلایا۔ پہلے تو جادوگر نے یہ دعوت قبول نہیں کی لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ اچانک وزیر اعظم سے ملنے کے لئے آگیا۔ اس وقت وزیر اعظم یونان کے شاہی صدر مقام میں ایک ضیافت دے رہا تھا اس ضیافت میں سو سے زیادہ مہمان شریک تھے اُس نے زوزو کو اس ضیافت میں شریک کرکے اس کی عزت بڑھائی۔ اور اس نے خواہش کی کہ وہ اس موقع پر اپنے جادو کا کمال دکھائے

اس نے کہا۔

"مسٹر زوزو ہم آپ کے یہاں آنے سے بہت ہی خوش ہوئے ہیں۔ کیا ہم آپ سے ایک درخواست کر سکتے ہیں؟"

اُس نے جواب دیا۔ "سر آنکھوں سے! جناب! فرمائیے کیا حکم ہے؟"

"آپ دیکھتے ہیں کہ دسترخوان پر کوئی خاص کھانا نہیں ہے۔ کیا آپ اتنی عنایت کریں گے یعنی کیا آپ کیانگ سو کے دریا سنکیانگ سے ہمارے لئے کٹرا مچھلی منگوا دیں گے؟"

اس نے کہا "اعلیٰ حضرت! ضرور۔"

لیکن یہ اصلی سنکیانگ دریا کی کٹرا مچھلی ہونی چاہئے۔ جس کا دہانہ بڑا اور چھلکے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ مگر یہ زندہ ہو۔ میں اِس کو فوراً چاہتا ہوں۔ کیونکہ ہم سب اس کو کھانے کے انتظار میں ہیں۔"

زوزو نے کہا "بے شک۔ لیکن میں اعلیٰ حضرت سے ایک درخواست کروں گا۔ وہ یہ کہ تازہ پانی کا ایک پیالا اور ایک بنسی کا ٹنٹا اور چارہ عنایت کیا جائے۔ اتنے آپ پینے پلانے کا شغل کریں۔ میں آپ کے لئے کٹرا مچھلی پکڑ دوں گا۔"

اس کی درخواست منظور کر لی گئی۔ سارے مہمانوں کو اس پر بڑی تشویش ہوئی۔ وہ یہ بات سمجھتے تھے کہ وزیر اعظم جان بوجھ کر اُس کو کٹرا مچھلی منگوا کر مصیبت میں مبتلا کر رہا ہے، کیونکہ یہ ایک ہزار میل کے فاصلے پر ملتی ہے لیکن زوزو ذرا بھی نہیں گھبرایا۔ جب پیالا اور بنسی آ گئی۔ تو اُس نے ایک فلیتہ بنایا اور اس کو جلا کر پیالے میں ڈال دیا اور کچھ عجیب بول بڑبڑائے۔ پھر اُس نے کٹرا مچھلی کے لئے کانٹا پیالے میں ڈالا یہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے کہ ایک لمحے سے بھی کم میں اُس نے بنسی اُٹھائی اور کانٹے میں اٹکی ہوئی ایک زندہ کٹرا مچھلی نکالی۔ لوگ چاروں طرف جمع ہو گئے۔ اُنھوں نے دیکھا یہ تو سچ مچ کٹرا مچھلی ہے۔ جس کا دہانہ بڑا اور چھلکے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اور جو دریائے سنکیانگ میں ملتی ہے۔ وزیر اعظم کو بھی جادوگر کے اس کمال پر جادوگر کو داد دینی پڑی۔

وزیر نے کہا "اس مچھلی کا شکریہ۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ اتنے مہمانوں میں صرف ایک مچھلی کیونکر کافی ہو سکتی ہے۔ کیا آپ چند اور مچھلیاں منگوا سکتے ہیں تاکہ ہر شخص اس کو کم سے کم چکھ لے۔"

زوزو نے یہ بھی کر کے دکھا دیا۔ لیکن وزیر اعظم نے اس کو زچ کرنے کے لئے کہا۔

میں نے سُنا ہے کہ یہ مچھلی اگر زی چوان مقام کے ادرک کے ساتھ پکائی جائے تو اور

بھی مزے دار ہوتی ہے۔ کیا آپ تھوڑا سا یہ ادرک بھی مہیا کر سکتے ہیں۔"

جادوگر نے جواب دیا۔ "یہ بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔ لیکن مجھے خود جانا پڑے گا۔ کیونکہ یہ جگہ بہت دور ہے۔"

وہ جانے لگا تو وزیر نے اُس کو ٹھہرا لیا اور کہا "اس سلسلے میں ایک کام اور کیجئے۔ آپ ذی چوان جائیں تو میرا ایک پیغام بھی پہنچا دیجئے میں نے ایک عہدہ دار سے فرمائش کی ہے کہ اس صوبے کے صدر مقام سے میرے لئے ساٹن کے دس تھان خریدے۔ لیکن مجھے دو اور تھانوں کی ضرورت ہے۔ اور آپ اس کا دستخطی جواب لائیے۔"

"اعلیٰ حضرت! ایسا ہی ہوگا" وہ کودا اور ہوا میں غائب ہو گیا۔

ضیافت مزے سے ہوتی رہی۔ چند لمحوں کے بعد زوزو باہر سے ادرک کی ایک گٹھڑ اور ذی چوان کے عہدے دار کا دستخطی خط ہاتھ میں لئے ہوئے داخل ہوا۔ وزیرِ اعظم بہت خوش ہوا۔ اور یہ دیکھ کر اس کو اور بھی خوشی ہوئی کہ اس کے سب مہمانوں نے کنڑا مچھلی کو چکھ کر لطف اُٹھایا۔ اُس وقت سے وہ زوزو کا احترام کرنے لگا۔ ایک دن وزیرِ اعظم سپاہیوں کے ایک دستے کو کسی گاؤں میں تربیت دے رہا تھا اتفاق سے زوزو بھی اس روز وہیں تھا۔ وزیر نے بڑی گرم جوشی سے اُس کا استقبال کیا۔

اس نے کہا "میری بڑی خوش نصیبی ہے کہ آپ سے ملاقات ہوئی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرا ایک کام اور کر دیں۔ ہم کو ایسی جلدی میں روانہ ہونا پڑا کہ ہم کھانا لانا بھول گئے۔ ہم بہت شکر گذار ہوں گے اگر آپ ہر سپاہی کے لئے اچھی خوراک یعنی آدھ سیر گوشت، چاولوں کے بھرے ہوئے تین پیالے اور شراب کا ایک ایک جام مہیا کر دیں۔"

زوزو نے پل بھر میں حکم کے مطابق سب کچھ تیار کر دیا اور سب سپاہی خوب اچھی طرح سیر ہو گئے

حقیقت یہ تھی کہ باورچی سپاہیوں کے لئے کھانا لے آیا تھا لیکن وزیر نے یہ سوچا کہ اگر زوزو سپاہیوں کے لئے اور کھانا لا دے تو یہ کھانا رات کے لئے بچ رہے گا اور سپاہیوں کی تربیت شام تک ہو سکے گی۔ زوزو چلا گیا۔ وزیر اپنے معائنے میں مصروف رہا۔ جب شام ہوئی تو اُس نے باورچی کو کھانا تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس کو بہت تعجب ہوا جب اس کو یہ بات بتائی گئی کہ جتنی جنس وہ لایا تھا نہ جانے کس طرح

ساری کی ساری غائب ہوگئی۔ اب وزیر کو معلوم ہوا کہ سپاہیوں کو جو کھانا زوزو نے مہیا کیا تھا وہ یہی کھانا تھا۔ اس کو کچھ بھی زحمت نہیں اُٹھانی پڑی تھی۔ اس لئے وزیر کو قریب کی دکان سے جنس خریدنی پڑی۔

کچھ مہینے کے بعد وزیرِ اعظم پھر زوزو سے ملا۔

وزیر نے کہا "میں نے آپ کے عجیب و غریب جادو کی کئی بار آزمائش کی ہے اور درحقیقت اس کو عجیب ہی پایا ہے۔ کیا کوئی اور کمال بھی آپ دکھا سکتے ہیں؟"

جادوگر نے جواب دیا۔ "جی ہاں! میں ایک اور جادو دکھا سکتا ہوں جو آپ نے اب تک نہیں دیکھا اور یہ غائب ہوجانے کا جادو ہے"

اس نے پوچھا "یہ غائب ہوجانے کا جادو کیا ہے؟"

"یہ جادو اپنے آپ کو غائب کر دینے کا جادو ہے۔ دیکھئے میں اگرچہ آپ کی نظر کے سامنے ہوں لیکن اچانک آپ کی نظر سے اوجھل ہو سکتا ہوں"

"یہ تو بہت ہی شاندار جادو ہے۔ کیا آپ ابھی یہ دکھا سکتے ہیں؟"

"جی ہاں کیوں نہیں" یہ کہہ کر وہ دیوار کی طرف چل کر اچانک غائب ہوگیا۔

وزیرِ اعظم کو یہ دیکھ کر بڑا اچنبھا ہوا اور اس نے چلّا کر کہا۔

"مسٹر زوزو، مسٹر زوزو، ظاہر ہوجائیے ظاہر ہوجائیے۔ میں اب سمجھ گیا کہ غائب کر دینے والے جادو کا کیا مطلب ہے" زوزو دوبارہ ظاہر ہوگیا۔ وزیر نے جادوگر سے کہا کہ اپنا یہ جادو آپ مجھے بھی سکھا دیجئے۔ لیکن زوزو نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ آپ کو ضرورت نہیں اس لئے سیکھنا بھی نہیں چاہئے۔ جب وزیر نے پوچھا کیوں نہیں تو اس نے جواب دیا۔ آپ بادشاہ کے بعد رتبے میں سب سے بڑے ہیں۔ آپ جہاں کہیں جاتے ہیں محافظ دستہ آپ کے ساتھ ہوتا ہے اگر آپ نے جادو کے ذریعے غائب ہونا سیکھ لیا تو آپ کے گرد جو لوگ ہوں گے گھبرا جائیں گے۔ پھر یہ بھی ہے کہ میرے برعکس بہت بڑے آدمی ہیں۔ کیونکہ میں دنیوی زندگی سے الگ ہوگیا ہوں اور میں کسی ناجائز مقصد کو پورا کرنے کے لئے غائب ہونے کی اس قوت کو کام میں نہیں لا سکتا۔ اپنے درجے کے لحاظ سے ہو سکتا ہے کہ آپ ایسا کرنے پر مائل ہوں لیکن اگر آپ نے ایسا کیا تو خدا سزا دے گا۔ نہ صرف آپ کو بلکہ مجھے بھی کیونکہ میں آپ کو یہ جادو سکھاؤں گا۔

(باقی پھر)

سنہ ۴۶ء کی نئی کتابیں (۳)

م ۔ ش ۔ ن

ثریا کا خواب یہ کہانی۔ ح م اسلم کی لکھی ہوئی ہے اور پیام تعلیم کے مختلف نمبروں میں مسلسل شائع ہو چکی ہے۔ پیامی بھائی اس کی خوبی اور دلچسپی سے بخوبی واقف ہیں۔ کہانی ایسی ہے کہ شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ اوقاف کا زیادہ خیال رکھا جاتا اور لکھائی چھپائی بہتر ہوتی تو اس کی خوبیوں میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ قیمت درج نہیں۔ مکتبہ اقبال پٹنہ سے مل سکتی ہے۔

بہروپیا گدھا کسی گدھے کو کہیں سے شیر کی کھال مل گئی۔ اس نے اس کھال کو اوڑھ لیا اور اپنے آپ کو شیر سمجھنے لگا۔ مگر اصلیت ظاہر ہو کر رہی۔ اس کہانی کو ڈاکٹر الف، ایم، شجاع صاحب ناموس نے ذرا بڑھا کر بیان کیا ہے۔ اور ۲۵ صفحوں پر پھیلا کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کسی شخص کی قدر اس کی خوبیوں کی بنا پر ہوتی چاہیئے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ کتاب چھوٹے بچوں کے لئے ہونی چاہیئے۔ اس لئے ہمیں فاضل مصنف کی توجہ اس طرف منعطف کرانی ہے کہ انھوں نے جو زبان استعمال کی ہے وہ بچوں کے معیار سے بہت بلند ہے اور بعض محاورے ایسے ہیں جن پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ آپ نے یہ اچھا کیا ہے کہ مشکل الفاظ کے معنی ہر صفحے پر دے دئے ہیں۔ پھر بھی دریچا، ناگہانی موت، حسب حیثیت، مہمات، برسر اقتدار ہونا۔ منزلت، احتیاط، افسردہ خاطر، معیار، اور فارسی جملے اور مقولے بچوں کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ اس لئے ہم اس کو چھوٹے بچوں کے لئے مشکل سمجھتے ہیں۔ یہ کتاب رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور سے ۲؍ میں مل سکتی ہے۔

بیگانی چال یہ کتاب بھی ڈاکٹر الف ایم شجاع ناموس صاحب نے لکھی ہے اور قصے کے پیرائے میں دوسروں کی روش اختیار کرنے کے نقصان بتائے ہیں۔ زبان نسبتاً آسان اور عبارت میں خاصی روانی ہے مگر بیان میں غیر ضروری طوالت سے کام لیا گیا ہے کتابی سائز ۲۰ صفحات

یہ کتاب بھی رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور سے پونے تین آنے میں مل سکتی ہے۔

بچوں کا پرستان

مصنفہ خان احمد حسین خاں کتابی سائز۔ ضخامت ۱۳۶ صفحات، ملنے کا پتہ رائے صاحب گلاب سنگھ اینڈ سنز، لاہور

اس کتاب میں بارہ کہانیاں ہیں جو پریوں، دیووں، جادوگروں سے تعلق رکھتی ہیں۔ کہانیاں سب ہی دلچسپ ہیں۔ ایسی دلچسپ کہ شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے انھیں چھوڑنا مشکل ہے۔ یقین ہے کہ بچے ان کہانیوں کو بڑے شوق سے پڑھیں گے۔ زبان آسان، سادہ اور بامحاورہ اور طرزِ ادا قابلِ تعریف ہے۔ اگر دوسرے ایڈیشن میں مندرجہ ذیل محاورات کی طرف بھی توجہ کرلی جائے تو اچھا ہوگا۔

صفحہ ۱۰ انتڑیوں میں درد ہورہا ہے۔ یہ جملہ مفہوم کو ٹھیک ادا نہیں کرتا۔ ایسے موقع پر انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں بولتے ہیں۔ صفحہ ۵ پر مجھے تیرے پاس سے بدبو آتی ہے کی بجائے مجھے تیرے جسم سے بدبو آتی ہے۔ اسی صفحے پر اس کا حکم تھا کہ اس کے محل میں کوئی فقیر آنے نہ پائے ورنہ نوکروں کو مارتے مارتے فرش کردوں گا۔ اس میں اُن کے محل کی بجائے میرے محل کردیا جائے تو بہتر ہے۔

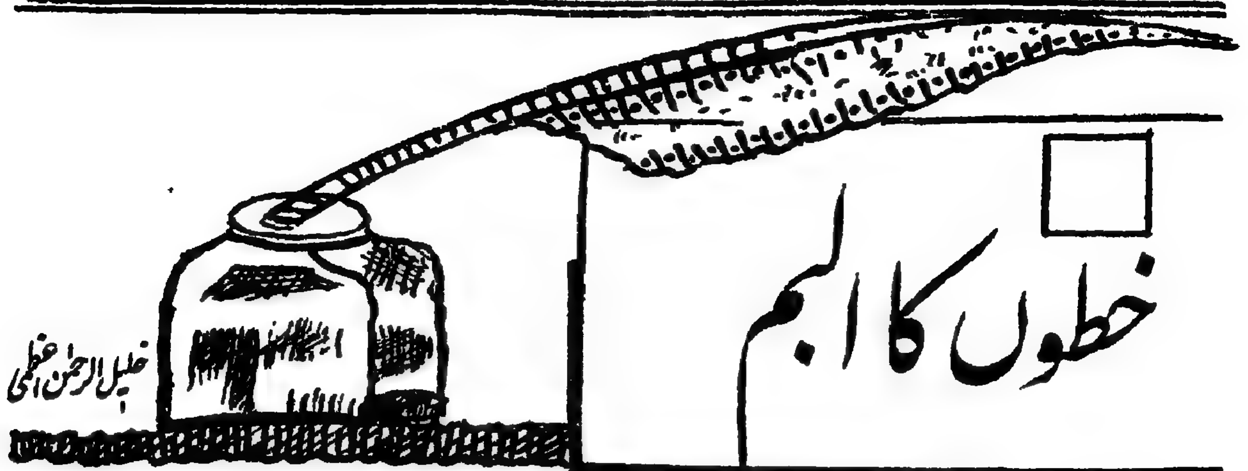
صفحہ ۳۹ پر ان کی زبان قینچی ہے جو کترم کترم چلتی ہے کی بجائے صرف کتر کتر چلتی ہے ہونا چاہیے۔

صفحہ ۸۴ دولھن بنا کر ڈولی میں ڈال دیں کی جگہ ڈولی میں بٹھا دیں ہونا چاہیے۔ صفحہ ۹۶ میں دن سے شام تک کی بجائے، صبح سے شام تک ہو جائے تو بہتر ہوگا۔ صفحہ ۱۰۲ پر گیند کو مذکر لکھا ہے حالانکہ مؤنث استعمال کرنا چاہیے۔ صفحہ ۱۰۳ پر البتہ جاتا ہوا کچھ رہ پیہ اپنے ساتھ لے لیا کی جگہ جاتے ہوئے ہونا چاہیے اسی صفحے پر اس نے ایک شخص کا قرضہ دینا ہے کی بجائے اس کو ہونا چاہیے

بہرحال ان خامیوں سے کتاب کی دلچسپی پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ بچے اس سے پورا پورا لطف اُٹھائیں گے اور ان کا کچھ وقت بڑی خوشی سے گذر جائے گا۔

بچوں کا تھیٹر

مصنفہ خان احمد حسین خاں۔ پبلشر رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور، کتابی سائز ضخامت ۱۶۰ صفحے۔ قیمت ۸ر۔ اس کتاب میں دس ڈرامے ہیں جو موضوع کے لحاظ سے تاریخی واقعات، روزانہ زندگی پر مشتمل ہیں۔ بچوں کے ادب میں ڈراموں کی کمی دیکھتے ہوئے فاضل مصنف کی کوشش قابلِ شکریہ ہے۔ اُمید ہے کہ بچے اس سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ کہیں کہیں زبان اور محاورے کی غلطیاں ہیں جو ہمیں امید ہے کہ نئے ایڈیشن میں دور کردی جائیں گی +



خطوں کا البم

خلیل الرحمٰن اعظمی

اچھا اب آیئے آپ کو اپنے البم کی سیر کرائیں۔ اس میں آپ کو ہر قسم کے خط ملیں گے بڑے طویل طویل بھی اور ایک دو سطروں کے بھی، بہر حال ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کام کی باتیں ہیں۔ میں آپ کو کہیں کہیں سے دو ایک جملے پڑھ کر سناتا ہوں۔ اس سے کچھ اندازہ ہوگا۔

سب سے زیادہ اس البم میں عبدالرحمٰن صاحب ناصر کے خطوط ہیں۔ آپ جامعہ ملیہ میں پڑھتے ہیں اور میرے ہم وطن ہیں۔ آپ تقریباً ہر ہفتے مجھ کو خط لکھتے ہیں۔ جس میں تعلیمی مشورے نئی خبریں، جامعہ کے حالات سب کچھ معلوم رہتا ہے۔

ایک خط اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

"خلیل! آج پندرہ تاریخ ہے مگر اب تک نہ تم نے خط لکھا، اور نہ میں نے۔ بتاؤ قصور میرا ہے یا تمھارا؟ مگر ہے تمھارا۔ اس لئے کہ تم چھوٹے ہو۔ اگر میں نے دیر کی تھی تو زیادہ انتظار کی کیا ضرورت تھی؟ تم خود بسم اللہ کر دیتے....."

پھر ایک دوسرے خط کا شروع کا حصہ پڑھیے۔

"خلیل آج کی ڈاک بہت سے خطوط اپنے ساتھ لائی۔ تمھارا، بھائی مستقیم کا، میاں امتیاز کا اور ابوسالم صاحب کا اور لطف تو یہ ہے کہ سب کے سب ایک ہی تاریخ کے لکھے ہوئے ہیں اس لئے آج سب سے زیادہ خوشی ہوئی۔"

دیکھئے کس سادگی سے خط شروع ہوتا ہے نہ طویل القاب و آداب ہیں نہ مشکل جملے، سیدھا سادا طرزِ تحریر ہے۔

پھر ایک دوسرا خط دیکھئے جامعہ جاکر پہلے پہل وہاں سے مجھے جامعہ کے حالات بتائے ہیں۔ خط کے شروع کا حصہ کچھ آپ بھی سن لیجئے۔

"خلیل! گاؤں چھوڑ کر آج جامعہ آئے ہوئے کئی دن ہوگئے۔ شاید تمھیں خیال ہو کہ میں

دیہات چھوڑ کر شہر آگیا ہوں۔ نہیں! میں اوکھلے میں رہتا ہوں۔ یہ ایک معمولی گاؤں ہے۔ اس گاؤں سے ملا ہوا میلوں لمبا چوڑا ایک میدان ہے جس میں ہماری یونیورسٹی ہے۔ اس بڑے میدان میں ہمارے مدرسے کی سُرخ و سفید عمارتیں کھڑی ہیں۔ کنارے کنارے پر ہرے بھرے کھیت لہلہا رہے ہیں۔ ان کھیتوں میں صبح سے لے کر شام تک دیہاتی لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ ان معصوم لڑکیوں کی گفتگو، بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بس یہی جی چاہتا ہے کہ سُنا کرے......"

اس طرح اس خط میں دو تین صفحوں میں وہاں کی حالت ہے، جس میں تعلیم کے متعلق اور وہاں کے لڑکوں اور اُستادوں سب کے بارے میں ہے۔ میں یہ خط جب پڑھتا ہوں تو جامعہ کا پورا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ حالانکہ جامعہ ابھی تک میں نے نہیں دیکھی۔

ایک خط ۱۴؍ اگست سنہ۱۹۴۰ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے آخری حصے میں جرمن لیڈی آپا جان کی گرفتاری کی خبر ہے۔

"آج ہماری آپا جان بھی گرفتار ہو گئیں۔ پانچ بجے شام کو ان کو الوداعی پارٹی دی گئی۔ اُن کے رخصت ہونے کا سماں عجیب درد انگیز تھا بچے گلے مل مل کر رخصت ہو رہے تھے اور آپا جان ایک حقیقی ماں کی طرح محبت کے آنسو بہا رہی تھیں"

پھر اس کے بعد اُلٹتے جائیے۔ ایک خط میں کچھ مشورے ہیں۔ چند سطریں آپ بھی سُن لیجیے:

"تم اپنے کو محض اس لئے کبھی بد قسمت نہ سمجھنا کہ تمہارا دامن دُنیاوی دولت سے خالی ہے ہاں اس وقت جب کہ تمہارے پہلوؤں میں کوئی درد مند دل نہ ہو اور زندگی کا مفہوم صرف کھانا پینا سمجھ بیٹھے ہو تو اس وقت یقیناً اپنے کو سب سے بڑا بد قسمت انسان سمجھنا......"

ایک مرتبہ مجھ کو غنچے کے سالگرہ نمبر میں ایک نظم پر انعام ملا۔ اس پر مبارکباد اس طرح دیتے ہیں۔

"غنچے کے کھیل کود نمبر میں تمہاری نظم دیکھی بہت خوش ہوا۔ اس لئے نہیں کہ پانچ روپیہ انعام ملے۔ یہ تو ہاتھوں کا میل ہیں۔ خوشی اس بات کی کہ "اوّلیت" کا سہرا تمہارے سر رہا جو کسی قیمت پر بھی نہیں خریدا جا سکتا۔ مبارکباد قبول کرو......"

اچھا اب ایک خط سیاہ حاشیوں والا دیکھئے۔ یقیناً یہ ماتمی خط ہے۔ ایک نوجوان اور ہونہار دوست کے انتقال پر ہم لوگوں کو بے حد رنج ہوا۔ اس پر یوں تسلی دیتے ہیں

"خیر جانے والا جا چکا۔ اب ہم اپنے

آنسوؤں سے اس کی قبر کو ٹھنڈک نہیں پہنچا سکتے اس کی روح تو اس وقت خوش ہوگی جب اس کے ساتھی اس کے ارادوں کو زیادہ سے زیادہ عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں گے اور پھر اس دن اس کی خوشی کا کیا عالم ہوگا۔ جب اس کو معلوم ہوگا کہ باقی رہنے والوں نے جانے والے کے ارادوں کو پورا کر دیا ...."

ایک کتاب پڑھ کر لکھتے ہیں:-

"جب تم اس کتاب کو پڑھوگے تو تمھیں معلوم ہوگا کہ تم اپنے گاؤں کا کوئی واقعہ پڑھ رہے ہو........."

پھر ایک خط میں اس طرح مشورہ دیتے ہیں:

رسالوں اور اخباروں سے دلچسپی رکھنا عام معلومات کے لئے بہت ضروری اور مفید ہے مگر یہ خیال رہے کہ توجہ اپنے اصلی مقصد سے ایک انچ نہ ہٹنے پائے۔"

غرض اسی طرح کے مفید اور دلچسپ خطوط کا ایک مجموعہ ہے۔ اب آپ اگر اکتا گئے ہوں تو دوسرے ورق الٹئے۔ ان خطوں میں سے چند مختصر جملے نقل کرکے اب مضمون ختم کردوں گا

"میری دلی خواہش ہے کہ آپ لوگ کلاس میں ممتاز نمبروں سے پاس ہوں چاہے اس کے لئے تھوڑی سی مضمون نگاری اور شاعری کم ہی کیوں نہ کر دینی پڑے ...."

(عبد اللطیف اعظمی)

ایک طالب علم کے لئے دوستوں کی زیادتی بہت نقصان دہ چیز ہے۔"

(محمد یوسف صلاحی)

ایک عزیز دوست چند باتوں سے ناراض ہوکر لکھتے ہیں:-

"بھائی خلیل! تہذیب کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ مجھے آپ کی باتوں سے جو تکلیف پہنچی وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ بہر حال آج اسکول کا آخری دن ہے۔ ایسی حالت میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ کسی سے ناراضگی کا اظہار کروں۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہونا چاہئے کہ میں یہ خط کسی خفگی سے نہیں بلکہ دوستانہ طریقے سے لکھ رہا ہوں ...."

(دیان خاں)

"میں اس اسکول میں تیسرے ہی درجے سے پڑھتا ہوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جہاں تک ہوسکے ہمیں دوستوں کی تعداد کم رکھنی چاہئے صرف دو قسم کے لڑکوں سے دوستی ہو ایک وہ جو پڑھنے میں اچھے ہیں اور وہ جو اخلاقی لحاظ سے اچھے ہیں۔"

(مرزا اسلم بیگ)

بھئی خلیل! مزے میں تو ہو۔ میرا کیا کہنا بالکل بے کاری کی حالت ہے۔ سوچا لاؤ تمھی سے کچھ بات چیت کرؤں۔ ہاں ذرا اکبر کی وہ نظمیں سُنانا جو تم اکثر سنایا کرتے تھے۔ مجھ کو تو بھول گئے" کے کچھ اشعار یاد ہیں اور انھی کو گنگنایا کرتا ہوں۔ تم ذرا سب اشعار نقل کرکے بھیج دو تو اس چھٹی میں طبیعت بہلے۔"

(اختر انیس)

"آپ کا عید کارڈ ملا اور بے اختیار ایک شعر زبان پر آگیا۔ اب مت کہنا کہ تم شاعر نہیں ہو۔ اچھا شعر سُنئے۔

غریبی میں یہ کس نے عید کا مژدہ سنایا ہے
ہنسی کی آڑ میں رونے کو کس نے گدگدایا ہے

ایوب ظفر

کہو بھائی خیریت سے تو ہو۔ پڑھائی لکھائی کا کیا حال ہے؟ تمھاری کہانی غنچے کے پچھلے پرچے میں شائع ہو چکی ہے۔ ذرا ۲۴ فروری کے غنچے کے صفحہ ۳ کے مضمون "انمل بے جوڑ" کو غور سے دیکھ لینا۔ مجھے اس قسم کے انمل بے جوڑوں کی سخت ضرورت ہے۔ اس لئے جتنے تمھیں یا تمھارے دوستوں کو یاد ہوں لکھ کر بھیج دو۔ میں بے چینی سے تمھارے جواب کا انتظار کرؤں گا۔ بھولنا مت!"

(شاغل فخری)

اوپر کے خطوط کو پڑھ کر آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ آپ ہر خط سے اسی قسم کے اخلاقی، ادبی اور دلچسپ باتوں اور جملوں کو چھانٹ سکتے ہیں اور اُن سے لُطف اُٹھا سکتے ہیں۔ میں تمام پیامی بھائیوں کو مشورہ دوں گا کہ اپنے "جیب خرچ" کا کچھ حصہ بجائے بیڑی اور سگریٹ کے اس مفید مشغلے پر خرچ کریں۔



جہاز

شجاع احمد قائد

سرور۔ اچھا تو شروع کرو۔

قاسم۔ ہاں تو ہمارا مزے دار قافلہ جہاز پر سوار ہونے کے لئے تیار تھا اور سامنے ہی پہاڑ جیسا جہاز کھڑا ہوا تھا۔ کیا پوچھتے ہو اس وقت کا سماں، کوئی تو گلے مل مل کر رو رہا تھا، کوئی ہنس ہنس کے گلے کا ہار بنا جا رہا تھا۔ کوئی باتوں میں ایسا لگا ہوا تھا کہ سر پر سے ٹوپی بھی کوئی اتارے تو خبر نہ ہو۔ کوئی دھوکے کھا رہا تھا کوئی کھانا۔ کوئی اپنے دوستوں کو لیکچر پلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کسی پر پھولوں کے ہار اس طرح لادے جا رہے تھے جیسے کسی تھیلے میں آٹا بھرا جا رہا ہو۔

سرور۔ واہ بھئی واہ، خوب------ اچھا جنہیں ہار پہنائے جا رہے تھے یہ کون تھے؟

قاسم۔ انسان۔

سرور۔ (ہنستے ہوئے) یہ تو میں بھی جانتا ہوں مگر------ اچھا پہنانے والے۔

قاسم۔ یہ بھی انسان ہی تھے۔

سرور۔ خوب۔

قاسم۔ اس کے بعد جب سب لوگ جہاز پر بیٹھ گئے اور جہاز نے رینگنا شروع کیا تو پھر جناب جھنڈے اور جھنڈیاں لہرانے لگے۔

سرور۔ جھنڈے جھنڈیاں کیسے؟

قاسم۔ جہاز پر جو لوگ بیٹھ چکے تھے ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے عزیزوں، دوستوں اور ملاقاتیوں کو خدا حافظ کہہ رہا تھا اور اپنی اپنی چھوٹی بڑی سفید اور رنگ برنگی دستیاں ہلا رہا تھا اور اس کا جواب ادھر سے بھی لوگ دے رہے تھے۔

سرور۔ اچھا یار قاسم ہم نے تو سنا ہے کہ جہاز پر بیٹھنے کے بعد بھوک بڑے زناٹے سے لگتی ہے۔

قاسم۔ ہاں ہم لوگوں کا تو دن رات بکریوں کی طرح منہ چلتا رہتا تھا

سرور۔ (تعجب سے) بکریوں کی طرح۔
زاہد و ساجد۔ (ذرا دور سے ہنستے ہوئے)
نہیں بیلوں کی طرح۔
سرور۔ یہ کون ---------
قاسم۔ زاہد و ساجد ہیں۔
زاہد۔ (ہنستے ہوئے) انسانوں میں بیل بکری گیٔے۔
سرور۔ تم نے تو یار سارا مزا کرکرا کر دیا۔ قاسم
جہاز کے سفر کا حال بیان کر رہے تھے اور تم
زاہد۔ اچھا یہ بات ہے۔ معاف کرنا بھائی
سرور۔ ہاں! قاسم، پھر کیا ہوا؟
قاسم۔ میں کہہ رہا تھا ------ ہاں ٹھیک ہے
تو ہم سب کے سب جُگالی کرتے پھر رہے تھے
اچھلتے، کودتے، ہنسے، بولتے ------
ساجد۔ ہوائیں تو ایسی چل رہی تھیں کہ اگر برسوں
کا بیمار بھی ہو تو منٹوں میں اچھا ہو جائے...
قاسم۔ اور سمندر کی وہ بہار۔ سامنے سے گزرتے
ہوئے دوسرے جہازوں کا نظارہ بس ایسا
معلوم ہوتا تھا کہ جیتے جاگتے شہر سمندر میں
تیر رہے ہیں۔
زاہد۔ اور چھوٹے چھوٹے جزیرے
قاسم۔ جزیرے تو ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی
بڑی سفید سلوٹیں پڑی ہوئی چادر پر تھالیاں
رکھی ہوئی ہیں۔ ہم لوگ عرشے پر بھی تفریح
اور چہل قدمی کے لئے جاتے تھے۔ وہاں کا
حال تو کچھ ساجد کو معلوم ہے۔
سرور۔ اچھا تمھارے جہاز کے اندر کیا کیا تھا؟
قاسم۔ سبھی کچھ۔ کتب خانہ۔ کھیلنے کے لئے میدان
اور تمھیں کیا کیا بتائیں۔ بس ایک اچھا
خاصا شہر معلوم ہوتا تھا
زاہد۔ سرور رات میں کھانے کی میز پر تو بڑا مزا
آتا تھا، ہم تو خوب کھاتے تھے۔
ساجد۔ کھانے تو ایسے مزے دار کہ بس انگلیاں
کاٹ کاٹ کے کھا جانے کو جی چاہتا تھا۔
سرور۔ جہاز میں کھانا میزوں پر کھایا جاتا ہے۔
ساجد۔ ہاں، عمدہ عمدہ کھانے، چینی کی پیاری
پیاری پلیٹیں اور پھر کھانے والے تو بس
کچھ پوچھو مت۔
قاسم ہر ایک اپنی کرسی پر اپنا اپنا کانٹا
چمچہ سنبھال کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ڈھال
تلوار لے کر لڑنے کے لئے میدان میں کود
پڑا ہو۔
(سب ہنستے ہیں)
زاہد۔ اور ہاں لیڈیاں تو اس طرح سے زیور
وغیرہ پہن کے بیٹھتی تھیں کہ --------
قاسم۔ بجلی کی روشنی میں زیور ایسے جگمگاتے تھے
کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔

ساجد۔ اور اس کا حال تو بیان ہی نہیں کیا۔
قاسم۔ کس کا
ساجد۔ اس لیڈی کا جو نکلس اور ....
قاسم۔ ارے ہاں خوب یاد دلایا بھئی۔
سرور۔ وہ کون ؟
قاسم۔ ایک لیڈی صاحبہ کو زیوروں کا بہت شوق تھا۔ مگر شاید ملتے نہیں تھے، اتفاق سے ایک انگوٹھی اُن کے ہاتھ لگ گئی تھی اس بُری طرح ہاتھ چلا چلا کر باتیں کرتی تھیں کہ بس ماری ہی تو بیٹھیں گی۔ عمر کوئی ستر، اسّی برس کی تھی۔ بالکل بوڑھی پھوس، پلکیں تک سفید اور چہرے پر جھریاں اتنی جیسے کسی نے ہل چلا دیا ہو، نہ مُنہ میں دانت، نہ پیٹ میں آنت۔
سرور۔ مگر یار آج کل تو تیس چالیس کی عمر ہونا مشکل ہے۔
قاسم۔ ارے بھائی وہ وقت پر کھاتی تھیں۔ وقت پر سوتی تھیں، پھر ہر بات کا وقت مقرر، ہر کام بنا تُلا۔ اسی وجہ سے اُن کی صحت بھی اتنی اچھی تھی کہ دیکھ کر مُنہ میں پانی بھر آتا تھا، ہم لوگ تو ہمیشہ کے بیمار کہیں زکام کہیں کھانسی کہیں بخار کہیں نزلہ کہیں ....
زاہد۔ اور ایک صاحب بہادر نوابے تھے جن کو صبح سے شام تک اپنی ٹائی درست کرنے ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی۔
ساجد (ہنستے ہوئے) ارے ہاں میں تو ان کو جب دیکھتا تھا وہ اپنے ہاتھوں اپنی گردن ناپتے دکھائی دیتے تھے۔
قاسم۔ اور پھر مزا تو یہ تھا کہ کنکھیوں سے یہ بھی دیکھتے جاتے تھے کہ کوئی اُن کو اس حالت میں دیکھ تو نہیں رہا ہے۔
سرور۔ بھلا کوئی ایسی چیز کو بلا دیکھے کیوں چھوڑ دے گا۔

(ہنستے ہیں)

زاہد۔ (زور سے ہنستے ہوئے) اچھا اور وہ سیٹھ ہزاری لال
ساجد۔ وہ تو بس نمائش میں رکھنے کے قابل تھے۔
سرور۔ وہ کون حضرت تھے ؟
ساجد۔ ہنسلنے والی مشین۔
سرور۔ خوب، آخر خوبی کون سی تھی اُن میں۔
زاہد۔ دُنیا بھر کی ساری خوبیاں ان میں موجود تھیں اور چلتے وقت تو واہ واہ
قاسم۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک غبارہ زمین پر اُڑتا چلا جا رہا ہے۔

(سب ہنستے ہیں)

سرور ۔ (ہنستے ہوئے) زمین پر غبارا اُڑتا ہوا...... خوب

قاسم ۔ ایک مرتبہ تو بے چارے گرتے گرتے بچے ۔

سرور ۔ ارے توبہ ایسا مٹاپا......

زاہد ۔ ہم لوگ سب کے سب کھڑے کھڑے ہنس رہے تھے اتنے میں ابا جان نے بلالیا ۔ ہم چلے گئے ۔

زاہد ۔ اس سفر کا ایک واقعہ تو بہت ہی ناگوار تھا ۔

سرور ۔ کون سا ۔

زاہد ۔ عدن میں جب ابا اُترے تو بعض بعض جگہ رونے لگے ۔

سرور ۔ کیوں کیوں ۔

ساجد ۔ وہاں کے حالات دیکھ کر ۔

قاسم ۔ اور جزیرہ سسلی دیکھ کر بھی ۔

زاہد ۔ ہاں ، ہاں رات میں ابا جان سوتے سوتے اُٹھ بیٹھے ۔

قاسم ۔ ہماری بھی آنکھ کھل گئی ۔ اور تم بھی تو تھے ساجد ۔

ساجد ۔ ہاں ہم اور زاہد دونوں تھے ۔

قاسم ۔ جب اپ نے جزیرہ سسلی دیکھا اور رونے لگے تو ہم نے پوچھا کیوں ابا جان کہنے لگے مجھ سے کیا پوچھتے ہو ، یہ خود ایک ورق ہے

پڑھ لو ، اسی میں سب کچھ لکھا ہے ۔

سرور ۔ جزیرہ سسلی وہ جس کے متعلق علامہ اقبال نے بانگ درا میں ایک نظم لکھی ہے ۔

قاسم ۔ ہاں ہاں وہی ؎

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

ساجد ۔ زاہد ، غوطہ خوروں کا قصہ تو سناؤ

زاہد ۔ ارے ہاں وہ تو بڑا دلچسپ قصہ ہے ۔

قاسم ۔ غوطہ کھانے والے تو بس کمال ہی کرتے ہیں

سرور ۔ کیا کمال ؟

زاہد ۔ بس ایک چونی ، دونی یا اکنی دریا میں پھینک کر دیکھو اُن کا تماشا ۔

سرور ، کیا تماشا ۔

ساجد ۔ بس اِدھر تم نے پھینکی اور اُدھر انھوں نے تیزی سے ڈبکی لگائی اور تھوڑی دیر میں اوپر ۔

سرور ۔ اور جو کچھ پھینکا تھا وہ ان کے ہاتھ میں

زاہد ۔ ہاں ۔

سرور ۔ خوب ۔

ساجد ۔ اور وہ فوٹو کیمرہ ۔

زاہد ۔ ارے ہاں بھئی وہ تو بس کچھ نہ پوچھو

(ہنستے ہیں)

(باقی آیندہ)

آگرے کی سیر

علی گڑھ میں دو دن

انوار العمر ابتدائی ششم

۲۲ مارچ ۱۹۶۳ء جمعرات کے دن ہمیں علی گڑھ پہنچنا تھا۔ ۲۱ مارچ ۱۹۶۳ء بروز جمعہ کو سرکس دیکھنے اور سامان خریدنے کے بعد رات کے ۱۲½ بجے جامع مسجد پر کھڑے یہ سوچ رہے تھے کہ ہم لوگوں کو اپنی جائے قیام جانا چاہیئے یا تاج گنج .... آج کا پروگرام بھی یہی تھا کہ تاج پر چل کر کھانا کھائیں گے۔ چنانچہ ہم سب جناب اکرام صاحب کے ساتھ تانگوں پر تاج محل پہنچے۔ وہاں پہنچ کر نیند اور تھکن دونوں رفو چکر ہو گئیں۔ چاندنی رات میں کسی طرح اس کو دیکھنے سے طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ ساری رات یہیں گذار دیں لیکن چوکیدار کے تقاضے کی وجہ سے باہر آنا پڑا باہر آئے۔ تو جناب احمد علی صاحب کھانا لے کر آرہے تھے۔ کھانا کھایا اور تاج گنج سے اپنی جائے قیام کی طرف روانہ ہوئے۔ اس وقت ۲½ بجے تھے اور ۵ بجے اٹھ کر علی گڑھ پہنچنے کی تیاری کرنی تھی۔ میرا دل اس وقت علی گڑھ جانے کو نہ چاہتا تھا مگر پروگرام کے مطابق چلنا تھا اس لئے ایک گھنٹہ سو کر اُٹھے۔ بستر تہ کیا۔ سوٹ کیس میں سامان رکھا اور اپنے اس مختصر سے سامان کو تانگے میں رکھ کر آگے بڑھا اور بیری کے درخت سے جو اس وقت میری طرح خاموش کھڑا تھا، سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں میں لطافت نہ تھی۔ سامنے جھاڑیوں کے کنج میں سے اعتماد الدولہ، سکندرہ، قلعے کی عمارتیں، فتح پور سیکری اور خاص طور پر تاج محل کی خیالی تصویر دردناک آواز کی طرح لرزاں اور دھوئیں کی طرح پریشان نظر آتی تھی۔ میں اس وقت اپنے خیالات میں محو تھا کہ ایک دم سے بہت تیز آواز آئی "سب لڑکے قطار بنا کر کھڑے ہو جائیں"۔ میں یکایک اچھل پڑا اور قطار میں آکر کھڑا ہو گیا۔ سب لڑکوں کو تھوڑا تھوڑا سامان دے کر اسٹیشن چلنے کو کہا گیا۔ اس وقت غالباً ۵½ بجے ہوں گے۔ ہم

اسٹیشن کو روانہ ہوئے اور دس پانچ منٹ میں اسٹیشن پہنچ گئے۔ چاروں طرف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ اس وقت ستارے ہم کو طنز یہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور ہمارے دلوں کی کبیدگی میں اضافہ کر رہے تھے۔ تمام سامان تانگے سے اتار کر پلیٹ فارم پر لے گئے۔ گاڑی آئی تو جلدی سے سامان لے کر آگے کی طرف دوڑے۔ پہلا ہی پھیرا کیا تھا کہ انجن نے سیٹی دی، جلدی سے دوڑ کر سامان کی جگہ واپس آئے اور اپنے سامنے والے ڈبے میں بقیہ سامان جلدی سے پھینک کر بیٹھ گئے۔ ریل چل دی۔ تھوڑی دور چل کر ہرے بھرے کھیت نظر آنے لگے۔ کھڑکی میں سے سر نکال کر آسمان کی طرف دیکھا تو چاند ابھی چھپا نہ تھا۔ کھیتوں کو دیکھا تو چاندنی کھرے کی چادر اوڑھے زمین پر سسک رہی تھی۔ پھول اور پودے سر جھکائے امید اور خوف سے بے قرار ہو ہو کر گویا اس کی چھاتی پر ہاتھ رکھتے تھے یا اس کے ٹھنڈے جسم پر ہاتھ پھیرتے تھے اور آنسوؤں کی دو بوندیں گرا کر پھر المناک نگاہوں سے تاکنے لگتے تھے۔ میں یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ آنکھیں بند ہو گئیں۔ ذرا دیر بعد آنکھیں کھلیں۔ اس وقت اونگھتے ہوئے دیکھا کہ صبح کے تارے جھلملا رہے تھے۔

۵ منٹ کے بعد نیند کا غلبہ دور ہوا۔ صبح کے سہانے وقت کا لطف اٹھانے کے لئے پھر ہوشیار ہوا اور کھڑکی سے منہ نکال کر آسمان کو تکنے لگا۔ تارے ابھی جھلملا رہے تھے۔ اس وقت مشرق کی روشنی پر نظر ڈالی جو رات بھر کے چمکے ہوئے تاروں پر غالب آتی جاتی تھی۔ درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ کسان لوگ اپنے اپنے ہل کندھوں پر رکھ کر کھیتوں کی مینڈوں پر جا رہے تھے۔ اور زمین کی فیاضیوں کو مسرت اور خوشی کی نظر سے دیکھتے جاتے تھے۔ بسنتی رنگ کے کھیت ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے چلنے سے لہرا رہے تھے۔ نظر اس خوش گوار سبزے پر عجب لطف کے ساتھ کھیلتی ہوئی دور تک چلی جاتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے پودے جو خدا کی طرف سے دنیا والوں کی روزی لے کر آئے ہیں کس قدر شگفتہ اور بشاش نظر آتے تھے۔ ان کو رات کا برقعہ اڑھا کر آسمان نے اور بھی خوب صورت بنا دیا تھا...... تاروں کی چھاؤں میں اسی وقت ان کی نازک اور چھوٹی چھوٹی پتیوں پر شبنم کے موتی جھلک رہے تھے........

جب پو پھٹی تو آفتاب کی کرنیں آہستہ آہستہ کنارۂ افق سے اوپر کو چڑھتی نظر آتی تھیں۔ ان کرنوں نے ڈبے میں آکر ہمارا بھی خیر مقدم کیا

تھوڑی دیر بعد سورج بلند ہوا اور دنیا کو روشن کر دیا۔

وہ سبزہ زار، وہ سہانا سماں، وہ صبح کی بہار، وہ تروتازہ ہوا، اور وہ اُجلی کرنیں ایسی رفیقِ سفر بنیں کہ دل سے آگرے کا خیال بھلا دیا۔ علامہ اقبال نے اسی قسم کے سفر میں یہ شعر کہا تھا ؎

رنگین کیا سحر کو بانکی دُلھن کی صورت
پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی

میری طرح میرے ہم سفر بھی قدرت کی ان نیرنگیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ گاڑی رکی معلوم ہوا کہ ہم ٹونڈلہ اسٹیشن پر ہیں۔ یہاں گاڑی تقریباً ایک گھنٹہ ٹھیری۔ جب اس کے چلنے کا وقت ہوا تو ہم بیٹھ گئے۔ ریل آگے چلنے کی بجائے اسی لائن پر پیچھے کو چلی۔ تھوڑی دور چلنے پر معلوم ہوا کہ لائن بدلی ہے۔ ایک دو اسٹیشن چھوڑنے کے بعد ناشتے کا وقت آگیا۔ آج کے ناشتے کے لئے کل رات بازار سے پیٹھا اور دال بھیجی خریدی تھی تھوڑی دال بھیجی اور تھوڑا پیٹھا نکال کے کھایا ایک دو اسٹیشن اور چھوڑنے کے بعد جب گاڑی ایک اسٹیشن پر رُکی تو اُن لڑکوں کو جو دوسرے ڈبے میں سوار تھے۔ ناشتہ پہنچایا۔ غرض ان دلچسپ نظاروں سے لطف اندوز ہوتے۔ دس بجے کے قریب علی گڑھ پہنچے۔ جناب اکرام صاحب نہ جانے کس اسٹیشن سے اُتر کر کھوئے ہوئے بستر کی تلاش میں واپس آگرے چلے گئے تھے۔

(باقی پھر)

نانی امّاں



از احمد حسن　　آگرہ

ایک دن کا ذکر ہے۔ جاڑوں ہی کا زمانہ تھا نانی امّاں نے اپنا ایک پرانا صندوق کھولا۔ اس صندوق کو وہ بہت کم کھولتی تھیں۔ ہم لوگ گھر کے بچے حسبِ عادت جمع ہوگئے۔ میری نظر صندوق کے خانے پر پڑی اہا ہا وہاں تو چند تصویریں تھیں موٹی موٹی دفتیوں پر چپکی ہوئی۔ چھٹن آپا، صندوق میں سے نانی امّاں کے حسب الحکم کپڑے نکال رہی تھیں۔ میں نے تصویریں اچک لیں۔ چھٹن آپا نے نانی امّاں سے شکایت کردی "نانی امّاں دیکھئے، چھوٹے میاں نہیں مانتے نہ معلوم کون سی چیز لے گئے"۔ چھٹن آپا کو دیکھنے کا خود شتیاق تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر ہم لوگوں کے گروہ میں آگئیں اور تصویریں دیکھنے لگیں...... کسی نوجوان لڑکی، خوب صورت لڑکی کی تصویریں تھیں۔ مگر ایک تصویر کسی انگریز لڑکی کی تھی کھنچے تنگ سایے میں مگر پہلی لڑکی سے بالکل مشابہ ایسا لگتا تھا کہ ایک ہی لڑکی نے قدیم لباس اور انگریزی لباس میں تصویر کھنچوائی ہو۔ ہم لوگ تصویر دیکھنے میں محو تھے۔ نانی امّاں پکار رہی تھیں "چھٹن ارے چھٹن کہاں گئیں بولتی نہیں؟" وہ ٹٹولنے لگیں چھٹن آپا کو۔ مگر وہ وہاں کہاں۔ پھر بولیں "کیا تم بھی بچوں میں بچہ بن گئیں ارے کیا چیز لے گئے یہ لوگ؟ ربن؟" انھوں نے امّی جان کو پکارا اور جلدی سے چھٹن آپا نے کہا "میں ذرا تصویریں دیکھ رہی تھی۔ آپ کے صندوق سے نکلی ہیں کس کی ہیں؟" نانی امّاں نے منہ بنایا۔ کچھ سوچا اور پھر مسکرائیں۔ جس طرح ایک عمر رسیدہ کو مسکرانا چاہیے۔ اور کہا "میں جب ۱۶ برس کی تھی تب تمھارے نانا نے (ہمارے نانا کے بھائی) میری تصویریں لی تھیں۔" آپا نے پوچھا "اور یہ سایے میں کون ہے نانی امّاں؟" "وہ بھی میری تصویر ہے۔ لاؤ ادھر لاؤ میں احتیاط سے رکھ دوں۔ تم لوگ خراب کردوگے۔" "نہیں بھائی جان نے کہا" ہم ان کو ان لارج کرکے فریم

میں لگا کر نشست گاہ میں لٹکائیں گے۔" ارے آپ سایہ بھی پہنتی تھیں؟" بجیہ اور میں نے ایک زبان ہوکر..... "پھر نانی اماں نے اس سے متعلق ایک کہانی سُنائی جس کا ذکر یہاں مناسب نہیں۔

عید کے دن بڑی مسرت ہوتی۔ جب نانی اماں زندہ تھیں، وہ سب کو عیدی دیتیں بہت سی۔ عید ہی کے قریب ان کے گاؤں کی مال گذاری آتی تھی۔ نانی اماں اپنی بنائی ہوئی ترکیبوں سے کلچے عید کے دن اور سویاں بقرعید کے دن پکواتی تھیں اور اگر ہمارے ماموں جان، ممانی جان، اور ماموں زاد بہنیں، عید، بقرعید یا رمضان میں ہوتے تو پھر تو مزے سے کٹتی۔ آئے دن مولوی صاحب سے چھٹی لی جاتی۔ کون پڑھتا۔ سیر سپاٹے ہوتے۔ طرح طرح کے کھیل ہوتے۔ ہنڈکلیا پکتی نانی اماں گڑیوں کے لئے اپنی تلے دانی میں سے کترنیں نکال کر دیتیں اور بجیہ، اپیا وغیرہ اور چھٹن آپا بھی شریک ہوکر گڑیا کے کپڑے سیتیں پھر ایک بات اور تھی۔ نانی اماں ہم لوگوں سے خط لکھواتیں اور لکھائی کی اُجرت دیتیں۔ تب کارڈ دو پیسے اور لفافہ ایک آنے کا تھا۔ وہ اچھے پرانے دن تھے۔ پہلے ان کی محرر خاص چھٹن آپا تھیں۔ پھر بھائی جان، پھر بجیہ اور سب سے آخر میں میری باری آتی تھی۔ جب میں خط لکھتا تو وہ

بغیر کسی دوسرے کو دکھائے ڈاک میں ڈالا جاتا تھا۔ غلطیاں جو اس میں ہوتی تھیں بہت سی۔

نانی اماں کو کھانے کے وقت پنکھا جھلنا حمید کی ماں کا کام تھا۔ مگر ہم لوگوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور اپنی خوشی سے پنکھا جھلتا۔

قرآن شریف پڑھنا شروع کیا۔ چھٹا پارہ ختم کیا۔ نانی اماں گو کہ تین حج کر آئی تھیں اور نماز روزے کی سختی سے پابند تھیں۔ مگر...... ایک دن اُن سے میں نے جا کر کہا۔ "نانی اماں آج ہم نے پڑھا ہے اَلْقَارِعَةُ مَا الْقَارِعَةُ .... " میرا یہ سنانا تھا کہ نانی اماں نے کہا "القارعتہ ما القارعتہ، چلتی بندریا کو مارا" اور ہنسیں۔ اس زمانے میں قرآن شریف کی اس قدر عزت دل میں نہیں تھی۔ سُنا اور دہرانے لگے۔ چیخ چیخ کر پڑھنا شروع کیا۔ امّی نے سُنا ایک تھپڑ مُنہ پر رسید کیا اور پوچھا کہ کس نے بتایا۔ میں نے بڑے فخر سے اکڑتے ہوئے کہا "نانی اماں نے" امّی اسی وقت نانی اماں کے پاس گئیں اور کہا "خالاجی آپ ایسی بات بچوں کو مت سکھایا کیجیے" ...... اور نانی اماں مسکرا دیں اس طرح جس طرح کہ "ایک عمر رسیدہ آدمی کو مسکرانا چاہیے"، اُنھوں نے کہا "ربن تم چھوٹی سی تھیں، تو تم بھی ایسی حرکتیں کرتی تھیں۔ ایک دن نانی اماں نے یہ بھی بتایا

تھا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ لائی کہارا کاٹیں نیم۔ اس پر بھی مار پڑی تھی۔ اور ایک دن تو غضب ہی ہوگیا تھا۔ خالق باری وہی خالق باری امیر خسرو نے جو لکھی تھی اس کے شعر میں ملا ملا کر پڑھنا شروع کیا اور نامہ خالق باری سرجن ہار ..... اور رسول پیغمبر جان بسیٹھ۔ کُتیا لے گئی ٹانگ گھسیٹ۔

جب کبھی مجھ پر مار پڑتی میں نانی اماں کے پاس چلا جاتا اور وہاں مجھے امان ملتی۔ اور اگر مار پڑ چکی ہوتی تو نانی اماں اچھی اچھی چیزیں کھانے کو دیتیں۔ گرمی کے دنوں میں خربوزے۔ جاڑوں میں حلوہ فرخ آباد کا سوہن حلوہ اور میوہ خشک، امی جان کہتیں مجھے نانی اماں نے خراب کیا ہے۔ مگر مجھے اپنے میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ بالکل ویسا ہی تھا جیسے اور لوگ۔ مگر بکی زیادہ اور بہت زیادہ بکواس کرتا جس کی وجہ سے پٹ جاتا اور لوگ چپکے رستم تھے۔

نانی اماں کو چھوٹے کئی سال ہوگئے تھے، میں اکتوبر کے سہانے دنوں میں لکھنؤ میں بیمار پڑا تھا۔ بھائی بہن۔ بچپن کے دوست جواب سمجھ دار ہوگئے تھے پاس بیٹھے تھے۔ نانی اماں کا ذکر ہو رہا تھا۔ وہ بیمار تھیں۔ کیا بیمار تھیں یہ نہیں معلوم! بڑھاپے کی بیماری تھی۔ کل ہی خط آیا تھا کہ طبیعت اچھی نہیں ہے۔ ۸۹ برس کا سن بھی ہوگیا تھا۔ ہم لوگ باتیں کر رہے تھے کہ ڈاکیے نے آواز دی "خط لے جاؤ" خط آیا۔ کارڈ تھا۔ چھٹن آپا نے دیکھا۔ چہرہ فق ہوگیا۔ وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔ "کس کا خط ہے؟" میں نے نحیف آواز میں پوچھا وہ معاملہ فہم تھیں، جانتی تھیں کہ موت کی خبر کسی بیمار کے سامنے نہیں بیان کرتے۔ میں ایسا بھی ناسمجھ نہ تھا۔ آپا کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اپنا منہ تکیے میں چھپا لیا۔

پیام برادری

پیاری بچیو اور بچو، خوش رہو اور تندرست۔ اب تو موسم بہت خوش گوار ہوگیا ہے۔ اکتوبر کا مہینہ بھی ختم ہوگیا۔ ہلکا گلابی جاڑا پڑ رہا ہے۔ تم بھی خوب خوش و خرم ہوگے اور پڑھنے لکھنے میں مصروف۔

پچھلے مہینے بھی روس اور اٹلی لڑائی کے دونوں میدانوں میں اتحادیوں کی فتح رہی۔ جرمنی روس میں برابر پیچھے ہٹ رہا ہے۔ ابھی ابھی کچھ دن ہوئے روسیوں نے جرمنی سے کیو چھین لیا۔ یہ جرمنوں کا بہت اہم مقام تھا۔ غالباً ان سردیوں تک روسی اپنا سارا چھنا ہوا ملک واپس لے لیں گے۔ اکتوبر میں ماسکو میں ایک کانفرنس بھی ہوئی تھی۔ اس میں انگلستان، روس اور امریکہ کے نمائندوں نے لڑائی کے بارے میں اہم مشورے کئے۔ کہتے ہیں یہ کانفرنس بہت کامیاب رہی۔ یہ نہ معلوم ہوسکا کہ کون کون سی بنیادی باتیں طے ہوئیں۔ مارشل اسٹالن نے ریڈیو میں ایک تقریر بھی براڈکاسٹ کی ہے۔ اس تقریر میں اس نے اپنی فتح مندیوں کا ذکر کیا ہے۔ صحیح معنوں میں جرمنی کے خلاف لڑائی کا دوسرا میدان قائم کرنے کی ضرورت ظاہر کی ہے اور بتلایا ہے کہ لڑائی کے بعد اتحادیوں کا اہم کام یہ ہے کہ یورپ کے چھوٹے چھوٹے ملکوں کو جرمنی کی غلامی سے آزاد کرائیں۔ انھیں اپنی مرضی کے مطابق اپنے ملک کے انتظام کرنے کا موقع دیں۔ لڑائی کے مجرموں کو سخت سزا دیں۔ جرمنی کو اس قابل نہ رکھیں کہ وہ دوبارہ دنیا کو مصیبت میں مبتلا کرے۔

ادھر اٹلی میں بھی جرمنی برابر پیچھے ہٹ رہا ہے۔ اتحادی فوجیں روم سے قریب تر آتی جارہی ہیں۔ روم پر ہوائی حملے بھی شروع ہوگئے ہیں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اٹلی میں جرمنی ابھی جم کر لڑنا نہیں چاہتا ہے۔ مارشل بدولیو کی حکومت پورے طور پر انگریزوں کے ساتھ ہے۔ بدولیو حکومت کے کمانڈر انچیف نے بھی اس بات کا اعلان کر دیا ہے۔

بحرالکاہل میں امریکن اور چینی فوجیں جاپانیوں کو برابر پریشان کر رہی ہیں۔ بعض انگریز سیاست دانوں کا خیال ہے کہ جاپان میں لڑائی کا سامان برابر کمی پر ہے۔ اس کے مقابلے میں اتحادی اپنا سامان تیزی سے بڑھا رہے ہیں۔ ہندوستان سے برما پر حملے کی تیاریاں مکمل ہو رہی ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا کمانڈ کے کمانڈر انچیف چینی جمہوریت کے صدر جنرل چیانگ کائی شک سے بھی مل آئے۔

ہندوستان میں حالت بدستور ہے۔ بنگال کے قحط سے نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر انگلستان میں بھی ہل چل مچ گئی ہے۔ غنیمت ہے کہ ہندوستان کے وزیر مسٹر ایمری کو بھی اس قحط کی اہمیت کا کچھ کچھ اندازہ ہو چلا ہے۔ انگلستان کی پالیمنٹ میں بہت گرما گرم بحث رہی۔ اخباری بحث ہندوستان میں بھی جاری ہے اور اس قحط کی ذمّے داری ایک دوسرے پر ڈالی جا رہی ہے۔ نومبر میں مرکزی اسمبلی (دہلی) کے اجلاس شروع ہونے والے ہیں۔ اس میں ایک تجویز ہے کہ ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ عوام اور حکومت کی طرف سے امدادی کام بھی تیزی سے ہو رہا ہے نئے وائسرائے صاحب ہندوستان پہنچنے کے تین چار روز بعد بنگال پہنچ گئے تھے اور خود وہاں کی حالت کو دیکھ بھالا۔ پنجاب سے اور دوسری جگہوں سے اناج برابر بنگال پہنچ رہا ہے۔ باہر سے بھی اب تک غلّے کے چار پانچ جہاز آچکے ہیں۔ باوجود اس کے وہاں کے حالات کچھ زیادہ نہیں سدھر سکے ہیں۔ بعض اخباروں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ پورے بنگال میں ہر ہفتے ایک لاکھ جانیں فاقے کی وجہ سے ضائع ہو رہی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس میں مبالغہ ہو مگر اس سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ بنگال کی حالت کو جتنا ہم سمجھ رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ خراب ہے۔ اور طبیبوں کو علاج کی اس وقت سوجھی جب مریض پر نزع کی حالت طاری ہو چکی تھی۔ خدا اپنا رحم کرے۔

اس پرچے میں معمّا اور رنگ بھرنے کی تصویر دونوں چیزیں شائع ہو رہی ہیں۔ پچھلی مرتبہ ان دونوں میں پیامیوں نے بہت کافی دلچسپی لی اسی لئے بہت کافی نام آئے۔ اس مرتبہ معمّا بھی بہت دلچسپ اور آسان ہے۔ معمّا بنانے والے صاحب کو اس کام میں بہت مہارت ہو گئی ہے۔ رنگ بھرنے کی تصویر بھی ہمارے آرٹسٹ صاحب نے محنت سے بنائی ہے جو پیامی اس میں رنگ بھر کر بھیجیں وہ ہر مقابلے کی فیس کے بھی بھیجیں۔ (۲۰ دسمبر تک)

پیام تعلیم کا اگلا پرچہ دسمبر کا ہوگا۔ جنوری میں سالنامہ چھپے گا اس کی تیاری ابھی سے شروع ہو گئی ہے۔ پیامی اپنے پرچے کے خریدار بڑھانے کی کوشش کریں

(محمد حسین حسان)

قواعد

۱۔ حل کے ساتھ ایک آنے کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

۲۔ ایک سے زیادہ حل بھی بھیجے جا سکتے ہیں۔ چار حلوں کی رعایتی فیس ۳ر۔ ۸ حلوں کی ۱ر ہے۔

۳۔ دونوں انعام تقسیم کر دئے جائیں گے۔ قرعہ اندازی نہ ہو گی۔

۴۔ ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہو گا۔

۵۔ پیام تعلیم میں چھپے ہوئے کوپن کے علاوہ ہاتھ کے بنے ہوئے کوپن بھی لئے جائیں گے۔

۶۔ کسی کوپن میں کوئی حرف کٹا یا مٹا ہوا ہو گا یا پنسل سے پھرا ہوا ہو گا تو مقابلے میں شامل نہ کیا جائے گا۔

۷۔ ایک لفافے میں ایک نام سے حل آنے چاہئیں۔

۸۔ چھوٹی اور بڑی یے کا فرق لازمی ہے (ی ے)

۹۔ تمام حل ۲۰ دسمبر تک دفتر پیام تعلیم دہلی پہنچ جائیں

۱۰۔ پتہ:۔ سب ایڈیٹر پیام تعلیم۔ مکتبہ جامعہ، دہلی۔ قرول باغ

بچّوں کی نئی کتابیں

آج کل کاغذ کتنا مہنگا ہو گیا ہے۔ مہنگا تو مہنگا آسانی سے ملتا بھی نہیں۔ پھر بھی مکتبے نے بچّوں کے لئے بڑی اچھی اچھی کتابیں چھاپنے کا انتظام کیا ہے۔ ان میں سے یہ چند کتابیں تو اسی مہینے چھپی ہیں:۔

ہوائی جہاز:۔ اس میں ہوائی جہاز کی ایجاد، اس کی ترقی، سفر کے رواج اور ہوائی طوفان میں جہاز کی کیفیت کا حال بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ قیمت ۶ر

لڑائی کے ہتھیار:۔ موجودہ لڑائی کن کن ہتھیاروں سے لڑی جا رہی ہے۔ ہتھیار کیسے خوفناک ہیں اور ان سے کیسی تباہی پھیلتی ہے۔ یہ سب باتیں اس کتاب میں بیان کی ہیں۔ تصویروں کی وجہ سے کتاب اور بھی دلچسپ ہو گئی ہے۔ ۶ر

ہمت کے پھل:۔ اس میں چند مشہور لوگوں کے حالات ہیں اور بتایا گیا ہے کہ محض ہمت، محنت اور استقلال کی بدولت کس طرح ان لوگوں نے اتنی ترقی کی۔ قیمت ۵ر

سونے کی چڑیا ۸ر ۔ بڑ دادا کی کہانی ۶ر ۔ ہماری زمین ۸ر ۔ قدرت کے کرشمے ۸ر
باغبانی ۶ر ۔ کاغذ سازی ۶ر ۔ لکڑی کا کام ۶ر

مکتبہ جامعہ دہلی، قرول باغ

معمّا نمبر ۳۷

اول انعام ۶ روپے
دوسرا انعام ۳ روپے للعہ

(انعام میں کتابیں دی جائیں گی)

مشقی کوپن

۶ ا		۵	■	۴ و	۳ ز	۲ س	۱ خ
	■	■	■		ا		۷ ا
■	۱۰	۹ ا	■	ا		ہ	۸
■	ی	■	۱۱	■	■	■	ق
۱۴	■		و		۱۳ ا	۱۲	■
ا	۱۶	■		■		■	۱۵
■	و	۲۰	■	۱۹	م	۱۸	۱۷ ل
	۲۲	■		ا		ی	۲۱ ا

دائیں سے بائیں

۱- اردو کے سب سے پہلے شاعر ....

۵- اس کہہ مکرنی کا جواب:-
بالا تھا جب سب کو بھایا - بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں - بوجھ نہیں تو چھوڑ دو گاؤں

۷- (دو سخنہ)
.... کیوں نہ چکھا - وزیر کیوں نہ رکھا - دانا نہ تھا۔

۸- ان کے گیتوں وغیرہ کی وجہ سے دیہات کے .... بھی ان کا نام جانتے ہیں (بے ترتیب)

۹- ان .. مزار نظام الدین (دلی) میں ہے (الٹا)

۱۲- اس پہیلی کا جواب
بلبنوں کا سر کاٹ لیا - نا مارا نا خون کیا۔

۱۶- لودھ پھٹکری مردہ سنگ ہلدی زیرہ ایک ایک ٹنک
افیون چنا بھر مرچیں .. ر ارد برابر تھوتھا ڈار
پوست کے پانی پوٹلی کرے ترت پیڑ نینوں کے ہرے

۱۷- فن موسیقی میں .... رکھتے تھے (الٹا)

۲۰- ۱۷ شوال .. ان کا عرس ہوتا ہے۔

۲۲- بین کو مختصر کر . ستار بھی انھی نے نکالا ہے۔

اوپر سے نیچے

۱- .... یا ری امیر خسرو ہی نے تو لکھی ہے۔

۲- امیر خسرو .... ۱۳۲۵ء میں فوت ہوئے

۳- غیاث الدین بلبن سے محمد تغلق تک گیارہ بادشاہوں کے .... دیکھے۔

۴- حضرت نظام الدین اولیا کے مرید ... محبوب خاص بھی تھے (بے ترتیب)

۶- ... کی پیدائش ۱۲۵۵ء میں پٹیالی ضلع ایٹہ میں ہوئی۔

۱۰- سات بادشاہوں کی ملازمت

۱۱- ہندی زبان بے تکلف ... سکتے تھے۔

۱۳- امیر خسرو بڑے خوش .... تھے (بے ترتیب)

۱۴- (انمل) کھیر پکائی جتن سے - چرخا دیا جلا
آیا کتا کھا گیا - تو بیٹھی ڈھول بجا .. پانی پلا

۱۵- (دو سخنہ) جوتا کیوں نہ پہنا - سنبوسہ کیوں نہ کھایا
... نہ تھا۔

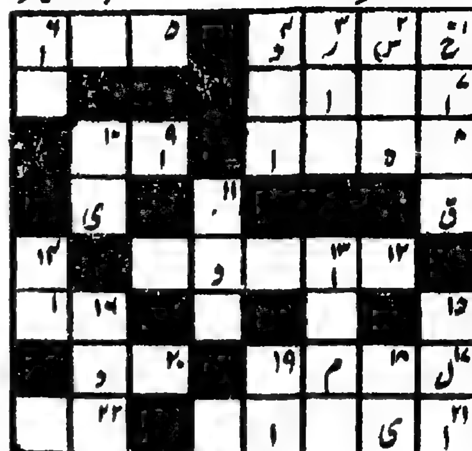
۱۶- اس معمے کے اشاروں میں .. ذرا سی ... سے غلطی ہو سکتی ہے۔ (الٹا)

۱۸- بچہ ہو یا بوڑھا - عورت ہو .. مرد - امیر خسرو کو سب ہی جانتے ہیں۔ (الٹا)

۱۹- ان .. لقب طوطیٔ ہند ہے۔

۲۱- انھوں نے بہت سے راگ ..... کیے۔

معما نمبر ۳۷ کوپن نمبر



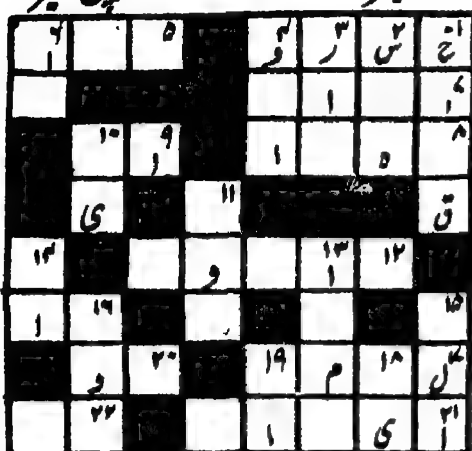
نام ....

پتہ ....

....

ٹکٹ ....

معما نمبر ۳۷ کوپن نمبر



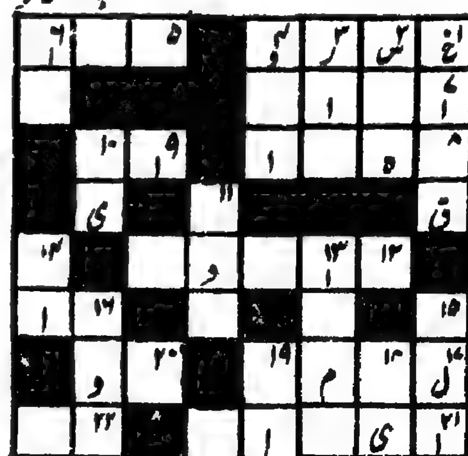
نام ....

پتہ ....

....

ٹکٹ ....

معما نمبر ۳۷ کوپن نمبر



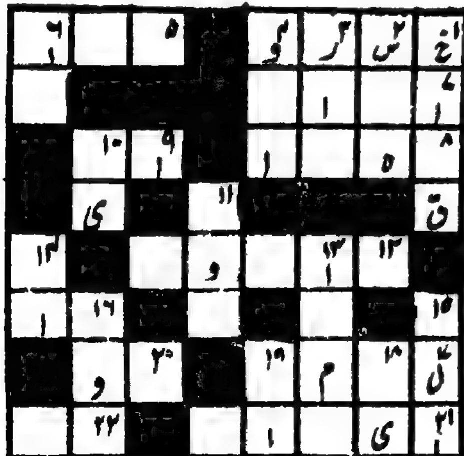
نام ....

پتہ ....

....

ٹکٹ ....

معما نمبر ۳۷ کوپن نمبر



نام ....

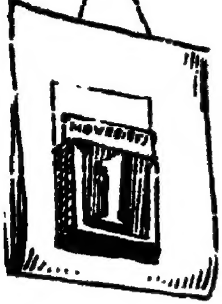
پتہ ....

....

ٹکٹ ....

اپنی خواہش کے مطابق رنگ بھرو

از فیروز آرٹسٹ









لڑائی کی وجہ سے انگلستان کی مشینیں اور کاریگر ہتھیار اور دوسری
چیزیں بنانے میں لگے ہیں۔ اب بچوں کے کھلونے کون بنائے۔؟
مگر یہ کام خود وہاں کے لوگوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا
ہے اور فرصت کے وقت ادھر ادھر کے بیکار سامان
سے کھلونے بناتے ہیں۔ بچے ان کھلونوں کو
مشین کے بنے ہوئے کھلونوں سے کہیں
زیادہ پسند کرتے ہیں اوپر کی
تصویر میں ایسے ہی
کھلونوں کی نمائش
لگی ہے۔



قـاهره کی ایک مسجد



اک بده مندر مین گوتم بده کے بت



سری نگر (کشمیر) کی ڈل
جھیل مین ایک هاؤس بوٹ